پنجاب مغلوں کے عہدِ زوال میں

عزیز احمد چودھری
ایم اے

خالصہ شمشیر و قرآں را ببرد
اندر آں کشور مسلمانی بمرد

(اقبال)

یہ کتاب

ناناجان ماسٹر چوہدری **محمد خان** صاحب

کی ذاتِ گرامی سے منسوب کرتا ہوں

جن کے فیضِ علمی سے ہزاروں ذہنوں نے جِلا پائی

اور اِن خوش نصیبوں میں سے ایک یہ خاکسار بھی ہے

؎ بگیر ایں ہمہ سرمایہ بہار از من
کہ گل بدستِ تو از شاخِ تازہ تر ماند

○

عزیز احمد چوہدری

سلامِ ما برسانید ہر کجا ہستند

اب جب کہ میری یہ تحقیقی کاوش شائع ہو رہی ہے، تو مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ ان دوستوں کے ذکر سے خالی رہے جن کی رفاقت، تعاون اور نیک خواہشات قدم قدم پر ساتھ رہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ ۷۴-۱۹۷۵ء کے ان دوستوں کی یاد کسی نہ کسی طور اس تحریر سے وابستہ ہے

طیب خان، افتخار حید بھٹی، حافظ شبیر احمد ظفر، طارق چودھری، ریاض اختر، سید بشیر اللہ ہاشمی، محمد بشیر متین، محمد سردار، غلام صمدانی، تنویر شکور، شاہ زمان، نور محمد بھابھہ محمد احمد گوندل، محمد علی توقیر، خلیق الزمان جنیدی، خواجہ معین الدین، سید جاوید حسین، محمد سلیم خالد، عثمان غنی، چوہدری انور گجر، جاوید اقبال، راجہ وحید، سعید چٹھہ۔

چودھری رحمت علی ہال علا کے جو دوست ہنوز ذہن کے افق پر جگمگا رہے ہیں۔ ان میں:

عامر مقصود (سیاسیات) انوار احمد (کامرس) چودھری سلطان احمد جیہ (پنجابی)، لیاقت علی (جغرافیہ) راجہ رفیع اللہ خان (قانون) اعظم چٹھہ (قانون) غلام مصطفیٰ (معاشیات) صادق اور ہادی (طبیعات)

کچھ نام اور بھی ہیں کہ نوکِ قلم سے ٹپکنے کو بے تاب ہیں، مگر اب وقت کی اتنی بڑی خلیج حائل ہو چکی ہے کہ ان کا لوحِ ذہن سے صفحۂ قرطاس پر منتقل ہونا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ بہر حال ؎

بآں گروہ کہ از ساغرِ وفا مستند
سلامِ ما برسانید ہر کجا ہستند

دیباچہ

پنجاب اپنے جغرافیائی محلِ وقوع، سیاسی مزاج اور سماجی کردار کے اعتبار سے ہمیشہ برصغیر جنوبی ایشیا کا ایک اہم خطہ رہا ہے۔ ہر دور میں اس کی سیاسی اہمیت مسلّم رہی ہے۔ ہندوستان میں اسلام کی روشنی سندھ کے بعد پنجاب میں پہنچی اور پھر تاریخ کے ہر مرحلے پر پنجاب کی سیاسی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا رہا۔ عہدِ مغلیہ میں پنجاب کو حکومت کے ایک کلیدی صوبے کی حیثیت حاصل رہی اور لاہور بڑی حد تک ایک چھوٹے دارالحکومت کی سی اہمیت کا حامل رہا۔ اس دور میں اس خطے کی سماجی اور معاشرتی زندگی میں لاتعداد نئی قدریں فروغ پذیر ہوئیں۔ طویل سیاسی استحکام نے زرعی معیشت پر بھی اچھے اثرات مرتب کئے اور ان دو صدیوں میں — سولہویں اور سترھویں — کے پنجاب کا چہرہ پر سکون مطمئن اور نسبتاً خوش حال نظر آتا ہے۔

اٹھارویں صدی کا سورج طلوع ہوا۔ تو ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی بالادستی کا زوال شروع ہو گیا۔ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات (۱۷۰۷ء) ایک فرد کی موت نہ تھی، یہ درحقیقت ایک سیاسی قوت کے لئے پیامِ رحیل تھا۔

یہ دورِ زوال کئی اعتبار سے اہم ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ مسلمانوں کو برصغیر میں ایک بالکل نئی سیاسی اور سماجی حیثیت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے تہذیبی ادارے شکست و ریخت کا شکار ہو گئے۔ اور اس کی معاشرتی زندگی تہ و بالا ہو گئی۔ دورِ عروج میں لاتعداد کمزوریاں اور خامیاں سیاسی بالادستی کی چادر تلے ڈھکی ہوئی تھیں۔ دورِ زوال میں وہ تمام کی تمام اپنے نتائج و عواقب سمیت کھل کر سامنے آگئیں۔

یوں تو اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغل ہندوستان کے اہم صوبوں میں مرکز سے علیحدگی

کے رجحانات پنپنا شروع ہو گئے تھے۔ تاہم کسی نہ کسی طرح یہ صوبے مرکز سے وابستہ ہی رہے پنجاب البتہ وہ پہلا اہم صوبہ ہے۔ جو مغلوں کے ہاتھ سے نکلا اور اس پر پہلے افغانوں اور بعد ازاں سکھوں نے بالادستی حاصل کر لی۔ اس کتاب میں پنجاب کے اسی دور کی تاریخ بیان کرنے کوشش کی گئی ہے۔ سیاسی سرگزشت لکھنے کے ساتھ ساتھ اس عہد کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کا بھی ایک تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

تاریخ پنجاب کے اس دور پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ چند ہندو مورخین کی تحریریں قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں نام ڈاکٹر ہری رام گپتا کا ہے۔ ان کی دو کتابیں اس دور کے بارے میں مفید تاریخی مواد کی حامل ہیں۔ "ہسٹری آف دی سکھس" جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ بنیادی طور پر سکھوں کی تاریخ ہے۔ اس میں ناظمانِ پنجاب اور سکھوں کی کشمکش کا احوال تفصیل سے دیا گیا ہے۔ تاہم دیگر سیاسی عوامل اور محرکات اس کتاب کی حدود سے خارج ہیں۔ لہٰذا یہ اس عہد کی ایک نامکمل اور جزوی تاریخ کہی جا سکتی ہے۔ گپتا نے شائد اس خلا کو خود بھی محسوس کیا۔ اور اپنی دوسری کتاب "سٹڈیز ان دی لیٹر مغل ہسٹری آف دی پنجاب" میں مختلف مقالات جمع کر دیئے۔ جو کسی حد تک ان کی پہلی تصنیف کے خلا کو پُر کرتے ہیں۔ تاہم مختلف عنوانات پر مشتمل یہ مقالات بھی ایک مربوط تاریخ کا تاثر پیدا نہیں کر سکے۔ جادو ناتھ سرکار کی "فال آف دی مغل ایمپائر" ایک طویل اور وسیع خطے کو محیط ہے۔ اس میں پنجاب کے زیرِ نظر دور پر بہ مشکل دو ابواب کی گنجائش نکل سکی ہے۔ اپنی اہمیت کے باوجود یہ مطالعہ بے حد تشنہ ہے۔ گوکل چند نارنگ کی "ٹرانسفارمیشن آف سکھزم" اور نریندر کرشن سہنا کی "رائز آف دی سکھ پاور" بنیادی طور پر سکھوں کے سیاسی ظہور کی تاریخیں ہیں۔ ان میں مصنفین نے پنجاب کے مجموعی سیاسی اور معاشرتی ماحول پر برائے نام توجہ دی ہے۔ ان چند تصانیف کے علاوہ پنجاب کی عمومی تاریخوں میں بھی تھوڑا بہت ذکر زیرِ بحث دور کا مل جاتا ہے۔ تاہم اگر یہ کہا جائے کہ اس عہد پر یہ پہلی تفصیلی تحقیقی کاوش ہے۔ تو شاید بے جا نہ ہوگا۔

کتاب ہذا بنیادی طور پر میرا وہ تحقیقی مقالہ ہے جو میں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے تاریخ کے امتحان کی جزوی تکمیل کے لئے تحریر کیا تھا۔ اب جب کہ یہ اوراق طبع ہو رہے ہیں۔ تو ان اساتذہ کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں جن سے کسی نہ کسی طور رہنمائی حاصل ہوتی رہی۔ پروفیسر اکرام علی ملک تاریخ پنجاب کے ایک سرکردہ محقق ہیں، اس مقالہ کے نگراں تھے ان کی رہنمائی نے بہت سے کٹھن مراحل آسان کئے۔ پروفیسر محمد اسلم تاریخ اسلام و پاک و ہند کے متبحر عالم ہیں۔ ان کے اندازِ تدریس اور ذوقِ تحقیق نے بہت کچھ سکھایا۔ اور ان کی شفقت ہنوز جاری و ساری ہے۔ پروفیسر سید علی عباس اور ڈاکٹر رضا الحق شاہ صاحبان کا بھی شکرگزار ہوں۔ شعبہ تاریخ کی لائبریرین محترمہ ریاض فاطمہ اور ان کے معاونین اعجاز اور مشتاق صاحبان کا شکریہ ادا کرنا ان کے بے پناہ تعاون کی وجہ سے فرض سمجھتا ہوں۔

بزرگوارم ماسٹر غلام رسول صاحب نے اس مقالے کی طباعت کی طرف توجہ مبذول کرائی اور اس سلسلے میں اپنے تجربات کی روشنی میں تمام پہلوؤں سے رہنمائی کی۔ اسی ضمن میں عزیز دوستوں چودھری بشارت احمد ایڈووکیٹ، خالد ہمایوں ایم۔ اے، طارق مجاہد جہلمی، منیر سلطان چودھری، لیفٹیننٹ اطہر علی چودھری، میجر انور شفیق، خالد نقوی کا شکریہ ادا کرنا اس اعتبار سے ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کی دلچسپی اور نیک خواہشات کے بغیر شائد ان اوراق کی طباعت میرے بس کا روگ نہ ہوتی۔ اشتیاق علی صاحب نے اس کتاب کی کتابت جس توجہ اور خلوص سے کی ہے۔ اس کا شکریہ ادا کرنا بھی اپنا خوش گوار فریضہ سمجھتا ہوں۔

۲۹ شعبان ۱۴۰۰
۱۳ رجولائی ۱۹۸۰

عزیز احمد چودھری

فہرست

باب ۱

پس منظر

ستلج، بیاس، راوی، چناب، جہلم اور سندھ ——— کے درمیان گھرا ہوا یہ صوبہ انہی پانچ دریاؤں کی رعایت سے پنجاب کہلاتا ہے (دریائے سندھ محض مغربی جانب حد بندی کا کام دیتا ہے پنجاب میں شامل نہیں)۔

عہد مغلیہ میں اور اس سے پہلے پنجاب کے مشمولہ علاقوں کو صوبہ ملتان اور صوبہ لاہور کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ البتہ اکبر کے زمانے سے پنجاب کا نام بکثرت اور بالعموم استعمال ہونے لگا[1]

دوآب

پنجاب پانچ دوآبوں پر مشتمل ہے۔ دو دریاؤں کا درمیانی علاقہ دوآب کہلاتا ہے۔ ان دوآبوں کے نام عام طور پر دونوں دریاؤں کے ابتدائی حروف ملا کر بنائے گئے ہیں

۱۔ بست جالندھر دوآب	بیاس اور ستلج کے درمیان
۲۔ باری دوآب	بیاس اور راوی کے درمیان
۳۔ رچنا دوآب	راوی اور چناب کے درمیان
۴۔ چج دوآب	چناب اور جہلم کے درمیان

---

[1] اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۵، مقالہ "پنجاب" ص ۹۵۹ لاہور ۱۹۷۰ء

۵۔ سندھ ساگر دوآب — جہلم اور سندھ کے درمیان[1]

تاہم سیاسی حدود ان دریاؤں سے پار بھی جاتی ہیں اور مختلف زمانوں میں پشاور اور سکردو، لداخ اور شمالی پہاڑی علاقے اور ستلج پار کرنال تک کا علاقہ پنجاب میں شامل رہا ہے۔ عمومی پنجاب کا طول شرقاً غرباً ۶۰۰ میل اور عرض شمالاً جنوباً ۳۵۰ میل ہے[2]

جغرافیائی اعتبار سے ہندوستان کی مغربی سرحد پر واقع ہونے کی وجہ سے پنجاب اس علاقے سے ہندوستان وارد ہونے والے حملہ آوروں کی گزرگاہ تھا۔

The Punjab being the main gateway into the India, was fated to be the perpetual field of battle and first home of all conquerors. [3]

پنجاب عہد اسلامی میں

پنجاب برصغیر کی قدیم تہذیب کا اہم مرکز رہا ہے۔ ہم اس تمام تفصیلی تاریخ سے گریز کرتے ہوئے پنجاب میں اسلام کی آمد کو اپنی بحث کا نقطۂ آغاز قرار دیتے ہیں

۷۱۱ء میں محمد بن قاسم کے حملۂ سندھ کے بعد پنجاب پر اسلام کی کرنیں جلوہ ریز ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ تاہم اسلام کو کامل فروغ حاصل کرنے کے لئے ابھی ایک مدت درکار تھی۔ پنجاب میں مسلمانوں کا داخلہ صحیح معنوں میں غزنویوں کے زمانے میں ہوا[4]

اسلامی دور سے قبل پنجاب پر راجہ جے پال برسر اقتدار تھا۔ سبکتگین اور پھر محمود غزنوی سے اس

---

[1] ابوالفضل، آئین اکبری (اردو ترجمہ) فدا علی طالب، ص ۱۰۱۹، حیدرآباد دکن، ۱۹۳۹ء

[2] ہنری سٹین بک، دی پنجاب، ص ۱، لندن ۱۸۴۶ء

[3] خوشونت سنگھ، ہسٹری آف دی سکھز جلد اول، ص ۱۳، پرنسٹن ۱۹۶۳ء

[4] اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۵، مقالہ "پنجاب" ص ۶۵۲

کی کئی جنگیں ہوئیں۔ اس کے بعد اس کا بیٹا آنند پال محمود سے برسر پیکار رہا۔ ہر بار شکست کھا کر وہ خراج کی ادائیگی کا وعدہ کر لیتا۔ آخر کار محمود نے بذات خود پنجاب پر ۱۰۲۱ء میں قبضہ کر لیا اور ایاز کو پنجاب حاکم مقرر کیا۔ اس کے بعد پنجاب غزنوی حکومت کا حصہ بن گیا۔ اس دور میں پنجاب کی سرحد سرہند اور ہانسی تک تھی۔ اور دار الحکومت لاہور مسلمانوں کا ایک اہم مرکز بن گیا۔ اس عہد میں فارسی کے بعض اہم شعرائے غزنویں کے نام، جو قبولیت پا چکے ہیں۔ مثلاً مسعود سعد سلمان، نکتی لاہوری، اور ابوالفرج رونی۔ علاوہ ازیں شیخ اسماعیل رح، حضرت داتا گنج بخش رح اور شیخ حسین زنجانی جیسے نامور عالم اور صوفی بزرگ بھی اسی زمانے سے تعلق رکھتے تھے۔

۱۱۸۶ء میں شہاب الدین محمد غوری نے آخری غزنوی بادشاہ خسرو ملک سے لاہور لے لیا۔

۱۲۰۶ء میں لاہور میں منعقدہ ایک جشن میں محمد غوری نے قطب الدین ایبک کو اپنے ہندوستانی مقبوضات کا حاکم مقرر کیا۔ واپسی پر غوری جہلم کے نواح میں شہید ہو گیا۔

۲۶ جون ۱۲۰۶ء کو ایبک نے لاہور میں ہندوستان کا تخت سنبھالا۔ ۱۲۱۰ء میں یہیں چوگان کھیلتے ہوئے اس کا انتقال ہو گیا

ایبک کے جانشینوں کے عہد میں پنجاب میں علمی، تمدنی ترقی کا سلسلہ جاری رہا۔ تاہم ۱۲۱۵ء سے منگولوں کے حملوں کا آغاز ہو گیا۔ یہ سلسلہ دو صدیوں تک جاری رہا۔ اس سے پنجاب میں بے حد تخریب ہوئی۔ پنجاب پر منگولوں کی آمد درۂ بولان، سندھ اور ملتان کے راستے سے ہوتی تھی۔ اس زمانے میں پنجاب کا حاکم ملتان یا دیپالپور میں رہتا تھا۔ تاکہ ان کا انسداد کر سکے پنجاب میں متعدد فوجی چھاؤنیاں بنا دی گئیں تھیں[1]

اس کے علاوہ پنجاب کے مقامی باغی عنصر بھی سرگرم رہے خاص طور پر کھوکھروں نے بے پناہ تاخت و تاراج کی۔ دسمبر ۱۳۹۸ء میں تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی

---

[1] شجاع الدین، سیاسی اور ثقافتی تاریخ، نقوش لاہور نمبر، ص ۳۵ تا ۴۱، لاہور ۱۹۶۲ء

تغلقوں کا خاتمہ ہوگیا اور تختِ دہلی پہ سادات جلوہ فگن ہوئے۔ پنجاب کی حکومت ۱۴۴۱ء بہلول لودی کو ملی۔ بعدازاں اس نے دہلی پہ قبضہ کرکے لودھی خاندان کی حکومت قائم کی[1]۔

پنجاب عہدِ مغلیہ میں

۱۵۲۴ء میں پنجاب نے افغان گورنر دولت خان لودھی نے بابر کو حملے کی دعوت دی۔ چھوٹے چھوٹے متعدد حملے کرنے کے بعد اس نے ۱۵۲۶ء میں آخری اور بھرپور حملہ کیا اور ہندوستان میں مغلیہ حکومت کی بنیاد رکھی۔ چار سال بعد ۱۵۳۰ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔ ہمایوں تخت نشین ہوا۔ اس نے باپ کے حسبِ وصیت پنجاب کی حکومت کامران کو سونپ دی۔ کامران نے بھائی کے خلاف معاندانہ رویہ اختیار کئے رکھا۔ جو ہمایوں کے لئے خاصا نقصان دہ ثابت ہوا اور شیر شاہ نے اسے ہندوستان سے نکال دیا۔ ۱۵۵۵ء میں اس نے دوبارہ ہندوستان پر قبضہ کرلیا۔ تاہم اسی سال اس کا انتقال ہوگیا۔

ہمایوں کی وفات کے وقت اکبر ۱۳ سال کا تھا اور اپنے اتالیق بیرم خاں کے ہمراہ پنجاب میں کلانور کے مقام پر خیمہ زن تھا۔ وہیں اس کی تخت نشینی کا اعلان کیا گیا۔ اکبر کی تخت نشینی کے وقت پنجاب سیاسی اعتبار سے دو حصوں میں منقسم تھا۔ ایک حصہ براہِ راست مغلوں کی عملداری میں تھا لیکن یہاں کی صورتِ حال بھی تسلی بخش نہ تھی۔ دوسرا حصہ زیادہ شمالی جانب تھا۔ جو خودمختار کوہستانی راجاؤں اور سرداروں کی چھوٹی بڑی ریاستوں میں منقسم تھا۔ ان میں کانگڑہ، جموں کشمیر، مظفرآباد، راجوری، پونچھ، بھمبر اور کوٹلی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اکبر کے زمانے میں یہ علاقہ پوری طرح مغلیہ حکومت کے زیرِ نگیں آگیا[2]۔

دسمبر ۱۵۵۶ء میں پنجاب کی نظامت پر حسین خان ٹکریہ کو مقرر کیا گیا۔ وہ ایک درویش طبع امیر تھا۔ لاہور کے حکام میں اسے نمایاں مقام حاصل ہے۔ اکبر کے عہد میں پنجاب کے دیگر

---

[1] لطیف، ہسٹری آف دی پنجاب، ص ۱۱۳، ۱۲۰، لاہور ۱۸۹۱ء

[2] اردو دائرہ معارف اسلامیہ "مقالہ پنجاب"

نمایاں صوبہ دار یہ تھے۔ سعید خان (۱۵۷۸ء۔۱۵۸۳ء) راجہ بھگونت داس (۱۵۸۳ء۔۱۵۸۹ء) قلیج خان (۱۵۸۹ء۔۱۵۹۲ء) اور خواجہ شمس الدین خوانی (۱۵۹۲ء۔۱۶۰۰ء)۔

اکبر کے عہد میں پنجاب نے خاصا فروغ پایا۔ سیاسی، انتظامی، علمی، اور ادبی سطح پر خاصی ترقی ہوئی۔ اکبر کے بعد جہانگیر ۱۶۰۵ء میں تخت نشین ہوا۔ جلد ہی اس کے بیٹے خسرو نے بغاوت کردی۔ اور پنجاب کا رُخ کیا۔ جہانگیر نے اس کا تعاقب کرکے اسے گرفتار کرلیا۔ جہانگیر کابل اور کشمیر جاتے ہوئے بعد میں کئی مرتبہ پنجاب آیا۔ حتیٰ کہ اُس کے آخری لمحات بھی اسی خطے میں بسر ہوئے۔ کشمیر میں شکار کے لیے گیا ہوا تھا۔ کہ ۸ نومبر ۱۶۲۷ء کو اس کا انتقال ہوگیا۔ لاہور میں راوی کے کنارے اس کی تدفین عمل میں آئی۔ بعدازاں اس پر شاہجہان نے شاندار مقبرہ بنوایا۔ جہانگیر کے زمانے میں پنجاب کے نمایاں حکام میں میر تقی خاں (۱۶۱۱ء۔۱۶۱۵ء) اعتمادالدولہ غیاث بیگ (۱۶۱۶ء۔۱۶۱۸ء) قاسم خاں (۱۶۱۸ء۔۱۶۲۳ء) اور صادق خاں (۱۶۲۳ء۔۱۶۲۵ء) شامل تھے۔

شاہ جہان کا دورِ حکومت مغلوں کا سنہری زمانہ قرار پایا۔ اس لیے ہندوستان کے دیگر شہروں کی طرح لاہور میں بھی بہت سی عمارات بنوائیں۔ شاہی قلعہ میں کئی اضافے کئے۔ جہانگیر کا مقبرہ تعمیر کرایا۔ شالامار باغ بنوایا۔ شاہجہاں کے صوبہ دار وزیر خاں (۱۶۳۲ء۔۱۶۳۹ء) نے انتظامی امور میں بہت نام پایا۔ اس نے ایک عالی شان مسجد بھی تعمیر کرائی جو فنِ تعمیر کا عمدہ نمونہ اور درس و تدریس کا بے مثال مرکز رہی ہے۔ دیگر حکام میں معتمد خاں (۱۶۳۹ء۔۱۶۴۲ء) قلیج خاں (۱۶۴۲ء۔۱۶۴۵ء) قاضی افضل (۱۶۴۵ء۔۱۶۵۱ء) اور شیخ عبدالکریم (۱۶۵۱ء۔۱۶۵۵ء) نمایاں اہمیت کے حامل تھے۔

اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں پنجاب تہذیبی اور سیاسی اعتبار سے عروج کو پہنچ چکا تھا۔ ۱۶۶۳ء میں عالمگیر لاہور آیا۔ لاہور میں اس کے عہد کی عظیم ترین یادگار بادشاہی مسجد کی بنیاد ۱۶۷۳ء میں رکھی گئی۔

مغلوں کے ساتھ ساتھ پنجاب میں ایک متوازی طاقت فروغ پا رہی تھی جس نے مغلوں کی

پانچویں گرو ارجن (۱۵۸۱ء ۔ ۱۶۰۶ء) نے ایک سیاسی نظام تیار کیا۔ اور امرت سر کو عسکری مرکز بنا کر کابل سے ڈھاکہ تک جہاں جہاں سکھ بستے تھے، اُن سے محصول لینا شروع کیا۔ دولت کی ہوس اس قدر بڑھ گئی کہ خود سکھوں میں مشہور ہو گیا کہ دنیا کی دولت گورو نانک سے بارہ کوس کے فاصلے پر تھی۔ گورو انگد سے چھ کوس پر، گورو امر کے دروازے پر اور گورو ارجن کے گھر میں[1]

سکھ مغل تصادم کا آغاز

سکھوں کا سب سے پہلا جھگڑا جہانگیر سے ہوا۔ گورو ارجن نے شہزادہ خسرو کو جس نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کی تھی، پناہ دی اور جہانگیر کا عتاب مول لیا۔ جہانگیر نے اس پر گورو کو دربار میں بلایا اور جرمانے کی سزا دی۔ گورو نے جرمانہ ادا کرنے سے انکار کیا اس پر اُسے قتل کر دیا گیا۔ ڈاکٹر بینی پرشاد نے لکھا ہے کہ یہ سزا صرف سیاسی اسباب کی بنا پر دی گئی تھی۔ اگر گورو ارجن ایک باغی شہزادے کی مدد نہ کرتے تو وہ بلا ضرر اور پورے اطمینان کے ساتھ اپنے دن گزار سکتے تھے[2] جادو ناتھ سرکار کا بھی یہی خیال ہے کہ جونہی سکھوں کی تحریک نے رنگ بدلا۔ بادشاہوں کے رویہ میں بھی تبدیلی رونما ہو گئی۔ مسلمان بادشاہوں کی عداوت کا سبب کوئی مذہبی عناد نہ تھا۔ بلکہ اس کی وجہ کلیتاً سیاسی تھی[3] گورو ارجن کے بارے میں سرکار نے لکھا ہے کہ اس قتل میں کوئی مذہبی جذبہ شامل نہ تھا۔ یہ سزا وہی تھی جو عموماً سیاسی مجرموں کو دی جاتی تھی[4]۔ تاہم کچھ بھی ہو اس قتل نے شاہانِ مغلیہ اور سکھوں کے درمیان ایک ابدی منافرت کا بیج بو دیا۔

چھٹے گورو ہرگوبند (۱۶۰۶ء ۔ ۱۶۴۵ء) نے سکھوں کی تنظیم مکمل فوجی طور پر استوار کرنا شروع کر دی۔ اس نے سکھوں سے نذرانے کے طور پر نقو نات کی بجائے ہتھیار اور گھوڑے وصول کرنا شروع کر دیئے۔ سپاہیوں کی تربیت کا اہتمام کرنے لگا۔ امرت سر میں ایک چھوٹا سا قلعہ بھی بنا لیا[5]

ساتویں گورو ہر رائے (۱۶۴۵ء ۔ ۱۶۶۱ء) نے یہ سلسلہ جاری رکھا۔ شاہ جہاں کے بیٹوں کی جنگِ تخت نشینی میں اس نے دارا شکوہ کا ساتھ دیا[6]۔ اورنگ زیب سے اس کے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔

آٹھویں گورو ہرکشن صرف تین سال (۱۶۶۱ء ۔ ۱۶۶۴ء) گدی نشین رہے

نویں گورو تیغ بہادر (۱۶۶۴ء ۔ ۱۶۷۵ء) نے کشمیر کے ہندوؤں میں بغاوت پھیلانی شروع کر دی تھی۔ اس بنا پر عالمگیر نے اسے قتل کرا دیا۔

دسویں اور آخری گورو گوبند (۱۶۷۵ء ۔ ۱۷۰۸ء) کے زمانے میں بھی کشیدگی کا سلسلہ جاری رہا۔ گوبند سنگھ نے سکھوں کو ہر لحاظ سے مکمل مارشل ریس (Martial Race) بنا دیا۔ مغل فوجوں سے اب ان کے کھلم کھلا معرکے ہونے لگے۔ اور پنجاب کے کئی گوشوں سے سکھوں نے بغاوت کی آگ بھڑکا دی۔ اورنگ زیب کے مضبوط انتظامی ہاتھوں نے گورو کو کھل کھیلنے کی اجازت نہ دی۔ سرہند کے فوجدار وزیر خاں کے ہاتھوں گورو کو بھاری شکست ہوئی۔ گورو گوبند کے زمانے میں آ کر سکھ مسلم تعلقات میں کشیدگی عروج پر پہنچ گئی۔ اگرچہ گورو یائی کا سلسلہ گوبند پر ختم ہو جاتا ہے۔ تاہم گوبند کے ایک سیاسی جانشین بندہ بیراگی نے پنجاب میں سکھوں کی تنظیم کا کام شروع کر کے کشت و خون کا وہ بازار گرم کیا کہ پانچ دریاؤں کی یہ سرزمین مسلمانوں کے خون سے سرخ ہو گئی۔

---

1. خلیق احمد نظامی، تاریخ مشایخ چشت، ص ۳۱۵
2. ہسٹری آف جہانگیر، ص ۱۳۰
3. ہسٹری آف اورنگ زیب، جلد ۳، ص ۳۰۵
4. ایضاً، ص ۳۰۸
5. خوشونت سنگھ، ص ۶۳
6. اروِن، لیٹر مغلز، اول، ص ۷۷ / محمد اکبر، پنجاب انڈر دی مغلز، ص ۱۹۵

باب ۲

سکھ (۱)

بندہ بیراگی کی شورش

بندہ بیراگی ۱۶۷۰ء میں راجوری (کشمیر) میں پیدا ہوا۔ اس کا اصل نام لچھمن دیو تھا۔ وہ عالم جوانی میں جوگی بن گیا اور دریائے گوداوری کے کنارے نانڈیر نامی ایک گاؤں میں ڈیرہ جما لیا۔ ایک مرتبہ گورو گوبند سنگھ کا ادھر سے گزر ہوا۔ انہوں نے اس کا چرچا سن کر اس سے ملاقات کی[1] اس کے نتیجے میں اس نے سکھ مت اختیار کر لیا۔ اور اپنا نام بندہ رکھ لیا اور خود کو پوری طرح گورو کی خدمت میں پیش کر دیا۔

نارنگ لکھتا ہے "گورو نے اسے اپنے عزائم اور خواہشات سے مطلع کیا۔ اپنے بیٹوں اور والد کے خون کا انتقام لینے کا عہد لیا۔ اور مغلیہ حکومت سے برسرپیکار رہنے کا حکم دیا۔ چند نصیحتیں کیں اور ایک خط دے کر پنجاب کی طرف روانہ کر دیا۔ جس میں پنجاب کے سکھوں کو بندہ کے زیر کمان جمع ہو جانے کا حکم دیا گیا تھا[2]

---

[1] ملاقات کی تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو، عمدۃ التواریخ تتمہ دفتر اول و دوم، ص ۱۱، مطبوعہ لاہور ۱۸۸۵ء

[2] ٹرانسفارمیشن آف سکھزم، ص ۱۰۳، مطبوعہ لاہور ۱۹۱۲ء۔ تیجا سنگھ، ہسٹری اینڈ فلاسفی آف دی سکھ ریلیجن حصہ اول، ص ۲۰۷، مطبوعہ لاہور ۱۹۱۴ء

بندہ ۱۷۰۹ء کے اوائل میں پنجاب پہنچ گیا۔ چند ماہ کے اندر اندر اس کے گرد سکھوں کی خاصی تعداد جمع ہو گئی۔ چنانچہ اس نے اپنی کاروائیوں کا آغاز کر دیا۔ پانچ سو افراد کے ہمراہ بندہ نے سونی پت[1] کی طرف پیش قدمی کی، مقامی فوجدار نے مدافعت کی۔ مگر شکست کھا کر دہلی کی طرف فرار ہو گیا[2]

کیتھل کے نواح میں ایک سرکاری دستہ محصولات لے جا رہا تھا۔ بندہ نے تیزی سے ان پر حملہ کیا اور سارا خزانہ حاصل کر لیا۔ کیتھل کے ہندو عامل کو خبر ہوئی تو وہ ایک گھڑ سوار دستے کے ہمراہ موقع پر پہنچا۔ مگر اسے بھی شکست ہوئی۔ کیتھل پر قبضہ کے بعد لوٹ مار کی گئی[3]

یہ ابتدائی کامیابیاں بندہ کے لیئے بہت مفید ثابت ہوئیں ہر طرف سے لوگ اس کے پاس اُمڈنے لگے۔ جلد ہی اس کے پاس چالیس ہزار مسلح افراد پر مشتمل بھاری فوج تیار ہو گئی[4]۔ نارنگ نے بندہ کی فوج کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ سچے اور وفادار سکھوں پر مشتمل تھا۔ دوسرا حصہ کرائے کے ان افراد پر مشتمل تھا۔ جو مختلف سرداروں مثلاً رام سنگھ اور تلوک سنگھ وغیرہ نے بھرتی کر کے بندہ کی طرف روانہ کئے۔

تیسرا حصہ لوٹ مار اور مال غنیمت کے لالچ میں فوج میں شامل ہونے والوں پر مشتمل تھا ان میں سے بیشتر رہزن اور لٹیرے تھے۔ انہوں نے اکیلے دکیلے مسافروں اور قافلوں کو لوٹنے کی بجائے شہروں اور قصبوں کی غارت گری کو بہتر تصور کیا[5]۔

---

[1] دہلی سے ۲۸ میل شمال

[2] اِرون، لیٹر مغلز جلد اول، ص ۹۴، کلکتہ ۱۹۲۲ء۔ گنڈا سنگھ، بندہ سنگھ بہادر، ص ۳۵، امرتسر ۱۹۳۵

[3] نارنگ، ٹرانسفارمیشن آف سکھزم، ص ۱۰۵، لاہور ۱۹۱۲ء

[4] اِرون، لیٹر مغلز، جلد اول، ص ۹۴، کلکتہ ۱۹۲۲ء

[5] ٹرانسفارمیشن آف سکھزم، ص ۱۰۴ - ۱۰۵، مطبوعہ لاہور ۱۹۱۲ء

اب بندہ کا رخ سامانہ کی طرف تھا۔ سامانہ[1] کے بارے میں گنڈا سنگھ رقم طراز ہے:

Samana was one of the richest towns in these districts and war expected to yield a booty large enongh to free them from the enxie ty for their future military operations. 2

۲۶ نومبر ۱۷۰۹ء کی صبح بندہ اور اُس کے دستے شہر میں داخل ہو گئے۔ مقامی حکام کو کسی قسم کے دفاعی اقدامات کی مہلت نہ ملی۔ گلیوں اور بازاروں میں گھمسان باقاعدہ خونریز جنگ ہوتی رہی۔ نالیوں سے خون ندیوں کی طرح بہنے لگا۔ شام تک سمانہ کا خوبصورت قصبہ کھنڈرات کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ دس ہزار سے زائد مسلمان تہ تیغ کر دیئے گئے[3]

سکھ مؤرخ گیانی گیان سنگھ لکھتا ہے

"سوتے ہوئے کو جاگنے کی فرصت نہ تھی بیٹھے کو کھڑا نہ ہونے دیا۔ جو کھڑا مل گیا اُسے بھاگنے نہ دیا۔ ایک آن کی آن میں قیامت بپا کر دی۔ تین روز تک برابر لوٹا گیا۔ ایک ایک نے دو دو تین تین پشت تک کا سرمایہ جمع کر لیا۔ باقی کچھ نہ چھوڑا۔ سارا قصبہ ویران کر دیا۔ جو لوگ بچ گئے۔ وہ بیچارے گاؤں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اس خبر کو سن کر پنجاب کے جتنے ڈاکو اور رہزن تھے۔ سب بندہ کے ساتھ آکر شریک ہو گئے اور سکھ بن گئے[4]"

---

[1] یہ شہر پٹیالہ سے ۱۵ میل جنوب کی طرف ہے۔ کسی زمانے میں یہ بہت بڑا اور حاکم نشین مقام تھا۔
(محمد حسن خاں، تاریخ پٹیالہ، ص ۴۹، مطبوعہ امرت سر ۱۸۷۸ء)

[2] بندہ سنگھ بہادر ص ۳۸، مطبوعہ امرت سر ۱۹۳۵ء

[3] گنڈا سنگھ، بندہ سنگھ بہادر، ص ۴۰۔ نارنگ ٹرانسفارمیشن آف سکھزم، ص ۱۰۵، میکس آرتھر میکالف سکھ ریلیجن جلد ۵، ص ۲۴۷، دہلی ۱۹۶۳ء

[4] شمشیر خالصہ حصہ دوم، ص ۱۸۵۔ ۱۸۶، مطبوعہ سیالکوٹ

فتح سنگھ نامی سکھ کو یہاں کا فوجدار مقرر کیا گیا۔ سکھوں کا اگلا ہدف سرہند تھا چنانچہ سکھ لشکر نے اس طرف کا رخ کیا۔ راستے میں متعدد مقامات پر قبضہ کر لیا۔ گھرام پٹھانوں کی بستی تھی۔ انھوں نے دلیرانہ مقابلہ کیا۔ مگر تباہی ان کا مقدر رہی۔ ٹھسکہ بغیر کسی مدافعت کے ہاتھ آگیا۔ شاہ آباد میں بے نام مدافعت ہوئی۔ یہاں سے بندہ نے شمال مشرق کا رخ کیا۔ مصطفےٰ آباد پر حملہ کر کے قبضہ کیا۔ کپوری کا بھی یہی حشر ہوا۔ انبالہ اور کنج پور کی بھی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی[1]

ساڈھورا اس علاقے کا ایک اہم قصبہ تھا۔ عثمان خاں مقامی حاکم نے مزاحمت کی۔ مگر سکھوں نے بآسانی قبضہ کر لیا۔ گلیوں میں خونریز جنگ ہوئی۔ بیشتر مسلمانوں نے ایک حویلی میں پناہ لے لی مگر سب بیدردی کے ساتھ تہ تیغ کر دیئے گئے۔ یہ جگہ اب تک قتل گڑھی کہلاتی ہے[2]

شمشیر خالصہ کا سکھ مصنف گیان سنگھ لکھتا ہے۔

"سکھوں نے مسلمانوں کو لکڑی گاجر کی طرح کاٹنا شروع کر دیا۔ جو سامنے آیا کسی کو نہ چھوڑا۔ جو ہندو تھے وہ بھی بہ مشکل تمام اپنا اپنا سر ننگا کر کے چوٹی دکھاتے۔ اور نجات پاتے۔ مسلمان اس سخت حملہ کی تاب نہ لا سکے۔ دفعتہً شہر چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ تمام رات شہر لوٹا گیا۔ دوسرے دن لشکر نے پھر تمام دن شہر کو لوٹا۔ اور بندہ نے وہاں خیمہ جا کر مسلمانوں کی لاشوں کو آگ میں جلانا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ قبروں میں سے مسلمانوں کی لاشیں اور ہڈیاں بھی نکلوا نکلوا کر جلوادیں جتنی مسجدیں اور عبادت گاہیں تھیں وہ سب مسمار کرادیں۔ بلکہ ان کے بڑے بڑے پیر بہاء الدین و قطب الدین جیسوں کی قبریں کھدوا کھدوا کر ان کی ہڈیاں تک آگ میں جلوادیں۔ اس کے بعد وہاں کے رئیس عثمان خاں کو زندہ سرنگوں درخت سے لٹکوا کر طعمۂ زاغ و زغن کر دیا[3]"

---

[1] گنڈا سنگھ، بندہ سنگھ بہادر، ص ۴۴۔ نارنگ، ص ۱۰۵۔ گپتا، لیٹر مغل ہسٹری آف دی پنجاب، ص ۴۶

[2] نارنگ، ٹرانسفارمیشن آف سکھزم، ص ۱۵۶، مطبوعہ لاہور ۱۹۱۲ء

[3] گیان سنگھ، شمشیر خالصہ دوم، ص ۱۸۷،

ساڈھورا کے بعد مخلص[1] پور کے قلعے پر قبضہ کیا گیا۔ چھٹ اور بنور پر بھی یلغار ہوئی اور بے شمار مسلمان تہ تیغ ہوئے۔

سرہند پر حملہ

اب سرہند پر حملہ کا راستہ ہموار تھا۔ اب تک کی فوجی کامیابیوں کی وجہ سے بندہ کی پوزیشن خاصی مضبوط ہو گئی تھی۔ بقول گیان سنگھ۔

> "روز بروز سکھوں کے مذہب کی ترقی ہونے لگی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں بندہ بہادر کے ساتھ ہزار ہا آدمیوں کی جماعت رہنے لگ پڑی جس کا کام سوائے مسلمانوں کے گاؤں لوٹنے، ان پر ظلم کرنے کے اور کچھ نہ تھا۔[2]"

فوجدار سرہند وزیر خاں تمام صورت حال کا سنجیدگی سے مطالعہ کر رہا تھا۔ اس نے سرہند کے لیے حفاظتی اقدامات شروع کر دیئے تھے۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ سکھ سرہند کا رخ کرنے ہی والے ہیں۔ اسی دوران اسے اطلاع ملی کہ دوآبہ لبست اور مانجھہ کے سکھوں کی ایک بھاری جماعت بندہ کے ساتھ شامل ہونے کے لئے آرہی ہے۔ اس لئے سوچا کہ ان دونوں فوجوں کو آپس میں نہ ملنے دیا جائے۔ چنانچہ اس نے مالیر کوٹلہ کے شیر محمد خاں کو اس سکھ دستے کا راستہ روکنے کے لئے روانہ کیا۔ شیر محمد خاں نے اپنے بھائی خضر خاں اور بھتیجوں نشتر خاں اور ولی محمد خاں کو بھی ہمراہ لیا۔ اس دوران مانجھہ کے سکھ روپڑ تک آچکے تھے۔ شیر محمد خاں نے ان پر حملہ کیا۔ سارا دن لڑائی جاری رہی۔ اگلے روز خضر خاں حملہ کی

---

[1] یہ قلعہ عہد شاہجہانی میں مخلص خاں نے بنوایا تھا۔ یہ ساڈھورا اور ناہن (ساڈھورا سے ۹ کوس) کے درمیان ایک مضبوط پہاڑی قلعہ تھا۔ قلعہ قبضے کے وقت خستہ حالت میں تھا۔ بندہ نے اس کی مرمت کی اور اسے لوہ گڑھ کا نام دیا۔ (گنڈا سنگھ، بندہ سنگھ بہادر، ص ۱۸)

[2] شمشیر خالصہ دوم، ص ۱۸۶

قیادت کر رہا تھا۔ اچانک اسے ایک گولی لگی اور وہ شہید ہو گیا۔ اس کے گرتے ہی افغان دستوں میں افراتفری مچ گئی۔ نشتر خاں اور ولی خاں بھی مارے گئے۔ شیر محمد خاں خود سخت زخمی ہوا چنانچہ سکھوں کی پیش قدمی نہ روکی جا سکی۔ اور دونوں فوجیں کھراڑ اور بنور کے مابین انبالہ، روپڑ شاہراہ پر ایک دوسرے سے مل گئیں۔[1]

وزیر خاں نے سکھوں کی آمد کی خبر سنی تو تین چار ہزار افراد کے ہمراہ جو اس کے پاس موجود تھے سرہند سے نکلا۔[2] بارہ کوس کے فاصلے پر موضع چھپڑ چیری کے مقام پر دونوں فوجوں میں ٹکراؤ ہوا۔ بندہ کی جمعیت ۲۰ ہزار سے زائد تھی۔ یہ تصادم ۲۲ مئی ۱۷۱۰ء کو ہوا۔

وزیر خاں اور ان کے ساتھی بہت جوانمردی سے لڑے۔ مالیر کوٹلہ کے شیر محمد خاں اور خواجہ علی نے نمایاں شجاعت کا مظاہرہ کیا۔ وزیر خاں باوجود بڑھاپے کے جوانوں کی طرح لڑا لیکن آخر کار انہیں شکست ہوئی پوری فوج تباہ و برباد ہو گئی۔ شہر میں یہ خبر پہنچی تو بقول ایک معاصر مورخ سید محمد قاسم۔

> "خبر نکبت اثر بشہر در رسید حس و حرکت از دیگر حکام بے دولت و رعایا بے دست و پا رفت پسر کلاں وزیر خاں اصلاً بہ خزائن و دفائن نہ پرداختہ خود و بزرگ متعلقان خود را ہمراہ خود گرفتہ رو بہ شاہجہاں آباد بر آمد و ہر کس در آں کم فرصتی ترک مال و منال گفتہ بہر ذلت و رسوائی بہ جلا کشیدہ جاں بسلامت بُردند و ہر کہ در فکر گرد آوری اسباب تلاش و افکار مختلف پابند شدہ گرفتار پنجہ قہر کفار نابکار گردید۔[3]"

سوہن لال سوری لکھتا ہے۔

---

[1] تیجا سنگھ: سسٹری اینڈ فلاسفی آف دی سکھ ریلیجن جلد اول، ص ۲۰۸۔ گنڈا سنگھ، بندہ سنگھ بہادر، ص ۵۱۔۵۲

[2] دست اندازی بر اموال بعضی متردین و مسافرین از دلوقوع آمد چوں ایں خبر بامسالت مرتبت وزیر خاں فوجدار چکلہ سرہند رسید برائے تنبیہہ ایں فیہ غیر ناجیہ با فوج کہ ہمراہ داشت سوار شدہ، (محمد قاسم عبرت نامہ ص ۱۵ الف، ۱۵ ب، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔ لاہور)

[3] محمد قاسم، عبرت نامہ، ص ۱۵ الف، ب۔

"تمام حکام اسلامیہ دست و پائے تدبیر گم کردہ در کنج خمول و زاویہ عزلت خزیدند[1]"

خافی خاں رقمطراز ہے۔

"سرہند شہری بود پر از مال تجار و صرافان مالدار و کاسبان صاحب مایہ و شرفائے ہر قوم خصوص از اعیان صلحاء و فضلا زیادہ از شمار دراں شہر سکونت داشتند ہیچ کدام فرصت جان و مال و عیال بدر بردن نداشتند و از شنیدن کشتہ شدن وزیر خاں و بغارت رفتن لشکر اسلام حوصلہ باختہ محصور گردیدہ یک دو روز دست و پای لاحاصل زدہ خیر گرفتار قہر الٰہی گشتہ رضا بقضا دادند و آں سگ سیرتاں بد خصال شروع بغارت مال و قتل رجال و اسیر نمودن اطفال و عیال وضیع و شریف نمودہ تا سہ چہار روز چناں بیداد و ظلم نمودند کہ شکم عورات حامل را پارہ ساختہ ہر طفل کہ زندہ بر می آید بر زمین می زدند و عمارات را سوختہ فقر و غنی را بیک صورت می ساختند و ہر جا کہ مسجد و مقبرہ و مزار بزرگان یافتند شکستن و کندن و برآوردن استخوان مردہ تحقیر نمودند[2]"

........the heartless Muslim population was subjected to an indiscriminate plunder. City lost heavily in life and property.[3]

سرہند کے قتل عام کے بارے میں گیان سنگھ رقم طراز ہے۔

"سکھوں نے شہر میں داخل ہو کر لوٹ مار کی وہ آفت برپا کی جس کا بیان نہیں، جو سامنے نظر پڑھا، کیا بچہ، کیا جواں، کیا ادھیڑ، کیا بوڑھا، تلوار سے دو ٹکڑے

---

[1] عمدۃ التواریخ، اول، ص ۷۷، لاہور ۱۸۸۵ء

[2] منتخب اللباب، جلد دوم، ص ۶۵۴، کلکتہ ۱۸۷۴ء

[3] بندہ سنگھ بہادر، ص ۶۷

ہوا۔ لوگ شہر چھوڑ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ بیچاری پٹھانوں کی مستورات اور امیر زادیاں جنہوں نے کبھی دوسرے آدمی کی شکل نہ دیکھی تھی، بازاروں اور جنگلوں میں ماری ماری پھریں۔ نہ ماں کو بیٹی کی خبر رہی، نہ بیٹے کو باپ کی سُدھ، سب کو اپنی اپنی پڑ گئی، کوئی کسی کو نہیں پوچھتا تھا۔ غرض سکھوں نے تین روز تک شہر سرہند کو خوب لوٹا۔ کسی کے گھر میں کچھ باقی نہ چھوڑا۔ بعد ازاں تین روز کے بعد بندہ نے لوٹ کو بند کر کے اول تو اُن مسلمانوں کو جو لوٹ کے وقت پکڑ پکڑ کر مختلف مکانوں میں بند کر دیئے گئے تھے، نکال نکال کر بھیڑ و بکریوں کی طرح ہلاک کروایا۔ کوئی زن و بچہ نہ چھوڑا، یہاں تک کہ حاملہ عورتوں کے شکم چاک کروا کروا کر ان کے بچوں کو نکلوا کر مروا ڈالا جتنی مساجد و معابد گاہیں وہاں تھیں سب کو مسمار کرا کے زمین کے برابر کر دیا، غرض بندہ نے وہاں ایک ہفتہ تک وہ کشت و خون کا بازار گرم رکھا کہ زمین و آسمان میں تہلکہ مچ گیا مسلمان لوگ پناہ پناہ پکارنے لگے[1]"

سرہند سے بندہ کے ہاتھ دو کروڑ روپے کی مالیت کا مال غنیمت آیا[2]۔ مصنف تاریخ ارادت خاں نے لکھا ہے:

"سہرند را با محالات کثیر از پنجاب تا بوریہ و ساڈھورا و سہارنپور وغیرہ قصبات ہر دو طرف جمنا قتل و غارت نمودہ بہ تخریب و ویرانی عمارت مساجد و معابد مسلمین و کندن قبور بزرگان و اہانت و استخفاف اسلام و مسلمین دست تطاول دراز کرد۔ یوماً فیوماً دائرہ فساد و کفران مخاذیل در اشتعال داشت۔ و دراں دیار

---

[1] شمشیر خالصہ، ص ۱۹۰ - ۱۹۱

[2] اِروِن، لیٹر مغلز، ص ۹۷

بل قریب وجوار کسی نیست کہ انسداد شورش آں متعاہیر تواند نمودن وتاب مقاومت برروی آں فتنہ تواند آورد[1] "

جیمز براؤن نے لکھا ہے ۔

Neither Hindusnor Mussalmans found any means of safety but in acknowledging and submitting to their authority.[2]

سرہند کے بعد بھی سکھوں نے تاخت وتاراج جاری رکھی ۔عملی طور پر اس علاقے میں اب اس کی حکومت قائم ہو چکی تھی ۔ خافی خاں نے لکھا ہے

"بعد فراغ تاراج سرہند درہمہ پرگنات برائے تحصیل باج وخراج عمال خود تعین نمودند[3] "

سوہن لال سوری لکھتا ہے :

"ہر جانبی قتیلی واز ہر طرف ذبیحی و ہر سمت جریحی و ہر سو قطیعی ، دریائے محیط از خون برروئے زمین رواں گردیدہ و سرہائے کشتگاں امواج بحر وسلاح مردم باخذ آں تواں گفت ۔ حاصل کلام خجستہ ارتسام آنکہ از دریائے سفلیج کہ بہ لودہانہ معروف است کہ تا کرنال عمل و دخل ذات ملکی آیات رونق نمائش گرفت[4] "

بندہ نے مخلص پور کے قلعے کو اپنا صدر مقام بنایا اسے لوہ گڑھ کا نام دیا گیا ۔ اب بندہ پوری طرح شاہانہ انداز و اطوار اختیار کر رہا تھا ۔ اس نے ایک سکہ ڈھلوایا جس کے ایک طرف فارسی میں یہ شعر کندہ تھا

---

[1] مبارک اللہ واضح ، تاریخ ارادت خاں ، مرتبہ غلام رسول مہر ، ص ۹۶ ، لاہور ۱۹۷۱ء

[2] انڈیا ٹریکٹ دوم ، ص ۱۰ ، لندن ۱۷۸۸ء

[3] منتخب اللباب ، جلد دوم ، ص ۶۵۴

[4] عمدة التواریخ اول ، ص ۷۸

سکہ زد بر ہر دو عالم تیغ نانک واہب است ‌ ‌ ‌ فتح گوبند سنگھ شاہ شاہاں فضل سچا صاحب است

دوسری طرف یہ تحریر تھی ۔

ضرب بہ امان الدہر مصورت شہر زینت التخت مبارک بخت

بندہ کی مہر پہ یہ شعر کندہ تھا ۔

دیگ و تیغ و فتح و نصرت بے درنگ ‌ ‌ ‌ یافت از نانک گورو گوبند سنگھ

اس نے اپنا سن بھی قائم کیا ۔ اور اسے فتح سرہند سے شمار کیا[1]

اب بندہ نے زیادہ منظم انداز میں اپنی کارروائیوں شروع کیں ، جمنا پار کر کے سہارن پور ، بہات ، نانوتہ ، امبیٹھہ کو غارت کیا ۔ جلال آباد[2] کے فوجدار جلال نے خاصی مدافعت کی یہاں سکھ ناکام رہے ۔ اب انھوں نے مزید اس علاقے میں کارروائیاں مناسب نہ سمجھیں اور جالندھر کی طرف آگئے ۔ شمس خاں یہاں کا فوجدار تھا ۔ اس کا صدر مقام سلطان پور تھا ۔ سکھوں نے اسے لکھا کہ وہ ان کی اطاعت قبول کر لے ۔

" خط بدستور پروانہ مشتمل بر قبول اطاعت و سرانجام نمودن بعضی فرمائشی واستقبال نمودن با خزانۂ موجود[3] "

شمس خاں نے اُن کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ۔ سکھوں کی تعداد ۷۰ ، ۸۰ ہزار کے لگ بھگ تھی ۔ سلطان پور سے سات کوس کے فاصلے پر راہوں کے مقام پر ۱۱ اکتوبر ۱۷۱۰ء کو فریقین میں لڑائی ہوئی ۔ شمس خاں کو شکست ہوئی ۔ سکھوں نے اس کے بعد جالندھر کا رخ کیا ۔ ہوشیار پور بھی ان کے تسلط میں آگیا ۔ آہستہ آہستہ سوائے لاہور کے سارا علاقہ ان کی عملداری میں آگیا ۔

---

[1] بندہ سنگھ بہادر ، ص ۸۰ ۔ ۸۴

[2] سہارنپور سے ۳۰ میل جنوب اور دیوبند سے ۲۰ میل مغرب ۔

[3] خافی خاں ، منتخب اللباب ، جلد دوم ، ص ۶۵۸

قاسم لاہوری لکھتا ہے :

" پرگنات عمدہ مثل ٹبالہ[1] و کلانور[2] کہ پائے تخت محمد اکبر جلال الدین بادشاہ بودند با وفور متعہ و اجناس و حدائق جنت اساس محسود کابل و کشمیر است از ظلم ایں فرقہ آتش فساد خاک سیاہ شد و از بے جراتی ناظم صوبہ (سید محمد اسلم) قدم شوم ایں بوماں تا سواد شہر سیاہی کردہ تہلکہ برائے آرام لبتراں بہشت آباد لاہور و آثار نکبت شر و شور خود فراہم می آوردند[3] "

لاہور کی طرف

شالامار باغ تک مضافات ان کی غارت گری کی زد میں آگئے۔ لاہور میں بندہ اور اس کے سکھ دستوں کی خبر سے دہشت پھیل گئی۔ سکھ لاہور پر حملہ کا تہیّہ کئے ہوئے تھے۔ سید محمد اسلم ناظم اور کاظم خاں دیوان تھا۔ صوبائی فوج اس قابل نہ تھی کہ سکھوں کی یلغار کو روک سکتی۔

ان حالات میں لاہور کے دفاع اور باشندگان لاہور کے حوصلے قائم رکھنے کے لئے رضا کار فوج کی تشکیل کی گئی اور اس کا نام حیدری فوج رکھا گیا۔ اس فوج کا مقصد یہ تھا کہ نوجوانان لاہور کو جمع کرکے فوجی تنظیم اور جنگی قواعد سے آشنا کیا جائے۔ اس کی تنظیم کا کام میر تقی، محمد عنایت خاں، تہار بیگ اور مصطفیٰ خاں نے اپنے ذمے لیا۔ شہریوں سے مالی امداد بھی لی گئی۔ بعض ہندو بھی اس تحریک کی پشت پر تھے۔ جو بندہ کی انسانیت سوز کارروائیوں سے واقف تھے۔ ان میں راجہ بہار مل نمایاں تھے۔ علماء نے بندہ بیراگی کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا۔ تاریخ میں یہ پہلا موقعہ تھا۔ کہ سکھوں کو اسلام کا دشمن اور خلق خدا کا

---

[1] لاہور سے ۷۰ میل شمال مشرق

[2] لاہور سے ۷۰ میل شمال مشرق

[3] عبرت نامہ، ص ۵۵ الف

رہزن قرار دے کر علماء نے ان کے خلاف جنگ کا فتویٰ صادر کیا۔

اس اعلان کے بعد جہاد کا سبز پرچم عیدگاہ میں نصب کر دیا گیا۔ یہ عیدگاہ موجودہ پل گرٹھی شاہو کے قریب تھی۔ حیدری فوج کی تشکیل اور اعلان جہاد کے بعد مسلمانوں میں جوش و خروش بے حد بڑھ گیا۔ لیکن شہر کے اندر بسنے والے پُرامن غیر مسلموں میں سے کسی کا انھوں نے بال تک بیکا نہ کیا۔

دوآبہ باری کے سکھوں نے اپنے جتھوں کو خوب منظم کیا ہوا تھا۔ ان کا ایک چوتھائی حصہ لاہور کی تاخت کے لئے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ یہ جماعت شہر سے کچھ دور راوی کے کنارے موضع بھرت میں مقیم تھی۔ حیدری فوج کے غازیوں کا ایک دستہ وہاں گیا اور ان کی تادیب کرکے واپس آگیا۔

اسی اثنا میں خبر ملی کہ بہت سے سکھ کوٹلہ بیگم نامی ایک گاؤں میں جمع ہو رہے ہیں حیدری فوج ان کے خلاف روانہ ہوئی۔ لاہور سے چل کر مجاہدین نے موضع بھیلووال میں قیام کیا۔ بعد ازاں آگے بڑھ کر انھوں نے کوٹلہ بیگم کا محاصرہ کر لیا۔ سکھ منجھے ہوئے اور تجربہ کار جنگجو تھے۔ حیدری فوج پُرامن شہریوں پر مشتمل تھی۔ شام کو آندھی اور باد و باراں کی وجہ سے حالات خراب ہو گئے۔ حیدری فوج کے لیے صورت حال ناقابل برداشت ہوگئی۔ اس اثنا میں سکھوں نے زوردار حملہ کر دیا۔ بہت سے مجاہد شہید ہو گئے۔ باقی نقصان اٹھا کر پسپا ہو گئے۔ تاہم اس سے سب بڑا فائدہ یہ ہوا کہ بندہ بیراگی نے لاہور کو مسلح اور مضبوط خیال کرتے ہوئے شہر پر حملہ نہ کیا[1]۔

بہادر شاہ کی مہم

بہادر شاہ کام بخش کی مہم سے فارغ ہوکر دکن سے واپس آرہا تھا کہ اجمیر کے پاس ۱۰ اپریل ۱۷۱۰ء کو اسے بندہ کی شورش کی خبر ملی۔ تھانیسر اور سرہند کے لٹے پٹے لوگوں نے بادشاہ کے آگے آہ و زاری کی۔ بہادر شاہ نے فوراً بندہ کے خلاف بنفس نفیس کارروائی کرنے کا فیصلہ کر لیا اور خان خاناں

---

[1] تاریخ پنجاب، بوٹے شاہ، ص ۱۰۳ ب، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری

صوبیدار اودھ محمد امین خاں، فوجدار مراد آباد خاں جہاں، ناظم الہ آباد اور سید عبداللہ خاں بارہہ کو بھی اس مہم میں شامل ہونے کا حکم دیا[1]۔

خود بادشاہ ۲۷ رجون ۱۷۱۰ء کو روانہ ہوا۔ مالکم لکھتا ہے:

> **If Bahadur Shah had not quitted the Deccan which he did in 1710, there is very reason to think the whole of Hindustan would have been subdued by invaders.**[2]

شاہی فوج کی آمد سے اس علاقے کے بے دل حکام کو تقویت ملی۔ چھوٹی بڑی بے شمار مہمات میں سکھوں کو شکستیں دی گئیں۔ خان خاناں منعم خاں نے بندہ کو لوہ گڑھ کے قلعے میں گھیر لیا۔ محاصرہ روز بروز تنگ ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ بندہ کا بچ نکلنا محال ہوگیا۔ اس کے ایک وفادار ملازم گلابو نے پیشکش کی کہ وہ اس کی جگہ بیٹھ جاتا ہے اور بندہ کو مشورہ دیا کہ وہ فرار ہو جائے۔ چنانچہ بندہ نے ایسا ہی کیا۔ جب شاہی فوج کا قلعہ پر قبضہ ہوا تو بندہ کے لباس میں گلابو موجود تھا۔ اگرچہ اس مہم میں بیشمار سکھ مارے گئے۔ تاہم بندہ کے فرار ہونے کی وجہ سے کوئی خاص فائدہ حاصل نہ ہو سکا[3]۔

بندہ نے فرار ہونے کے بعد پہاڑوں کا رخ کیا۔ اور اس کے منظر عام سے ہٹتے ہی سکھوں نے بھی جو پہلے ہی شاہی فوجوں کے خوف سے مارے مارے پھر رہے تھے، پہاڑیوں کا رخ کیا۔ بندہ کا تعاقب کیا گیا۔ تاہم وہ عام رسائی سے بہت دور ہو چکا تھا۔ بادشاہ لاہور کی طرف آگیا۔ تاہم

---

[1] لطیف، ہسٹری آف دی پنجاب، ص ۲۷۵ - ۲۷۶ — اروِن، لیٹر مغلز، ص ۱۰۳ — شجاع الدین

سیاسی اور ثقافتی تاریخ نقوش لاہور نمبر، ص ۷۵ - ۷۷

[2] سکیچ آف دی سکھز، ص ۷۹

[3] صمصام الدولہ، مآثر الامرا، جلد سوم، ص ۶۷۲ - ۶۷۳۔ کلکتہ — مبارک اللہ واضح

تاریخ ارادت خاں، ص ۱۰۰ - ۱۰۴

وہ عام رسائی سے بہت دور ہو چکا تھا۔ بادشاہ لاہور کی طرف آگیا اور یہیں فروری ۱۷۱۲ء میں اس کا انتقال ہو گیا اور حسبِ معمول جنگ تخت نشینی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جس میں جہاندار شاہ کامیاب ہوا۔ اس نے زبردست خاں کو لاہور کی نظامت دی۔ جلد ہی فرخ سیر نے جہاندار شاہ کو معزول کر دیا (۱۰ رجنوری ۱۷۱۳ء)

یہ عرصہ سکھوں کے لیے بے حد سازگار ثابت ہوا۔ وہ پہاڑیوں سے اتر آئے۔ سرہند کا نیا فوجدار زین الدین خاں ان سے نبرد آزما تھا۔ بندہ نے ساڈھورا کے پاس ہی ایک نیا قلعہ استوار کر لیا[1]

عبدالصمد خاں بحیثیت ناظم پنجاب

فرخ سیر نے تخت نشین ہوتے ہی کئی انتظامی تبدیلیاں کیں۔ ۲۲ رفروری ۱۷۱۳ء کو عبدالصمد خاں کو پنجاب کا ناظم بنایا۔ سکھوں کی سرگرمیوں کے پیش نظر اسے حکم بھیجا کہ بندہ کے خلاف کارروائی کی جائے۔ کئی سرداروں کو نئے ناظم کی کمک کے طور پر لاہور روانہ کیا۔ عبدالصمد نے عہدہ سنبھالتے ہی بندہ بیراگی کی شورش پر توجہ دی۔ زین الدین خاں فوجدار سرہند نے بندہ اور اس کے ساتھیوں کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ عبدالصمد فوراً ساڈھورا پہنچا۔ وہاں صورتِ حال یہ تھی کہ بندہ خود تو قلعہ لوہ گڑھ میں تھا۔ اور اس کے ساتھی ساڈھورا کے قلعے میں محصور تھے۔ عبدالصمد نے بیک وقت دونوں قلعوں کا محاصرہ کرنے کے بجائے ان سے باری باری نمٹنے کا پروگرام بنایا۔ پہلے ساڈھورا کا محاصرہ مضبوط کیا گیا۔ لیکن جب یہ قلعہ فتح ہو گیا تو بندہ فرار ہو گیا اور پہاڑوں کی طرف چلا گیا۔ اس طرح گوہرِ مقصود ہاتھ سے نکل گیا۔

عبدالصمد واپس لاہور آگیا۔ اب سکھوں کی سرگرمیاں مدھم پڑ چکی تھیں۔ اکتوبر ۱۷۱۳ء سے فروری ۱۷۱۵ء تک بندہ کی کارروائیوں کی کوئی خاص تفصیل نہیں ملتی۔ سکھ پہاڑوں میں پناہ لینے

---

[1] اِروِن۔ لیٹر مغلز جلد اول، ص ۳۰۷

پر مجبور ہو گئے تھے۔

۱۷۱۵ء کے شروع میں سکھ ایک بار پھر پنجاب کے میدانوں کی طرف آ گئے۔ انہوں نے کلانور اور بٹالہ پر حملے کئے اور مقامی فوجداروں سہراب خاں اور شیخ محمد دائم کو شکستیں دیں[1]

عبدالصمد خاں نے اس بار بندہ کا مقابلہ کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر تیاری شروع کر دی۔ پنجاب کے تمام مقامی حکام کو اپنے اپنے دستوں کے ہمراہ پہنچنے کے لیے کہا گیا چنانچہ اس کے احکامات ملنے پر مرزا احمد خاں فوجدار گجرات، ارادت مند خاں فوجدار ایمن آباد، شیخ محمد دائم فوجدار بٹالہ، سید حفیظ علی خاں فوجدار بیت پورپٹی، سہراب خاں فوجدار کلانور اور راجہ کٹوچ، راجہ بھیم سنگھ اور ہردیو جسرونتہ اپنی اپنی فوجیں لے کر پہنچ گئے[2] عبدالصمد نے لاہور سے کوچ کیا۔ بندہ کو کلانور کے قریب کوٹ مرزا جان کے مقام پر شکست ہوئی اور اس نے پسپائی اختیار کر لی۔ حتیٰ کہ وہ گورداس پور کے قلعے میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا۔

گنڈا سنگھ کے خیال میں یہ مقام گورداس ننگل ہے جو گورداس پور سے چار میل مغرب کی طرف واقع ہے اور یہاں باقاعدہ کوئی قلعہ نہ تھا۔ محض ایک احاطہ سا بنا ہوا تھا[3] جلد ہی عبدالصمد کے دستوں نے پہنچ کر محاصرہ کر لیا۔ قلعے کے محاصرے میں اتنی شدت برتی گئی کہ گھاس کا ایک تنکا اور غلہ کا ایک دانہ بھی اندر نہ جانے دیا گیا۔ کبھی کبھار حملہ کیا جاتا۔ تاہم قلعہ بندی اتنی مستحکم تھی کہ اس سے کوئی خاص نتیجہ نہ نکلتا۔

عبدالصمد نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ محصورین کو بھاگنے سے روکنے کے لیے مزید فوج درکار ہے۔ چنانچہ قمرالدین خاں نے حسب استدعا فوج روانہ کر دی۔ یہ محاصرہ اپریل ۱۷۱۵ء

---

[1] محمد قاسم، عبرت نامہ، ص ۱۰۷ الف، ب

[2] محمد قاسم، عبرت نامہ، ص ۱۰۸ الف، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔

[3] بندہ سنگھ بہادر، ص ۲۰۱ - ۲۰۲

میں شروع ہوا۔ قلعہ کے ارد گرد عبدالصمد نے لاتعداد درخت کٹوا کر پشتے بنوا دیئے۔ سات ماہ اسی طرح گزر گئے۔ سکھوں کا سامان رسد ختم ہونے لگا۔ جانوروں کو کاٹنے کی نوبت آ گئی۔ آگ نہ ہونے کی وجہ سے کچا ہی کھا جاتے۔ خافی خاں لکھتا ہے:

"فوجِ پادشاہی در فرصت ایام راہ رسد غلہ و کاہ بداں فرقہ بدانجام مسدود ساخت و ہر چہ ذخیرہ دراں قلعچہ فراہم آوردہ بودند با تمام رسید و روز بروز ابواب تردد آمد و شد بر روئے آں تبہ کاراں بستہ می گردید و کار بجای کشید کہ بانواع حیل د ساخت کہ با مردم لشکر اسلام می نمودند ہر آثار غلہ بدو روپیہ و سہ روپیہ گاہ بدست آوردہ نامرداراں آنہا برائے قوت لایموت برابر کف دست بستور روائی مرلیفی زہر مارمی نمودند ...... و عرصۂ زندگانی برآنہا تنگ گردیدہ بود۔ و بعضی چہار پایاں را کشتہ از بیصر نیامدن ہمہ گوشت خام می خوردند و از خون شکم و گرسنگی ہر روز جمعی بجہنم واصل می شدند ...... کار بخوردن چہار پایاں و پوست درختاں کشید و قریب ہفت ہشت ہزار کس ازاں ناکساں مردار خوار از ناقۂ بدار البوار پیوستند[1]"

آخر کار ۱۷ دسمبر ۱۷۱۵ء کو بندہ نے ہتھیار ڈال دیئے بچے کھچے سکھ گرفتار کر لئے گئے۔ انہیں لاہور لایا گیا۔ یہاں سے دو ہزار سکھوں کے سر اور ۷۴۰ قیدی دہلی روانہ کر دیئے گئے۔ بندہ کو لوہے کے پنجرے میں بند رکھا گیا تھا۔ دہلی میں سب قیدیوں کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ ۱۹ جون ۱۷۱۶ء کو بندہ بھی اپنے انجام کو پہنچ گیا[2] اس طرح ایک خون آشام بغاوت اور انسانیت سوز تحریک کا خاتمہ ہو گیا۔

---

[1] منتخب اللباب جلد دوم، ص ۷۶۳، کلکتہ ۱۸۷۴ء - اِروِن، لیٹر مغلز، ص ۲۸۵، لندن ۱۹۰۲ء

[2] گنڈا سنگھ، بندہ سنگھ بہادر، ص ۲۱۴

بندہ بیراگی کی حرکتوں نے پنجاب میں سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان وحشیانہ عداوت کو جنم دیا۔ اٹھارھویں صدی کے آغاز سے سکھ مسلم تعلقات میں یہ جو سنگین کشیدگی رونما ہوئی اس کے اثرات ١٩٤٧ء تک شدت سے محسوس کئے گئے اور تقسیم ملک کے وقت پنجاب میں ایک بار پھر بندہ بیراگی کی روح کارفرما ہوئی۔

بندہ بیراگی کے سفاکانہ کردار کی باشعور اور امن پسند سکھوں نے بھی مذمت کی ہے[1]۔ عبدالصمد خاں نے سکھوں کی قوت اس شدت سے کچل دی تھی۔ کہ اگلے پندرہ بیس سال کے لیئے ان کی سرگرمیاں ختم ہو کر رہ گئیں۔ محض سکھوں کی لاقانونیت اور غارت گری کی وجہ سے ان کے خلاف سخت کارروائیاں کی گئیں۔ ورنہ اکثر اس امر کی کوششیں کی گئیں کہ سکھ پُرامن شہریوں کی طرح زندگی بسر کرنا شروع کر دیں۔

عبدالصمد خاں پنجاب کے عظیم ناظمین میں سے تھا۔ اس کی انتظامی صلاحیتوں نے صوبے میں لاقانونیت کی جڑیں کاٹ دیں۔ اور خوش حالی کا دور دورہ رہا۔ عبدالصمد خاں کو پنجاب میں امن وامان اور اقتدار اعلیٰ بحال کرنے لیے سکھوں کے علاوہ بھی کئی طاقتوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ رفتہ رفتہ اس کی فوجی برتری اور تدبیر نے سب پر قابو پالیا۔

---

[1] تفصیلات کے لئے دیکھئے۔ ابوالامان امرتسری، سکھ مسلم تاریخ حقیقت کے آئینے میں، ص ١٥٥-١٥٨، لاہور ١٩٥٦ء

باب ٣

مقامی بغاوتیں

سترھویں صدی میں ہندوستان کے تمام سرحدی صوبوں میں سے پنجاب میں سب سے زیادہ امن وسکون رہا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ جہانگیر، شاہجہاں، اورنگ زیب اور بہادر شاہ بنفسِ نفیس لاہور آتے رہے۔ علاوہ ازیں وسط ایشیا، قندھار اور درۂ خیبر کی طرف عام مہمات جاتی رہتی تھی۔

اٹھارویں صدی کے اوائل میں سکھوں نے سر اٹھایا اور پوری شدت سے پنجاب کے قلب میں بغاوت کی آگ فروزاں کر دی۔ گزشتہ باب میں بندہ بیراگی کی مہم پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ سکھوں کے علاوہ بھی پنجاب میں بے شمار شر پسند اور باغی ذہن موجود تھے۔ اس باب میں ان کا تذکرہ مقصود ہے۔ ساتھ ہی ان علاقوں کا ضمنی ذکر کر دیا گیا ہے۔ جو جغرافیائی طور پر پنجاب کا حصہ ہوتے ہوئے بھی عملی طور پر ناظماں پنجاب کی عملداری میں نہ تھے۔ تاہم انھوں نے حکومت سے قریبی رابطہ رکھا اور تصادم کی صورت حال پیدا نہ ہوئی۔

پنجاب میں دٹو، ڈوگر، رانگھڑ، گوجر اور جاٹ قبائل اضطراب وانتشار کا منبع رہے ہیں وسیع وعریض جنگلوں نے اس خطے میں جرائم پیشہ ذہن کو تقویت اور تحفظ پہنچایا۔ ڈاکو اور لٹیرے منظم طور پر کارروائیاں کر کے جنگلوں میں پناہ لے لیتے۔ ایک جنگل کرنال سے لدھیانہ تک پھیلا ہوا تھا۔ - لکھی جنگل سینکڑوں میل کے علاقہ میں پھیلا ہوا تھا۔ الغرض دریاؤں کے ساتھ جنگلوں کے طویل سلسلے پھیلے ہوئے تھے۔ بندہ بیراگی کی زیر قیادت سکھوں کی سرگرمیوں نے پنجاب

کے لاقانونیت پسند عناصر[1] کی ذہنی پشت پناہی کی چنانچہ عبدالصمد خاں اور زکریا خاں کے عہد میں کافی بغاوتیں ہوئیں۔ یہ دونوں ناظم حد درجہ مستعد اور دلیر ثابت ہوئے۔ بغاوتیں فوراً ہی دبا دی گئیں۔ بعد کے زمانوں میں اس قسم کی نوبت ہی نہ آسکی اور ملک احمد شاہ ابدالی اور سکھوں کی غارت گری کی آماجگاہ بن کر رہ گیا۔ چند نمایاں بغاوتوں کا حال بیان کیا جاتا ہے۔

عیسیٰ خاں منج کی بغاوت

عیسیٰ خاں منج[2] رنگھڑ راجپوت تھا۔ اس قوم کے بہت سے افراد پرگنہ سرہند کے علاقے میں جاگیرداری اور زمینداری کے ذریعے زندگی بسر کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ رہزنی اور ڈکیتی بھی ان کا مشغلہ تھا۔ عیسیٰ خاں کے آباء و اجداد قدیم زمانے میں زیادہ حیثیت کے مالک نہ تھے اس کے دادا لولاقی نے کوشش و محنت سے نام پیدا کر لیا۔ جب اُس نے طاقت بڑھالی تو چوری اور غارت گری کا آغاز کر دیا۔ مردم آزاری کرنے لگا۔ اور ڈاکوؤں کا سردار بن گیا۔ اس کے بعد اُس نے ایک جماعت فراہم کر لی اور جہاں تک اس کی دسترس ہوتی تھی، لوٹ مار کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے نواحی زمینداریوں اور علاقوں پر زبردستی قبضہ کر لیا اور حشمت و شوکت کا مالک بن گیا۔ اس کے بیٹے دولت اور پوتے عیسیٰ خاں نے اپنے آبائی پیشے کو جاری رکھا۔ عیسیٰ خاں نے اُس علاقے میں خاص اہم سیاسی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد جب شہزادہ اعظم اور معظم میں تخت نشینی کے لیے کشمکش ہوئی تو عیسیٰ خاں نے معظم کا ساتھ دیا۔ اور جنگ میں بہادری دکھائی۔ کامیابی حاصل کرنے

[1] سرکار، فال آف دی مغل ایمپائر جلد اول، ص ۱۸۶-۱۸۷، کلکتہ ۱۹۳۲ء

[2] (i) خافی خاں نے یہ نام عیسیٰ خاں بھند لکھا ہے (منتخب اللباب جلد دوم، ص ۷۶۷، کلکتہ ۱۸۷۴ء)

(ii) مآثر الامرا مصنفہ شاہنواز خاں میں عیسیٰ خاں مین تحریر ہے، حصہ دوم ص ۸۲۵

(iii) بلاخمن نے لکھا ہے کہ مئین یا منج رنگھڑ راجپوتوں کا ایک قبیلہ ہے جو سرہند اور بہت دوآب کے رہنے ہیں (ترجمہ آئین اکبری ص ۵۲۶، کلکتہ ۱۸۷۳ء)

کے بعد معظم (بہادر شاہ اول) نے اُسے منصب دار بنا دیا۔

۱۷۱۲ء میں بہادر شاہ اول کے بیٹوں کے درمیان لاہور میں جنگ تخت نشینی ہوئی۔ عیسیٰ خان نے ایک لشکر جرار کے ہمراہ جہاندار شاہ کی حمایت میں جنگ میں حصہ لیا۔ اس نے دوران جنگ اور پھر بعد میں دیگر شہزادوں کے مال و اسباب کو خوب لوٹا۔ خزانوں سے بھرپور چھکڑے اس کے ہاتھ آئے۔ کسی شخص نے اُس سے پوچھ گچھ بھی نہ کی۔ فتح حاصل کرنے کے بعد جہاندار نے اُسے پنج ہزاری منصب کے علاوہ پتھہ اور لکھی جنگل کی فوجداری عطا کی[1]

محمد قاسم لاہوری لکھتا ہے۔

"ازسفاہت نسبی و فطری جماعت اکثری از قطاع الطریق را مرجع و رفیق بودند۔
وجایہائے اکثری از اقربای خودش خراب کردہ بے انصافیہای اوبودہ،
یا افاغنہ ہمیشہ طبل برابری کوفتہ۔ دست بردہای نمایاں می کرد و با قوم ڈوگر
وکھرل و ہزار مفسدان لکھی جنگل کہ مصدر شر و شور سواد لاہور اند ہمیشہ سرکوب آنہا
بود[2]۔"

اسرار صمدی کے مصنف نے تحریر کیا ہے کہ

"دست ستم بخونریزی مردم دراز ساختہ خلل تمام در احوال مسافرین و مترددین
انداختہ بود[3]۔"

خافی خاں کے الفاظ میں:

"بسبب تقاضای ایام و انقلاب سلطنت سر از آستین اطاعت برآوردہ طریقہ

[1] شاہنواز خان، مآثر الامرا جلد دوم، ص ۸۲۶-۸۲۵، کلکتہ ۱۸۹۰ء مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لاہور

[2] عبرت نامہ، ورق ۱۱۳ الف، ۱۱۳ ب، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لاہور

[3] اسرار صمدی، ص ۱۷، مرتبہ پروفیسر شجاع الدین، لاہور

سرکشی از روی بدنہادی اختیار نمودہ، محصول محال جاگیرداراں دور دست را بتعدی متصرف می شد وگاہ گاہ بر قافلہای راہ کابل وکشمیر تاختہ قطاع الطریق می نمود و سر از اطاعت صوبہ داراں وحکام می پیچید ومکرر فوج صوبہ داراں وفوجداراں مقابل او رفتہ عزیمت یافتہ بودند"[1]

صمصام الدولہ شاہنواز خاں لکھتا ہے۔

"سرکشی اور بغاوت زمینداری کا خاصہ ہیں۔ جیسے ہی سلطنت میں انقلاب آیا۔ اور جہاندار شاہ کی حکومت ہوئی۔ عیسیٰ خاں نے سرکشی شروع کردی اور اطراف وجوانب میں لوٹ مار کا آغاز کر دیا اور سابقہ طریقے کے مطابق دہلی اور لاہور کے قافلوں کو لوٹنے لگا۔ قرب وجوار کے فوجداروں سے مقابلہ اور لڑائی کی اور بہت مغرور ومتکبر ہوگیا۔ اس نے لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کے ذریعہ سے بہت مال واسباب جمع کرلیا۔"

اُس نے حیلہ اور بہانہ سازی سے تحفے اور ہدیے بھیج کر صمصام الدولہ خان دوراں سے توسل وتعلق پیدا کرلیا۔ اس کو زعم تھا کہ اس کا تعلق ایک اعلیٰ سردار سے ہے۔ لہٰذا جدھر چاہتا تھا لوٹ مار کرتا تھا۔

اس کی سرکشی وبغاوت بہت بڑھ گئی۔ اس علاقے کے جاگیرداروں پر واجب مال میں سے کوئی چیز نہیں چھوڑتا تھا۔ دریائے بیاس کے کنارے سے کہ جہاں اُس نے ادریسا نام کا ایک قصبہ بسایا تھا۔ اُس کے خون سے شیر بھی ڈرتا تھا۔ دوسرے کی کیا مجال تھی کہ اُس کے علاقے میں دست درازی کرسکے[2]

---

[1] منتخب اللباب جلد دوم، ص ۷۶۷ ۷۶۷

[2] مآثر الامرا جلد دوم، ص ۸۲۷، ۸۲۶

عبدالصمد خاں نے عیسیٰ خاں کے باغیانہ اقدامات کے باوجود فوری طور پر اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی۔ اس نے عیسیٰ خاں کو سمجھانے کی کوشش کی مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا

"رفتہ رفتہ طرق وشوارع آں اضلاع حکم دم تیغ بہم رسانید وخلائق بلاد ومواضع آں حدود رو بخرابی نہاد۔ نواب ہرچند بنا بر بزرگ منشی دفرشتہ خوئی می خواست کہ بہ پند ونصائح دل پذیر وچشم نمائی ظاہری آں گروہ را براہ آرد چوں بادیہ پیمائی ضلالت بود، سودی نمی کرد واثری نمی بخشید[1]"

چنانچہ جب "شورش او از حد گزشت وفریاد بیداد آں کج نہاد بآسماں رسید"[2]۔ تب عبدالصمد خاں نے شہداد خاں خویشگی[3] کو اس علاقے کی فوجداری پر مقرر کیا اور عیسیٰ خاں کے خلاف کارروائی کرنے کا حکم دیا۔ عبدالصمد خاں بندہ بیراگی کی مہم سے فارغ ہوچکا تھا۔ شہداد خاں کے ہمراہ معقول تعداد میں دستے روانہ کئے گئے۔ تھارہ کے قریب (۱۷۱۱ء) میں دونوں کا سامنا ہوا۔ عیسیٰ خاں کے پاس تین ہزار جنگجو ہر طرح سے لیس موجود تھے۔ انھوں نے اس مہارت اور دلیری سے شہداد خاں کا مقابلہ کیا وہ ان کا سامنا نہ کرسکا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ اتفاق سے اسی دوران ایک گولی باغی سردار کے باپ دولت خاں کو لگی اور وہ ہلاک ہوگیا۔ عیسیٰ خاں کو اس پر بہت طیش آیا اور وہ جوش انتقام میں تیزی سے ہاتھی کو لے کر شہداد خان کے پاس پہنچ گیا۔ جو ایک چھوٹی سی ہتھنی پر

---

[1] اسرار صمدی، ص ۱۷، ۱۸

[2] اسرار صمدی، ص ۱۸

[3] اس کا نام عبدالرحیم تھا۔ قصور سے تعلق رکھتا تھا۔ ایک کم حیثیت اور غیر معروف شخص تھا مگر اپنی بہادری کی بنا پر بہت جلد ممتاز عہدوں پر فائز ہوگیا۔ بہادر شاہ اول کے زمانے میں پانصدی منصب اور شہداد خاں خطاب پایا۔ عیسیٰ خاں منج کی مہم نے اس کے اقبال میں اضافہ کیا۔ اسے ہانسی حصار کی فوجداری ملی۔ وہاں حُسنِ انتظام کی بدولت شش ہزاری منصب سے سرفراز ہوا۔ حملۂ نادر شاہ کے دوران دلیرانہ لڑتا ہوا مارا گیا (شاہنواز خاں، مآثر الامرا جلد دوم، ص ۷۱۱ تا ۷۱۵)

سوار تھا۔

عیسیٰ خاں نے شہداد خاں پر حملہ کر دیا۔ تلوار کی چند ضربیں شہداد کو لگیں۔ اسی اثنا میں ایک تیر عیسیٰ خاں کے ایسا لگا کہ وہ جانبر نہ ہو سکا اور اس طرح اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ عبدالصمد خاں کے حکم سے اس کا سر کاٹ کر دہلی بھیج دیا گیا۔ بعد ازاں اس کی زمینداری اس کے بیٹے کو مل گئی جس نے عام زمینداروں کی طرح زندگی اختیار کر لی۔

یہ فتح بہت دور رس ثابت ہوئی اور اس سے پنجاب میں سرگرم عمل انتشار پسند قوتوں کو خاصا ضعف پہنچا۔ شاہی دربار میں بھی اس فتح کی خوب پذیرائی ہوئی۔ محمد قاسم لاہوری لکھتا ہے۔

"ظہور ایں فتح کہ امرائے عظام بداں افتخار کنند عبدالصمد خاں را وسیلہ اعتبار در جہاں مدار علاوہ فتح گور و مقہور ظاہر شد و مظلوماں تعدی آں مقتول شاد بہا کردند۔"[1]

حسین خاں خویشگی کی بغاوت

حسین خاں قصور کے مشہور افغان خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے والد سلطان احمد کی دربار شاہی میں خاصی عزت تھی۔ اس کے دو بھائی بایزید خاں اور پیر خاں دہلی میں شاہی منصب دار تھے۔ حسین خاں کو بھی منصب ملا تھا۔ تاہم وہ قصور واپس آگیا تھا اور وہیں رہا۔ جو کچھ دوسروں کو محنت اور کوشش سے ملتا تھا اسے اس سے بڑھ کر گھر بیٹھے مل جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ اس علاقے کی ریاست پر برقرار رہا۔ کافی سپاہ اور جمعیت کی وجہ سے اپنے سوا کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا لاہور کے صوبہ داروں کو حساب نہ دیتا تھا۔[2]

---

[1] (i)، عبرت نامہ، ورق ۱۴ ب (ii)، شاہنواز خاں، مآثر الامرا و جلد دوم، ص ۸۲۷-۸۲۸ (iii)، خافی خاں، منتخب اللباب جلد دوم، ص ۷۶-۷۸ھ، کلکتہ (iv) اسرار صمدی، ص ۱۶ تا ۲۱

[2] مآثر الامراء، جلد اول، ص ۶۰۰-۶۰۱، کلکتہ ۱۸۸۸ء۔

اسرار صمدی کا مصنف لکھتا ہے:

"حسین خاں افغانی قافلہ سالار افاغنۂ قصور کہ از قصور عقل و نقصان دانائی اوج گرائی قصر نخوت و غرور بودہ، دیگری را بخاطر نمی آورد از بس جہالت و خیرگی کہ خاصہ آں قوم است، تن را با طاعت بادشاہی ندارد و جاگیرات آں نواح را تمغای خود تصور نمودہ دامے بہ تنخواہ داراں نمی داد و حاصلات آں جا را بلا قصور متصرف درآمد و قصور جمعیت ہارا بے بنیاد می داشت۔"[1]

قصور اور اس کے اطراف و جوانب میں حسین خاں کی سرداری کا ڈنکا بجتا تھا۔ جب پنجاب کی حکومت عبدالصمد خاں کو عطا ہوئی تو وہ نئے ناظم کے ساتھ اخلاص و اتحاد کے ساتھ پیش آیا اور اس سے ملاقات کے لئے لاہور پہنچا۔ عبدالصمد خاں نے اس کے رویے سے خوش ہو کر لکھی جنگل کی فوجداری بھی اس کے سپرد کر دی۔ لیکن یہ شفقت و عنایت مثبت اثرات پیدا نہ کر سکی حسین خاں اور بھی مغرور ہو گیا اور پہلے سے بھی زیادہ فساد و سرکشی اختیار کی۔ جب ناظم نے دیکھا کہ لکھی جنگل کا محاصل بھی قصور کے محاصل کی طرح وصول نہیں ہو رہا اور کسی قسم کا حساب نہیں دیا جاتا تو اس نے قطب الدین روہیلہ کو اس کے تعلقہ پر مقرر کر دیا۔ حسین خاں نے قطب الدین کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ کیا، بلکہ اس پر فوج کشی کر دی اور اس کے جان و مال کو غارت کر دیا۔[2] عبدالصمد خاں نے کچھ مدت تک اس طرف سے چشم پوشی برتی۔

"چوں نواب بمقتضای حلم و بردباری و تحمل و فرشتہ کرداری از و چشم پوشی می نمود ایں معنی باعث مزید نخوت و سرشخی او می گردید۔ . . . . . . در اندک ایام کار بجای رسانید کہ دست تسلط او در محالات سواد شہر لاہور کہ دار السلطنت

---

[1] (i)، ص ۲۴، (ii)، غلام حسین، سیر المتاخرین، ص ۴۲۵ (iii)، محمد علی خاں، تاریخ مظفری ورق ۳۹ الف، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری

[2] مآثر الامراء جلد اول، ص ۶۰۳

گرفتہ اند دراز شدو دندان طمع بہ تصرف حاصلات ایں حدود باز کرد۔ فغاں ہا
از بیداد افغاناں بلند شد[1]۔"

چنانچہ اب عبدالصمد خاں نے اس فتنے کو فرو کرنے کے لئے فیصلہ کن اقدام کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ اس نے سات ہزار سوار ہمراہ لئے اور اس کے مقابلے پر نکلا۔ تصادم سے بچنے کے لئے آخری پُرامن کوشش کے طور پر اسے لکھا۔ کہ قصور اور اس کے قرب و جوار کا علاقہ تمہیں دیا جاتا ہے دوسرے علاقوں کو تم چھوڑ دو۔ اس نے یہ تجویز مسترد کر دی اور تین ہزار سواروں کے ہمراہ مقابلے کے لیے سامنے آیا۔ صاحب مآثرالامرا نے لکھا ہے کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سادات بارہہ (سید عبداللہ خاں، حسین علی خاں) حسین خاں کو لاہور کی صوبہ داری کا لالچ دے کر عبدالصمد سے جنگ کرنے پر آمادہ کیا تھا، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ انھوں افغاں سردار کی سرکشی اور باغیانہ روش کے پیش نظر ناظم پنجاب پر زور دیا تھا کہ اُسے زندہ نہ چھوڑا جائے[2]۔

لاہور سے تین کوس اور قصور سے اٹھارہ کوس کے فاصلے پر واقع قصبہ چونیاں کے نزدیک فریقین میں مقابلہ ہوا[3] بتاریخ ۱۵ اپریل ۱۷۲۰ء بمطابق ۶ جمادی الآخر ۱۱۳۲ھ شاہنواز خان نے اس جنگ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔ افغان مستانہ وار توپ خانہ پر پہنچ گئے۔ اور اس جھلسانے

---

[1] اسرار صمدی، ص ۲۴ - ۲۵

[2] مآثرالامرا، جلد اول، ص ۴۰۶ - تاریخ مظفری کے مصنف نے عبدالصمد کے دستوں کی تعداد اس سے بارہ ہزار لکھی ہے۔ (ورق ۳۹ الف، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری)

[3] اس عہد کے عظیم پنجابی شاعر وارث شاہ نے اپنی لازوال نظم ہیر میں رانجھے اور سہتی کی لڑائی کو حسین خاں اور عبدالصمد کی اس جنگ سے تشبیہہ دیتے ہوئے لکھا ہے ؎

نواب حسین خاں نال لڑیا جویں ابو صمد وچ چھنیا ندے (بحوالہ محمد اسلم، سرمایہ عمر (مجموعہ مقالات) ص ۹۵، لاہور ۱۹۷۶ء۔

والی آگ سے ختم ہو گئے اور نمایاں مقابلے کے بعد دونوں طرف کے ہراول بہادری کے ساتھ مارے گئے، اس طرف سے بایزید خاں کے داماد علی خاں کا لڑکا اور حسین خاں کا بھتیجا مصطفیٰ خاں تھا۔ اور اس طرف سے عبدالصمد خاں کا بخشی فوج کریم قلی خان تھا۔ آغو خاں کا مقابلہ حسین خاں سے ہوا۔ آغو خاں، عارف خاں کے ساتھ میسرہ میں تھا۔ تیر اندازوں نے خوب کام دکھایا۔ حسین خاں، آغو خاں کو چھوڑ کر عبدالصمد خاں پر حملہ آور ہوا اور قیامت خیز مقابلہ ہوا حتیٰ کہ ناظم کے سپاہی ہمت ہار گئے۔ قریب تھا کہ عبدالصمد کو کوئی نقصان پہنچتا اس کے سردار جانی خاں اور حفظ اللہ خاں کی کوششوں سے اکھڑتے ہوئے پاؤں جم گئے۔ اس دوران حسین خاں کا فیل بان مارا گیا۔ وہ خود بھی زخمی ہو چکا تھا۔ مغلوں نے ہاتھی کو نشانہ بنا کر حسین خاں کو گرا لیا[1]۔

اس طرح ایک اہم بغاوت فرو ہوئی جس نے صوبائی دارالحکومت کے نواح میں جنم لے کر صوبے کے نظم و نسق کو ہی نقصان نہ پہنچایا تھا۔ بلکہ حکومت کے وجود کے لئے بھی زبردست خطرہ بن گئی تھی۔ دربار شاہی میں اس فتح کی بہت تحسین ہوئی اور عبدالصمد خاں کو سیف الدولہ کا خطاب عطا ہوا[2]۔

شرف الدین کشمیری

ناظم پنجاب بننے سے قبل عبدالصمد خاں کشمیر کا گورنر رہ چکا تھا۔ انہی ایام سے مولوی شرف الدین کشمیری، عبدالصمد خاں کے دربار سے وابستہ ہو گیا تھا۔ وہ کٹر سنی مسلمان تھا۔ عبدالصمد خاں کی نظامت کے دور میں میر احمد خاں پنجاب کا گورنر تھا۔ اس زمانے میں وہاں محتوی خاں ایک مولوی نے متعصب قسم کے مسلمانوں کی ایک جماعت اکٹھی کی اور مطالبہ کیا کہ ہندوؤں اور شیعہ مسلمانوں پر کچھ پابندیاں عائد کی جائیں۔ انھیں گھوڑے کی سواری کی اجازت نہ دی جائے۔ کئی مقامات پر ان کا داخلہ ممنوع قرار دیا جائے وغیرہ

---

[1] (i) مآثرالامرا جلد اول، ص ۵-۴۰۴ (ii) نیز اسرار صمدی، ص ۲۵ تا ۲۹ (iii) محمد علی خاں تاریخ مظفری، ورق ۲۹ ب، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔ (iv) غلام حسین، سیرالمتاخرین، ص ۴۲۶

[2] غلام حسین، سیرالمتاخرین، ص ۴۲۶

جگہ جگہ فساد شروع ہو گئے اور قتل و خونریزی عام ہوگئی۔ میر احمد خاں گورنر نے بغاوت کو دبانا چاہا مگر خود مارا گیا۔ مولوی شرف الدین کشمیری نے صورتِ حال سے فائدہ اٹھایا اور ایک جمعیت اکٹھی کر کے زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔[1]

اسرارِ صمدی کا مصنف لکھتا ہے۔

" شرف الدین کشمیری کہ خالی از شرفِ علم و کمالِ بلاغت نتواں گفت، گلشن ہمیشہ بہار آں دیار را از صوبہ دار خالی یافتہ جمعی کثیر از طلبہ بوسیلہ فضل و کمال خود فراہم آوردہ بہی طالع و خوبی ایام را ہمہ حال و بآل خود دیدہ ہوائے صاحبی فخر تمام درآں سرزمین پیدا کرد و دراں خطہ جنت نظیر بطور خود بیلہ گردیدہ گلہا پامال ساخت، نواب مستطاب ہر چند بتقاضائے دل سوزے و پاس حق ولی نعمت بدریافت احوال آنجا کردار اژدہاں خونخوار بر خود می پیچید، لیکن چوں صوبہ علیحدہ بود سعی در اصلاح آنجا بے حکم حضور بی فائدہ و تکلف ناحصل می دید۔[2] "

شرف الدین کا ظلم اس حد تک بڑھا کہ لوگوں کے جان و مال محفوظ نہ رہے۔[3]

" نائرۂ ظلم او را بلند ساخت و ہزار گونہ شرار دراں گلزار ہمیشہ بہار انداخت "

اس پر عبدالصمد نے اپنے دستوں کے ساتھ کشمیر پر چڑھائی کی۔ شرف الدین ڈر کر طالبِ عفو و امان ہوا۔ چنانچہ خان نے اُسے معاف کر دیا۔ اس مہم میں عبدالصمد کے ایک افغان جرنیل قباحت خاں خٹک نے بے پناہ صلاحیتوں اور دلیری کا مظاہرہ کیا۔ ملک میں امن و امان قائم کرنے کے بعد عبدالصمد خاں شرف الدین کو اپنے ہمراہ لاہور لے آیا اور اس کی بقیہ عمر عبدالصمد کی خدمت میں گزری۔ اس طرح کشمیر

---

[1] ڈاکٹر افتخار احمد غوری، تعلیقات، اسرارِ صمدی، ص ٦٧

[2] اسرارِ صمدی، ص ٣٠-٣١

[3] ایضاً۔ ص ٣١

بھی ناظمانِ پنجاب کی عملداری میں آگیا اور وہاں امن و امان اور خوشحالی کو فروغ ہوا۔ اسرارِ صمدی کے مصنف نے لکھا ہے۔

باغ کشمیر از کدورت پاک شد — از تبسم غنچہ را لب چاک شد
بسکہ ملک از جان و دل مسرور شد — خطۂ کشمیر باعث نور شد[1]

راجگانِ جموں

دھرپ دیو اور آنند دیو کوہستان جموں کے سرکش زمیندار تھے۔ اکثر ارد گرد کے علاقوں میں تاخت و تاراج کیا کرتے تھے۔ ان کے حوصلے اتنے بڑھ گئے کہ انھوں نے جموں کے گورنر کو نکال کر اس علاقے پر بھی قبضہ کر لیا۔ اور لوٹ مار اور قتل و غارت کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان کا طریق کار یہ ہوتا تھا کہ اگر لاہور کا حاکم جری اور دلیر ہوتا۔ تو شاہ دہلی کے باج گزار بن جاتے ـ بصورت دیگر من مانی کرتے۔

جب عبدالصمد کشمیر میں مصروف تھا۔ تو انھوں نے بغاوت کر دی اور دامن کوہ میں واقع کئی سرکاری پرگنوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ صاحبِ اسرارِ صمدی کے الفاظ میں :

" زمینداران کوہستان جموں کہ در محال زمینداری خود باہم شریک توزیع بودند بسبب بے انتظامی امور سلطنت خیرگی تمام بہم رسانیدہ، سر نخوت بر کوہ الوند غرور می سودند، و حرف سلطانی یک مرتبہ مانند نقشِ خیال از منجملہ حال زود زوال خود محو و منسی ساختہ پیش نائب فوجداری چکلۂ جموں کہ ضمیمۂ صوبہ داری پنجاب بہ نواب تعلق داشت، تن بارجاع نداده پرگنات شاہی واقع دامن کوہ را بہ تصرف در آوردہ بجای خود بآں نقای حیوانی و صورت شیطانی مشق سلطانی

---

[1] اسرارِ صمدی، ص ٣٧-٣٨

می کردند۔[1] "

نواب عبدالصمد کا خیال تھا کہ کشمیر سے واپسی کے موقع پر جموں سے اس فتنے کا انسداد کرتے جائیں گے۔

" ارادہ عزم و بالجزم بر آں بود کہ ہنگام مراجعت کشمیر از ہماں راہ جموں گزار
نمودہ آں ضلع را کہ از ننگ لاخۂ فتنہ و فساد پاک ساختہ داخل لاہور شود۔[2] "

مگر نواب صاحب کی بیگم صاحبۂ کبیر[3] کے انتقال کی وجہ سے یہ معاملہ التوا میں پڑ گیا۔ اسی اثنا میں وہ تحائف جو صوبہ دار کشمیر نے عبدالصمد خان کو بھیجے تھے راستہ میں لوٹ لئے گئے۔ چنانچہ خان نے غضب ناک ہو کر ناظم لاہور زکریا خاں اور فوجدار دوآبہ بست جالندھر آدینہ بیگ کے ہمراہ جموں کی طرف روانہ ہوئے۔ ایک لشکر جرار ساتھ تھا۔ دھرپ دیو اور اس کے ساتھی قلعہ بند ہو گئے

" کوہستانیاں سنگین نژاد شرارت نہاد بکردار شرار، نفرت گزیدہ حصار بند قلعہ

---

[1] اسرار صمدی ، ص ۴۴
[2] ایضاً
[3] نواب عبدالصمد خاں کی شادی ان کی چچا زاد بہن سے ہوئی جو بعد میں بیگم صاحبہ کبیر کے لقب سے ملقب ہوئی وہ ایک فاضلہ اور خدا شناس عورت تھی۔ دم رحلت انھوں نے وصیت کی کہ ان کے زیورات فروخت کر کے ایک مسجد تعمیر کرائی جائے چنانچہ اُس کی وصیت کے مطابق لاہور میں مزار شاہ چراغ گیلانی قادری کے متصل ایک مسجد بنوائی گئی جو اب تک موجود ہے۔ انہی کے نام پر "حضرت ایشاں" کے قرب و جوار کا علاقہ "بیگم پورہ" کہلاتا ہے بیگم صاحبہ کبیر کے دو بچوں نے تاریخ میں نام پیدا کیا۔ ایک ذکریا خاں جو ۱۷۲۶ء میں ناظم لاہور مقرر ہوا۔ دوسری دردانہ بیگم جس کی لڑکی ثریا بیگم جو بعد میں مغلانی بیگم کے نام سے مشہور ہوئی (تعلیقات اسرار صمدی ص ۶۵ - ۶۴)

جموں شدہ بر قلعہ کوہ بند برج دیارہ شقاوت محکم نمودند۔[1] "

کئی روز تک جھڑپیں ہوتی رہیں۔ عبدالصمد کی فوج نے ثابت قدمی سے حملے کئے۔ خاص طور پر اس کے ایک جنگجو حسن بیگ لچہ نے اس معرکہ میں بے پناہ دلیری اور جوانمردی کا مظاہرہ کیا۔ صورت حال کی نزاکت کا احساس کر کے راجگان جموں نے اطاعت قبول کر لی اور خراج دینے پر آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ دھرپ دیو کو جموں پر بحال رکھا گیا۔ آنند دیو نے بھی سرکشی چھوڑ کر اطاعت قبول کر لی[2]

ملتان کی مہم

کشمیر اور جموں کی مہمات سے قبل عبدالصمد خاں کو ۱۷۲۶ء میں ملتان کی نظامت سونپ دی گئی تھی۔ وہاں کے حالات از حد بگڑ چکے تھے۔ زمیندار اور بلوچ سردار حکومت کے احکامات کی چنداں پرواہ نہ کرتے تھے۔ ارباب اختیار چاہتے تھے کہ کسی مناسب شخص کو ناظم ملتان مقرر کیا جائے جو اصلاح احوال کر سکے۔ چنانچہ عبدالصمد خاں کو وہاں کا نظام سنبھالنے کو کہا گیا۔ خان نے پیرانہ سالی اور صوبہ مذکور کی آب و ہوا کی خرابی کے باعث پہلے وہاں جانے سے انکار کیا۔ لیکن مرکزی حکومت کے اصرار پر اس نے ملتان جانا منظور کر لیا۔ اور اس طرح لاہور کی صوبہ داری زکریا خاں کو ملی۔ جب زمینداران لتی[3] اور بلوچ سرحدی محافظوں کو عبدالصمد خاں کی تقرری اور آمد کا علم ہوا تو انہوں نے سر تسلیم خم کر دیا۔ اور مدتوں سے رکے ہوئے واجبات ادا کر دیئے اور اس طرح لاہور کی طرح ملتان بھی امن و امان کا گہوارہ بن گیا[4]

---

[1] اسرار صمدی ، ص ۴۵ [2] ایضاً ص ۴۵ تا ۴۸
[3] لتی — ضلع ملتان میں پنجاب کے سرحدی علاقہ میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ عبدالصمد کے ملتان جانے سے پہلے یہ علاقہ چند باغی زمینداروں کے قبضہ میں تھا۔ (اسرار صمدی ، تعلیقات ص ۷۲)
[4] اسرار صمدی ، ص ۵۰ - ۵۱

جموں کی بغاوتِ ثانی

جموں کے معاملات وقتی طور پر تو باغی عناصر کی سرکوبی اور اطاعت گزاری سے سلجھ گئے تھے۔ مگر عبدالصمد خاں کی ملتان روانگی کے بعد دھرپ دیو نے زکریا خاں کی نو عمری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دوبارہ سرکشی اختیار کی۔ زکریا خاں ایک لشکر جرار کے ہمراہ جموں کی طرف بڑھا[1]۔ اس بغاوت کی خبر سنتے ہی عبدالصمد خاں بھی ملتان روانہ ہو گیا۔

"درساعت وصول این خبر وحشت اثر از آنجا روانہ گردید، مسافت بعید را بسرعت ہرچہ تمام تر پیمودہ بامداد فرزند سعادت مند رسید و سحاب وار ظل کرامت و سایہ استقامت برسر بہادراں کارزار ریخت[2]۔"

چنانچہ ایک زبردست معرکہ ہوا۔ باغی عناصر حملے کی تاب نہ لا سکے۔

"تاب سیف بہادران دلیر جنگ نیاوردہ واز بے جوہری تہور یکشت دست بقبضہ ویک مرتبہ قلعہ راچوں نیام بے صمصام خالی کردند وروی بگریز نہادد رقلعہ باہو[3] کہ متصل جموں واقع است پناہ گرفتند واز آں جا نیز بہ نیروی اجتہاد بہادران دلیر جنگ بے درنگ ہزیمت گزیدہ شرار وار سراد بار بہ غار کوہسار درنہفتند[4]۔"

---

[1] ہمعصر نظم پیر وارث شاہ کے اس مصرعے میں بھی۔ جویں زکریا خاں نے جنگ کیتا لے کے توپ پہاڑتے کڑکیا ای اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے (بحوالہ، محمد اسلم، سرمایہ عمر، ص ۹۶ ، لاہور ۱۹۷۶ء)

[2] اسرارِ صمدی ، ص ۴۹

[3] باہو — حدود جموں میں ایک قلعہ باہو کے نام سے مشہور ہے یحییٰ خان کے دور میں سکھوں نے اس قلعہ پر قبضہ کر لیا تھا (تعلیقات اسرارِ صمدی ، ص ۷۰)

[4] اسرارِ صمدی - ص ۵۰ - ۵۱

راجہ نے تاوان جنگ اور خراج دے کر صلح کر لی۔ اس کے بعد طویل عرصے تک والئی جموں کو سرکشی کی جرأت نہ ہوئی۔ لیکن ۱۱۳۸ھ میں معین الملک کی وفات کے بعد جب پنجاب میں عام افراتفری پھیلی۔ تو راجہ دھرپ دیو کے بیٹے رنجیت دیو نے والد کی پیروی کرتے ہوئے سرکشی اور بغاوت اختیار کر لی[1]۔

کٹوچ

کٹوچ[2] کا راجہ سنسار چند بھی باغیانہ رجحانات رکھتا تھا۔

"از دیر باز مصدر خرابی ہا بودہ محالات متعلقہ قلعہ کانگڑہ را بہ قوت روز مرہ محتاج داشت و دیگر دار زمینداران جموں فی الجملہ نخوت گزیدہ زرہای ما واجب را چنانچہ باید ادا نمی نمودند[3]۔"

چنانچہ جموں کی مہم سر کرنے کے بعد اس کی طرف توجہ کی گئی اور اسے گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے بعد سرحد کابل کے زمینداروں نے سرکشی کی ان کی کماحقہ گوشمالی کی گئی ان سب نے ادائیگی خراج کا وعدہ کر کے اطاعت قبول کر لی[4]۔

جنگ پناہ بھٹی

عبدالصمد خان کے ہاتھوں ملکی نظم ونسق نے خاصا استحکام پالیا تھا۔ داخلی بغاوتیں فرو کرنے میں اس نے کمال مستعدی سے اقدامات کئے جن کے نتیجے میں سرکش اور باغی عناصر کی سرگرمیاں

---

[1] شجاع الدین، مقالہ "سیاسی اور ثقافتی تاریخ" ، نقوش لاہور نمبر ، ص ۸۸

[2] کٹوچ — ضلع کانگڑہ کی ایک چھوٹی سی ریاست ہے۔

[3] اسرارِ صمدی ، ص ۵۳

[4] ایضاً - ص ۵۳ - ۵۴

رفتہ رفتہ کم ہوتی گئیں تاہم زکریا خاں کو لاہور کے نواح میں دو اہم مہمات انجام دینا پڑیں جنگ پناہ بھٹی اس زمانے میں ممتاز سرکش سردار تھا۔ دریائے راوی سے حسن ابدال تک عملی طور اس کا سکہ چلتا تھا۔ یہ سارا علاقہ اس کی تاخت و تاراج اور لوٹ مار کی آماجگاہ تھا۔ زکریا خاں نے اس کے استیصال کے لئے اپنے ایک معتمد سردار راجہ کوڑا مل کو بھیجا۔ اس نے لڑائی کے بعد باغی بھٹی سردار کو ٹھکانے لگا دیا اور اس علاقے میں امن و امان بحال کر دیا۔

میر مار

دوسری لڑائی ایک زمیندار میر مار سے ہوئی۔ اس نے باری دوآب میں لوٹ مار کا طوفان مچا رکھا تھا۔ زکریا خاں نے ایک ترکی الاصل جرنیل قزاق بیگ کو ایک فوج کے ہمراہ اس کی تادیب کے لئے بھیجا۔ اس نے باغی مذکور کو شکست دے کر زندہ گرفتار کر لیا اور اسے لاہور میں لاکر بغاوت کے جرم میں پھانسی دے دی گئی ؎

اورنگ زیب کے زوال کے بعد صوبوں میں مرکز گریز رجحانات نے تقویت حاصل کرنا شروع کر دی تھی۔ تیزی سے زوال پذیر سیاسی حالات نے صوبوں میں خود سری اور خود مختاری کا دور دورہ کر دیا۔ یہ اثرات چھوٹی سطح پر بھی رونما ہوئے اور ہر مقامی زمیندار، فوجدار اور سردار نے اپنی جداگانہ آزاد حیثیت قائم کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے

انتظامی طور پر ایک محدود سا علاقہ براہ راست ناظم پنجاب کی عملداری میں تھا۔ رفتہ رفتہ حالات اس مرحلے پر پہنچ گئے کہ صرف لاہور اور اس کے آس پاس کا علاقہ ہی حکومت پنجاب کی دسترس میں رہ گیا۔

اٹھارویں صدی کے اوائل میں پنجاب میں بے شمار مقامی سرداروں اور زمینداروں نے زور پکڑ لیا تھا۔ ان کی حیثیت اپنے علاقے کے حکمرانوں کی سی ہوتی تھی۔ حکومت لاہور سے ان کی

؎ مآثرالامراء، جلد دوم، ص ۱۰۶

وابستگی رسمی اور روایتی انداز کی تھی۔

سیال

جھنگ کے علاقہ میں سیال خاندان کی حکومت قائم تھی۔ جب شہزادہ معزالدین ناظم ملتان تھا۔ ان دنوں سیالوں کی سرداری سلطان محمود کے پاس تھی۔ اس کے بعد اس کا بھتیجا ولی داد خاں سردار بنا۔ اس نے ۱۷۴۷ء تک حکومت کی۔ ناظمان پنجاب سے اُس کے تعلقات بے حد خوشگوار تھے۔ ولیداد تعظیماً ان کی وفاداری کا دم بھرتا تھا۔ حقیقت میں اسے اپنے علاقے پر کامل اقتدار حاصل تھا۔ اس نے اپنی عملداری میں بے مثل نظام قائم کر رکھا تھا۔ آس پاس کے تمام چٹھے، بالس اور بھٹی سردار اس کے اطاعت گزار تھے۔ تاریخ جھنگ سیال کے مؤلف مولوی نور محمد نے لکھا ہے۔

"ولیداد خاں مرد ذی ہوش و فراست و اہل تدبیر و سیاست و صاحب انتظام و سیاست بود و در فیصلہ مقدمات رعایت جانبی منظور نداشتی و اکثر رجوع شریعت دادی و دزد و رہزن را بموجب فتویٰ شریعت دست و پا بریدی و ہرگز بگفتہ کسی روادار بازنیامدی و آنچہ درمیان دہاقین این ملک رسم کینہ کشی بزور بازوی خود مروج بود بالکل معدوم ساخت تاکہ متنفسی بدون حکم سرکار کا از خود کینہ کشی و انتقام گیری از کسی نمی توانست کرد و پیشہ دزدی و رہزنی کہ از روز اول نامزد این ملک شدہ آمدہ در عہد او نیست و نابود شد و رعایا را آسودگی و امن و امان پدید آمد و آبادی و زراعت پیشگی را رونق تازہ و رواجی بی اندازہ بہم رسید کہ در این ملک سابق مثل او کسی ندیدہ و تخفیف مال گزاری بدینسان بعمل آمدہ بود کہ ہر کس کہ درخواست چاہ نو گزرانیدی برجل اسپ و مقدار آں مشخصہ سالیانہ می شدی کہ بایں ذریعہ چاہاں بکثرت شدند و حالا ہر جا کہ چاہان کہنہ در کچھی و جنگل یافتہ می شوند ہمہ ساختہ

عملداری او ہستند چنانچہ بطور ضرب المثل گردیدہ کہ می گویند فلاں زمین را از عہد ولیداد خاں آباد یا ویرانست و بسبب مسدودی رہزناں و خود امن و اماں بازرگاں را نیز پا کشادہ و رونق بازار تجارت زیادہ بر زیادہ شد۔ پس کار زراعت و تجارت کہ ہر دو موجب رفاہیت خلق اللہ ہست ترقیات گرفتہ برائے رئیس موصوف بر صفحہ روزگار ناپائیدار یادگار ماند۔[1]"

ٹوانے

سیالوں کے شمال میں دریائے جہلم کے مغرب میں ٹوانے تھے ۔ محمد شاہ کے زمانے میں ملک شیر خاں اس علاقے کا حاکم تھا۔[2]

کھرل ، وٹو اور ڈوگر

ضلع ساہیوال میں بہت سی نئی طاقتیں ابھر رہی تھیں ۔ ضلع کے شمال مغربی حصے میں کھرل سب سے زیادہ اہم سیاسی حیثیت کے مالک تھے ۔ کمالیہ پر کھرل سردار سعادت علی خاں کی حکومت تھی ۔ مشرقی حصے میں وٹو اور ڈوگر خاصے اہم تھے ۔ حکومت کمزور پڑتے ہی یہ لوگ باغی اور جھگجو بن گئے اور اس علاقے میں زبردست گڑبڑ پیدا کر دی ۔ وٹوؤں کے مراکز اٹاری اور حویلی تھے ۔ جب کہ ڈوگروں نے ستلج کے کنارے اپنی آماجگاہیں بنا رکھی تھیں ۔

---

[1] ایضاً ص ۵۴ ، میر محمد ۱۸۸۳ء - (۱۱) نیز گرفن اینڈ میسی ، چیفس اینڈ فیملیز آف نوٹ ان دی پنجاب ، ص ۳۶۷ ، لاہور ۱۹۰۹ء

[2] گلشن رائے ، جرنل آف پنجاب یونیورسٹی ہسٹاریکل سوسائٹی لاہور ، ص ۵۹-۶۰ ، اپریل ۱۹۳۳ء

مذہبی گدیاں

ان سیاسی گروہوں کے علاوہ متعدد مذہبی مرکز بھی اقتدار کا منبع بنے ہوئے تھے ۔ پاک پتن کے دیوان اور شیر گڑھ اور حجرہ کے سید نمایاں تھے ۔

The religious bodies possessed large areas, of revenue free grants of land and at the break up of the empire they also became independent secular powers[3]

جوں جوں پنجاب پر ناظموں کی انتظامی گرفت ڈھیلی ہوتی گئی ۔ مختلف علاقوں میں خود مختار اور آزاد سرداریاں جنم لیتی گئیں ۔ عبدالصمد خاں اور زکریا خاں کے تحت پنجاب کی علاقائی وحدت کافی حد تک برقرار رہی ۔ بعد میں صورت حال بالکل مختلف ہو گئی ۔ حتیٰ کہ پنجاب سے مغل حکومت کا خاتمہ ہو گیا ۔

پنجاب کی علاقائی سیاسی حد بندیوں کا جائزہ لینے کے بعد اب ہم زکریا خاں کے دور میں واپس آتے ہیں ۔ جہاں نادر شاہ کی آمد آمد ہے ۔

---

[3] گلشن رائے ۔ جرنل آف پنجاب یونیورسٹی ہسٹاریکل سوسائٹی لاہور ، ص ۱۸ ، اپریل ۱۹۳۳ء

باب ۴

نادرشاہ کا حملہ

۱۷۳۹ء

مئی ۱۷۳۸ء کے اواخر میں شہنشاہِ ایران نادرشاہ نے غزنی کی سمت سے ہندوستان کی سرحد عبور کی۔[1] اور اس طرح تاریخ کی ایک خون آشام مہم کا آغاز ہوا جس نے پنجاب کے کھیتوں سے لے کر دہلی کے گلی کوچوں تک انسانی خون کے دریا بہا دیئے

نادرشاہ کی سفارتیں

نادرشاہ ۹ فروری ۱۷۳۶ء کو ایران کے تخت پر بیٹھا۔[2] اس نے اقتدار سنبھالتے ہی افغانوں کے خلاف فوجی کارروائیوں میں شدت پیدا کر دی۔ افغانوں کو ایران سے نکالنے کے بعد نادرشاہ نے علی مردان خاں شاملو کو سفیر بنا کر دہلی دربار میں بھیجا۔[3] تاکہ اس امر سے مطلع کر دے کہ جلد ہی قندھار کے افغانوں کے خلاف ایک مہم بھیجی جائے گی۔ لہٰذا محمد شاہ سے درخواست کی کہ وہ اپنے صوبہ دار کابل کو حکم دے۔ کہ وہ افغانوں کو اپنے علاقے میں داخل ہونے سے روکے۔ محمد شاہ نے جواب دیا کہ اس نے اس سلسلے میں احکامات جاری کر دیئے ہیں۔ اور اس کام میں مدد دینے کے لئے مزید فوج کابل بھیج دے گا۔[4]

---

[1] لاک ہارٹ، نادرشاہ، ص ۲۳

[2] و۔ مینورسکی، تاریخچہ نادرشاہ، ص ۴۲ (فارسی ترجمہ آقای رشید یاسمی) مطبوعہ تہران ۱۳۱۳ ش

[3] آنند رام مخلص، بدائع وقائع، ورق ۱۱۸ الف، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور

[4] سرکار، نادرشاہ ان انڈیا، ص ۱۶، پٹنہ ۱۹۲۵ء

محاصرہ قندھار کے دوران بہت سے افغان ہندوستانی علاقے کی طرف بھاگ آئے۔ اور یہاں پناہ لے لی، نادرشاہ افغانوں کی نسل کشی کے درپے تھا۔[1] اس کے لئے یہ صورت حال ناقابل برداشت تھی۔ کچھ عرصہ بعد اس نے ایک اور سفیر محمد علی خاں اسی قسم کی گزارش کے ساتھ روانہ کیا، جواب میں حکومت دہلی کی طرف سے سابقہ یقین دہانی کا اعادہ کیا گیا۔[2] لیکن ہندوستانی حکام نے عملی طور پر اس ضمن میں کوئی اقدام نہ کیا۔ نادرشاہ اس طرز عمل سے سخت نالاں ہوا۔

تیسرا ایلچی

آخر کار اس نے ۳۰ اپریل ۱۷۳۷ء کو اپنا تیسرا ایلچی محمد خان ترکمان روانہ کیا۔ تاکہ وہ شاہ ہند سے مغلوں کی طرف سے سرحدات بند نہ کرنے کی شکایت کرے۔ اس سفارت کے بارے میں صاحب مجمل التواریخ کا بیان ذرا مختلف ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ نادرشاہ نے محمد شاہ کو لکھا کہ

"غزنین و کابل از دیر زمان جزو ممالک ایران شمردہ می شد۔ و سلاطین ہندوستان
کہ از دوستان دیرین ایرانند نباید این دو طاقت را در تصرف خویش نگہدارند
و درخواست نمود کہ مقرر دارند غزنہ و کابل بکارداران ایران واگزار شود"[3]

سفیر کو سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ چالیس روز سے زیادہ دہلی میں قیام نہ کرے لیکن یہاں نہ اسے کوئی معقول جواب دیا گیا اور نہ ہی واپس جانے کی اجازت دی گئی۔ بلکہ اُلٹا ایک سال تک اسے دہلی میں رکھا گیا۔[4] ایرانی شہنشاہ نے اس طرز عمل پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور اسے اپنے اقتدار

---

[1] لطیف، ہسٹری آف دی پنجاب، ص ۱۹۸

[2] سرکار، نادرشاہ ان انڈیا، ص ۱۶

[3] ابوالحسن۔ مجمل التواریخ، مطبوعہ تہران، ۱۳۴۴ ش

[4] ۱۱ محمد علی حزین، تاریخ احوال، ص ۲۶۶، مطبوعہ لندن ۱۸۳۱ء

بقیہ حوالے صفحہ ۔۔۔ پر

اعلیٰ کی براہِ راست توہین تصور کیا[1] ۔ نادر شاہ نے اس صورت حال سے تنگ آکر ہندوستان پر باقاعدہ حملے کا منصوبہ بنایا اور محمد خان ترکمان کو فوری طور پر واپس آنے کا حکم دے کر ہندوستان کی طرف یلغار شروع کر دی ۔

حملہ کے دیگر محرکات

تقریباً تمام تاریخوں میں نادر شاہ کے حملۂ ہندوستان کا بنیادی محرک یہی واقعہ بیان کیا گیا ہے تاہم مزید کئی اسباب کی نشاندہی بآسانی کی جاسکتی ہے ۔ ماضی میں مغلوں اور ایرانیوں کے تعلقات مجموعی طور پر خوشگوار رہے تھے ۔ شاہجہاں کے دور میں کشیدگی نے جنم لیا تاہم بعد میں رسمی دوستی باقی رہی ہمیشہ سفارتی امور و آداب ملحوظ رکھے گئے ۔ نئے بادشاہوں کی تخت نشینی پر مبارک بادی پیغامات کا تبادلہ ہوتا رہا لیکن محمد شاہ نے اس روایت کا احترام نہ کیا ۔ اور نادر شاہ کی تخت نشینی پر اسے مبارک باد کا پیغام نہ بھیجا ، اس[2] سے شاہِ ایران کے دل میں گرہ رہ گئی ۔

مغل حکومت اب تیزی سے زوال کی راہ پہ گامزن تھی ، اورنگ زیب کی وفات کے بعد

بقیہ حاشیہ ص۵۷ (۲) عبدالکریم ، بیان واقع ، (مرتبہ ڈاکٹر اے . ڈی نسیم ، ص ۲۴ ، لاہور ۱۹۷۰ء

(۳) غلام حسین طباطبائی ، سیر المتاخرین ، ص ۴۸۰

(۴) لطیف ، ہسٹری آف دی پنجاب ، ص ۱۹۸

(۵) عبدالکریم ، عبرت مقال ، مخطوطہ پنجاب پبلک لائبریری لاہور ، ورق ۸

(۶) تاریخ مظفری ، ورق ۶۴ ب ، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور

[1] لطیف ، ہسٹری آف پنجاب ، ص ۱۹۹

[2] (۱) سرکار ، نادر شاہ ان انڈیا ، ص ۱۵

(۲) ہری رام گپتا ، لیٹر مغل ہسٹری آف دی پنجاب ، ص ۳۰ ، لاہور ۱۹۴۴ء

تخت نشینی کی جنگوں ، اور امراء کی دھڑے بندیوں کی وجہ سے ملکی نظم و نسق درہم برہم ہو چکا تھا ۔ جو سفیر نادر شاہ نے وقتاً فوقتاً ہندوستان بھیجے تھے انھوں نے واپسی پر شاہ کو ہندوستان کی سیاسی ابتری سے بخوبی آگاہ کر دیا تھا[1] ۔ یہ حالات کسی بھی بیرونی حملہ آور کے لیے بہت سازگار تھے ۔ نادر شاہ کی عقابی نگاہوں نے عظیم مغل حکومت کے کھوکھلے پن کو محسوس کر لیا اور اسے اپنی مہم جوئی کی جولان گاہ بنانے کا فیصلہ کیا[2] ۔

بعض تاریخوں میں مذکور ہے کہ نادر شاہ کو ہندوستان پر حملہ کی دعوت نظام الملک (نظام دکن) اور سعادت خاں (صوبہ دار اودھ) نے دی تھی ۔ رستم علی[2] ، جارج فوسٹر[3] ، جیمز فریزر[4] ، مفتی علی الدین[5] ، لطیف[6] ، کنہیا لال[7] کے علاوہ ایک ہم عصر پنجابی نظم نادر شاہ دی وار[8] میں اس امر کی شدید طور پر وکالت کی گئی ہے ۔ کہ نادر شاہ کا حملۂ ہند انہیں دو امراء کی غداری اور سازش کا نتیجہ ہے

اگرچہ اس الزام کی تہ میں کوئی ٹھوس تاریخی شہادت یا استدلال موجود نہیں ہے ۔ تاہم یہ درست ہے کہ دربار دہلی میں زبردست اختلافات اور رنجشیں موجود تھیں ۔ لاک ہارٹ کے خیال میں یہ یقینی طور پر ممکن ہے ۔

---

[1] (۱) عبدالکریم ، عبرت مقال ، ورق ۱۹۴ ، مخطوطہ پنجاب پبلک لائبریری لاہور

(۲) پرسی سائیکس ، ہسٹری آف افغانستان ، ص ۳۳۹ ، لندن ۱۹۴۰ء

[2] تاریخ ہندی ، بحوالہ ایلیٹ اور ڈوسن ، ہسٹری آف انڈیا ، جلد ۸ ، ص ۶۰

[3] جرنی فرام بنگال ٹو انگلینڈ ، ص ۱۵۳ ، لندن ۱۸۰۸ء

[4] ہسٹری آف نادر شاہ ، ص ۱۳۱ - ۱۳۰ ، لندن ۱۷۴۲ء

[5] عبرت نامہ ، مرتبہ ڈاکٹر محمد باقر ، ص ۱۸۳ ، لاہور ۱۹۶۱ء

[6] ہسٹری آف دی پنجاب ، ص ۱۹۹ ، لاہور ۱۸۹۱ء

[7] تاریخ پنجاب ، ص ۶۶ ، لاہور ۱۸۸۶ء

[8] نجابت کوی ، نادر شاہ دی وار ، ص ۶۲ ، لاہور ۱۹۴۵ء

کہ دونوں میں سے ایک غداری کا مرتکب ہوا ہو۔ نظام الملک وسط ایشیائی نسل سے تھا۔ اور سعادت خاں ایرانی النسل تھا۔ اس طرح ان دونوں میں سے کوئی مغل سلطنت کے ساتھ گہرے وفادارانہ احساسات نہ رکھتا تھا۔[1]

نظام الملک کے سوانح نگار نے اس مفروضہ کو ایک بے بنیاد داستان قرار دیا ہے، اس کے خیال میں اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، غالباً صمصام الدولہ اور راجہ جے سنگھ کا حلقہ اس افواہ کو پھیلانے کا ذمہ دار ہے۔ تاکہ بادشاہ کی نظروں میں نظام الملک کی وقعت کم کی جا سکے[2] ایک ہم عصر مصنف، ہنوے کی رائے میں نادرشاہ کو اپنے عزائم کی تکمیل میں اس قسم کے سہاروں کی ضرورت نہ تھی[3]

ان سیاسی اور خارجی محرکات کے ساتھ ساتھ درون خانہ کچھ ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے۔ کہ نادرشاہ ہندوستان کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور ہو گیا۔ پچھلے چند سالوں کی مسلسل مہمات کی وجہ سے ایران میں قحط کی سی صورت پیدا ہو گئی۔ ایرانی معیشت دیوالیہ پن کے قریب پہنچ گئی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے لئے ان حالات میں ایران سے نئے فوجی بھرتی کرنا ناممکن نہیں، تو مشکل ضرور ہو گیا تھا۔ ایران اب اس کی ضرورتیں پوری نہ کر سکتا تھا۔ اب اس کی نظریں کسی اور ہی جگہ پڑتیں، وہ جنگجو افغانوں اور ازبکوں کو اپنے ہاں بھرتی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن کرائے کے سپاہی رقم کے بغیر برقرار رکھنا دشوار تھا۔ اس مسئلے کا واحد حل فتح ہندوستان کی صورت میں تلاش کیا گیا[4]

نادرشاہ کو ہندوستان کی سیاسی ابتری کے ساتھ ساتھ بے پناہ دولت کا حال بھی معلوم تھا چنانچہ اس نے نہ صرف اپنی سپاہ کو مالا مال کر دینے کا خواب دکھایا۔ بلکہ ہندوستان کی بے پناہ دولت سے

---

[1] نادرشاہ، ص ۱۲۴

[2] یوسف حسین، دی فرسٹ نظام، ص ۱۸۶، لندن ۱۹۶۳ء

[3] جونس ہنوے، ریوولیوشن آف پرشیا، جلد چہارم، ص ۱۴۲، لندن ۱۷۵۳ء

[4] لاک ہارٹ، نادرشاہ، ص ۱۲۳

افلاس زدہ ایران کو از سر نو متمول اور دولت مند بنا دینے کا خواب بھی دیکھا

نادرشاہ نے ان سیاسی اور معاشی محرکات سے تحریک پا کر حملۂ ہندوستان کا آغاز کیا۔ سرکار لکھتا ہے۔

> **He proceeded in such a way as to ensure that neutral states and lovers of International law would not be able to condemn his invasion of India as an act of wantonaggression.**[2]

۱۱ جون ۱۷۳۸ء کو غزنی فتح ہوا اور وہاں سے کابل پر چڑھائی کی[3]۔ ناصر خاں کابل اور پشاور کا صوبیدار تھا۔ اس کی فوجی حالت بہت ابتر تھی۔ آنند رام مخلص لکھتا ہے۔

> " خودش از بے زری ہا کہ مکرر بنا بر نہ رسیدن خزانہ بحضور نوشت و کسی نشنید چون گلبن
> خزان دیدہ پا در گل و سپاہش تمام لباس لشکر تصویر زنگ از ردیدہ دی دل
> سپاہ التماس ست کہ منجملہ پنج سالہ طلب یک سالہ خود تنخواہ شود نا قدری لقرض خواہان
> برسد[4] "

ناصر خاں کی یہ انتہائی اہم درخواست بے سود گئی اور اس کی امداد کے لئے کچھ نہ کیا گیا[5]۔ ۳۰ جون کو کابل فتح ہو گیا۔ ناصر خاں پشاور آ گیا اور نادرشاہ کو روکنے کے اقدامات کرنے لگا۔ اس نے پشاور اور خیبر کے اضلاع سے ۲۰ ہزار لگ بھگ افغان جمع کر لئے۔ اور درۂ خیبر کا راستہ بند کر دیا[6]۔ مگر آخر کار مقابلے کی تاب نہ

---

[1] جیمز فریزر، ہسٹری آف نادرشاہ، ص ۱۳۰

[2] سرکار، نادرشاہ ان انڈیا، ص ۱۵

[3] لاک ہارٹ، نادرشاہ، ص ۱۲۴

[4] (۱) بدائع وقائع، ورق ۱۱۹ الف، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور، نیز:
(۲) فریزر، ہسٹری آف نادرشاہ، ص ۱۳۵

[5] ہرچرن داس، چہار گلزار شجاعی، ورق ۳۰۰ الف ب، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور

[6] لاک ہارٹ، نادرشاہ، ص ۱۲۷

لاکر ناصر خاں نے ہتھیار ڈال دیئے (۲۰ نومبر ۱۷۳۸ء)[1]

پنجاب کی طرف

پشاور میں حالات استوار کرنے اور فوج کو مناسب آرام دینے کے بعد کوچ کی تیاری کی گئی۔ ایک مضبوط دستہ آقا محمد کی قیادت میں پہلے ہی آگے بھیج دیا گیا تھا تاکہ پشاور اور دریائے سندھ کے درمیانی علاقے کو روند ڈالے اور دریائے اٹک پر پل تعمیر کرے۔[2] پل تعمیر ہونے کی خبر ملتے ہی نادر شاہ ۶ جنوری ۱۷۳۹ء کو پشاور سے روانہ ہو گیا۔ ۱۵ جنوری کو ایرانی فوج دریائے سندھ کے کنارے پہنچ گئی۔

زکریا خان صورت حال کی سنگینی سے پوری طرح آگاہ تھا، اس نے دربار دہلی میں متعدد بار امداد کی درخواست بھیجی، لیکن اس پر کوئی توجہ نہ دی گئی۔ ہندوستانی حلقۂ امراء نے دربار میں اس کی درخواستوں کی مخالفت کی اور اسے کمک سے محروم رکھنے میں کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ اس انتہائی نازک مرحلہ پر گروہی حسد، غفلت اور حماقت کی وجہ سے حملہ آور کو سرحد پر ہی دھکیلنے کا موقع کھو دیا گیا۔[3] چنانچہ دہلی کی طرف سے مایوس ہو کر زکریا خاں نے اپنے محدود وسائل کام میں لاکر مقدور بھر فوج جمع کی اور دفاعی حکمتِ عملی تیار کرنے لگا۔[4]

---

[1] غلام حسین طباطبائی، سیر المتاخرین، ص ۴۸۱

[2] (۱) لطیف، ہسٹری آف دی پنجاب، ص ۲۰۰

(۱) لاک ہارٹ، نادر شاہ، ص ۱۲۹

(۲) سرکار، نادر شاہ ان انڈیا، ص ۲۶

(۳) آنند رام مخلص۔ "فوج سنگینی بسرکردگی آقا محمد نام تعیین شد کہ ترکتاز نماید و دقیقہ از دقائق خرابی و ویرانی مہمل نہ گذاشتہ۔ بے مضائقہ دست بغاوت و تاراج کشاید۔" (بدائع وقائع، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی، ورق ۱۲۱ ب)

[3] سرکار، نادر شاہ ان انڈیا، ص ۲۱

[4] (۱) آنند رام مخلص، بدائع وقائع، ورق ۱۲۱ ب

(۲) سرکار، نادر شاہ ان انڈیا، ص ۲۶

اٹک کے مقام[1] سے دریائے سندھ کو پل کے ذریعے عبور کرنے کے بعد نادر شاہ نے تیزی سے پیش قدمی شروع کی، پانی کم ہونے کی وجہ سے باقی دریا (جہلم اور چناب) پلوں کے بغیر بآسانی عبور کر لئے گئے۔[2] زکریا خان نے نادر شاہ کی پیش قدمی روکنے کے لئے قلندر خان کی زیر قیادت پانچ چھ ہزار سپاہ پر مشتمل[3] ایک دستہ بھیجا جس نے وزیر آباد سے بارہ میل شمال مغرب واقع ایک چھوٹے سے قلعے کنجاہ[4] کے مقام پر ایرانی فوج کو روکا۔

زکریا خان خود غالباً دس بارہ ہزار سپاہ کے ساتھ لاہور سے ۲۲ میل جنوب پل شاہ دولہ پر ٹھہرا[5] ایرانی ہراول دستے کی قیادت ناصر خان (سابق مغل گورنر کابل، جسے نادر شاہ نے اب اپنی ملازمت

---

[1] "نادر شاہ بسبب نبودن پایاب بر دریا اٹک مقام کردہ بود۔ بہادر خان افغان از قوم بنگش بخدمت نادر شاہ عرض نمود کہ اگر ملک فدوی را تاخت و تاراج نکنند لشکر شاہی را بآن طرف بسہولت میرسانم نادر شاہ مشغول عواطف ساختہ پروانۂ معافی عنایت نمودہ ...... از دریا اٹک عبور نمودہ۔" (رضی الدین احمد، حدیقۃ الہند، ورق ۲۳۸ الف، ب، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری)

[2] (۱) میرزا مہدی، تاریخ جہانگشای نادری، ص ۱۹۷، بمبئی ۱۲۴۵ء

(۲) مرزا محمد مہدی، درۂ نادرہ، ص ۴۲۷، تہران ۱۳۴۱ھ

[3] (۱) لاک ہارٹ، نادر شاہ، ص ۱۲۹

(۲) جہانگشای نادری میں اس کا نام کاچہ مرزا دیا گیا ہے، ص ۱۹۷

[4] (۱) سرکار، نادر شاہ ان انڈیا، ص ۲۶

(۲) شیخ علی حزین نے زکریا خان کی فوجی جمعیت ۱۲، ۱۵ ہزار سوار بیان کی ہے (تاریخ احوال، ص ۲۷۵)

(۳) فریزر نے ۲۰ ہزار لکھی ہے (ہسٹری آف نادر شاہ، ص ۱۴۸) (۴) سرکار نے پل شاہ دولہ کا لاہور سے فاصلہ ۲۴ میل لکھا ہے یہ درست نہیں۔ اس پل کے بارے میں پروفیسر شجاع الدین تحریر کرتے ہیں۔ شاہ دولہ نام ایک مشہور ولی اللہ گجرات میں مدفون ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کئی پل بنوائے جن میں یہ پل بھی شامل ہے جو نالہ ڈیک پر ہے۔ اگر

بقیہ صفحہ ۶۴ پر

میں لے لیا تھا۔) کر رہا تھا۔ ایک زور دار جھڑپ ہوئی۔ ایرانیوں نے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ قلندر خان بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ اور اس کے دستے منتشر ہو گئے۔[1]

ایرانی پیشقدمی جاری رہی۔ دریائے چناب سے بحفاظت پار اتر گئے۔ قلندر خان کی شکست اور موت کی خبر سن کر زکریا خان واپس لاہور آ گیا۔ اور شہر میں قلعہ بندی میں مصروف ہو گیا۔ نادر شاہ کے پنجاب میں اترتے ہی انتشار اور افراتفری نے فروغ حاصل کر لیا۔ شیخ علی حزین لکھتے ہیں کہ

"درمملکت پنجاب خاصہ شہر لاہور فزع قیامت برخاست۔ و ہرکس دست بغاوت و یغما برآوردہ چند ہزار قطاع الطریق شوارع را فرو گرفتہ"[2]

ایرانی افواج جس راستے سے بھی گزریں تباہی و بربادی کی طویل داستانیں چھوڑ گئیں۔ رتن چند رقمطراز ہے۔

"چناں حکم با افواج صادر گشت کہ ہرچہ ذی حیات پیش ازیں در پیش آید از شمشیر درگزرانید[3] ایں معنی آں بے رحماں جفا کار شمشیر قہر الٰہی برکشیدہ ہرچہ پیش دیدہ ..... می آید قتل رسانید"

آنند رام مخلص نے پنجاب کی تباہی کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

بقیہ حاشیہ ص ۶۳
شاہدرہ سے پرانی سڑک کے راستے ایمن آباد جائیں تو شاہدرہ سے اٹھارہ میل کے فاصلہ پر یہ پل آتا ہے شکستہ حالت میں یہ پل اب تک موجود ہے۔ اور دور مغلیہ کے پلوں کے فن تعمیر کا نمونہ ہے (مجلہ نقوش لاہور نمبر ص ۹۵ حاشیہ)

[1] (۱) لاک ہارٹ، ص ۱۲۹

(۲) سرکار، نادر شاہ ان انڈیا، ص ۲۶

(۳) لطیف، ہسٹری آف دی پنجاب، ص ۲۰۱۔ اس لڑائی کی تفصیل اور قلندر خان کی بہادری کا تذکرہ دیکھئے نجابت کوی، نادر شاہ دی وار، ص ۸۴۔ ۸۷

[2] (۱) تذکرۃ الاحوال، ص ۲۷۴۔ ۲۷۳

(۲) نیز غلام حسین، سیر المتاخرین، ص ۸۲۔ ۱۸۴

[3] خالصہ نامہ، ورق ۱۴ الف، مخطوطہ پنجاب یونی ورسٹی لائبریری لاہور

"چہ نوشتہ شود کہ برآں دیار و سکنہ آں گلزار چہ قیامت گزشت، مثل وزیر آباد، و ایمن آباد و گجرات و قصبہ جات بر سر یکی بنا بر کثرت آبادی نیم چہ شہری بودہ است بخاک سیاہ برابر گشت، بریکی آں گل زمین بہ ہزار رنگ بیداد رفت، مالہا تاراج و ناموس ہا برباد رفت۔"

نوک خاری نیست کز خون شکاری سرخ نیست
آفتی بود ایں شکار افگن کزیں صحرا گزشت[1]

بر سر راہ علاقے بری طرح متاثر ہوئے[2] زکریا خاں کے مضبوط انتظامی ڈھانچے کے تار و پود بکھر گئے، پنجاب کے لوگوں کی حالت قابل رحم ہو گئی۔ افراتفری، انتشار اور لاقانونیت نے اس قوت سے سر اٹھایا۔ کہ بعد میں کوئی طاقت ان کے سدباب میں کامیاب نہ ہو سکی۔

زکریا خان نے چودہ پندرہ ہزار سواروں کے ساتھ شہر کے ساتھ ساتھ راوی کے کنارے مورچہ بندی کر رکھی تھی[3]۔ نادر شاہ پل شاہ دولہ پر پہنچا تو اسے زکریا خان کی مورچہ بندی کا احوال معلوم ہوا۔ اس کے لئے سیدھا آنے کا راستہ مسدود تھا، چنانچہ اس نے مشرق کا رخ کیا۔ تاکہ مورچہ بندی سے ہٹ کر دریا پار کر سکے۔

اس دوران عبدالباقی خان، ایرانی وزیر نے زکریا خان کو خط لکھا جس میں اسے ہتھیار ڈالنے اور مزید کشت و خون سے بچنے کا مشورہ دیا۔[4]

آدینہ نگر کے زمیندار کی زیر قیادت ایک مضبوط دستہ زکریا خان کی مدد کے لئے آ رہا تھا۔ لاہور سے چھ کوس

[1] بدائع وقائع، ورق ۱۲۳ الف، ب، مخطوطہ پنجاب یونی ورسٹی لائبریری لاہور

[2] صرف گجرات کے احوال کی تفصیلات کے لئے دیکھئے: مرزا اعظم بیگ، تاریخ گجرات، ص ۱۸، لاہور ۱۸۷۰ء
کیپٹن اے سی ایلیٹ، کرانکلز آف گجرات، ص ۲۷، لاہور ۱۹۰۲ء

[3] شیخ علی حزین، تذکرۃ الاحوال، ص ۲۷۵

[4] آنند رام مخلص، بدائع وقائع، ورق ۱۲۱ ب، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور

کے فاصلے پر ملک پور[1] کے مقام پر ایرانی ہراول دستے سے اس کی جھڑپ ہوگئی، ہندوستانیوں کو بری طرح شکست ہوئی اور وہ تتر بتر ہو گئے۔ تاہم ان سے چند ایک لاہور پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

زکریا خان کے دفاعی مورچوں کو جنوب میں چھوڑتے ہوئے ایرانی فوج نے لکودھر کے قریب سے دریائے راوی عبور کیا، اور شہر سے پانچ میل مشرق شالامار باغ میں ڈیرے ڈال دیئے[2]۔ زکریا خان نے دریائے راوی کے کنارے خندقیں وغیرہ کھود لی تھیں۔ اور توپ خانے کا بہت سا حصہ بھی وہاں متعین کر دیا تھا۔ نادرشاہ کے دریا پار کرنے سے یہ دفاعی حکمت عملی دہری کی دہری رہ گئی تھی۔ ناظم کا بڑا بیٹا یحییٰ خان ایرانی دستوں میں سے راستہ بنا کر بعجلت شاہجہان آباد کی طرف روانہ ہو گیا[3]۔

زکریا خان مسلسل فوجی تیاریوں میں مصروف رہا۔ ۲۲ جنوری کو لڑائی شروع ہوئی۔ زکریا خان نے فوراً ہی محسوس کر لیا کہ زیادہ دیر مدافعت نہ کی جا سکے گی[4]۔ چنانچہ اس نے لڑائی سے ہاتھ اٹھا لیا۔ اور اپنے

---

[1] (۱) میرزا مہدی، جہانکشای نادری، ص ۱۹۷

(۲) علی الدین، عبرت نامہ، ص ۱۸۴

[2] (۱) سرکار، نادر شاہ اِن انڈیا، ص ۲۷

(۲) آنندرام مخلص، بدائع وقائع، ورق ۱۲۳ ب، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور

(۳) رضی الدین احمد، حدیقۃ الہند، "یکی از زمینداران آں نواحی بارادۂ امان ملک خود نادرشاہ را رہنمونی پایاب کرد۔ پس عبور نمودہ،" ورق ۲۴۸ ب، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور۔

[3] آنندرام مخلص، ص ۱۲۳ ب۔

(۲) فرانسیسی مورخ آندرے ڈی کلاسٹر نے جس کی لکھی ہوئی تاریخ طہماسپ قلی خان ۱۷۴۳ء میں پیرس میں طبع ہوئی ــــ لکھا ہے ایرانیوں کی طرف سے ۲۰۰ افراد مارے گئے جب کہ مقامی فوج کے ۳۰ ہزار سپاہی مارے گئے یا غرقِ دریا ہو گئے۔ موخرالذکر تجزیہ مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے۔

[4] آندرے ڈی کلاسٹر، تاریخ نادر شاہ، فارسی ترجمہ محمد باقر امیر خانی، ص ۲۱۹، تبریز ۱۳۴۶

نمائندے کفایت خان کو ہتھیار ڈالنے اور امان حاصل کرنے کے لئے نادرشاہ کے پاس بھیجا۔ نادرشاہ نے ہمدردانہ جواب دیا اور اپنے وزیر عبدالباقی خان کو حکم دیا کہ وہ زکریا خان سے ملے اور اسے اپنی معیت میں اس کے پاس لائے چنانچہ ۲۳ جنوری کو زکریا خان نادرشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ قلعے کی چابیاں اس کے حوالے کیں۔ نادرشاہ نے اس کے ساتھ بہت شفقت اور تعظیم کا برتاؤ کیا۔

ایرانی شہنشاہ کی طرف سے شہر پر ۲۰ لاکھ کا تاوان عائد کیا گیا۔ اس رقم کا کچھ حصہ سرکاری خزانے سے اور کچھ امرائے شہر سے وصول کر کے دو روز بعد زکریا خاں نے مطلوبہ رقم اور دیگر بہت سے تحفے تحائف نادرشاہ کی خدمت میں پیش کئے اور اس طرح زکریا خاں نے اپنی دانشمندی اور تدبیر سے لاہور کو اس عظیم اور ہولناک تباہی سے بچا لیا۔ جو دہلی کا مقدر ہو چکی تھی[1]۔

بعض مورخوں کے خیال میں زکریا خان نے نظام الملک اور سعادت خان سے سازباز کی وجہ سے نادرشاہ کے سامنے کوئی ٹھوس مدافعت نہ کی۔ اور ایک منصوبے کے تحت اسے قبضہ کرنے دیا[2]۔ لیکن یہ نقطہ نظر درست دکھائی نہیں دیتا۔ زکریا خان نے اپنے تمام تر وسائل کے ساتھ مقدور بھر کوشش کی۔

---

[1] (۱) آنندرام مخلص، بدائع وقائع، ورق ۱۲۴ الف، (۲) مرزا مہدی، جہانکشای نادری، ص ۹۸۔ ۱۹۷ بمبئی ۱۳۲۵ھ (۳) شیخ علی حزین، تذکرۃ الاحوال، ص ۲۷۵، (۴) علی الدین، عبرت نامہ، ص ۱۰۴ (۵) لطیف، ہسٹری آف دی پنجاب، ص ۲۰۱، لاہور ۱۸۹۱ء۔ (۶) سرکار، نادرشاہ اِن انڈیا، ص ۲۷، پٹنہ ۱۹۲۵ء (۷) لاک ہارٹ، ص ۱۳۱ (۸) "مبلغ سہ کرور روپیہ بمفصلہ ذیل تاوان گرفت۔ بنام نواب خان بہادر یک کروڑ دعوض آں تاوان صاحب زادہ ظوری خان کہ از حضور بادشاہ خطاب شہوار خاں یافتہ بود در ضامنی شامل رکاب رفت) بنام دیگراں لاہور یک کروڑ بابت آں دلپت رائے پسر لکھپت رائے دیوان بادائے بعلفت شامل رکاب ماند۔ و بنامِ مردمان شہر یک کروڑ۔" احوال آدینہ بیگ خاں، ورق ۵۲، مخطوطہ برٹش میوزیم، فوٹو گراف پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔ لاہور

[2] محمد محسن صدیقی، جوہر صمصام، اور شاکر خاں، تذکرہ۔ بحوالہ لاک ہارٹ، نادرشاہ، ص ۳۰ (حاشیہ)

مرکز کی طرف سے کوئی امداد نہ مل سکنے کی وجہ سے اس کی دفاعی صلاحیت نام نہاد رہ گئی تھی۔ اگر اسے دہلی سے مناسب کمک مل جاتی تو وہ نادر شاہ کو روک سکتا تھا۔ آنند رام مخلص حسرت ویاس میں قلم ڈبو کر لکھتا ہے۔

اے کاش حالا ہم باستعانت خاطر نواب صاحب آعز الدولہ بہادر ناظم ملتان ولاہور پرداختہ
آنچہ مقتضای وقت است بعمل آرند۔ دریں ہنر بیشۂ شجاعت را بامداد ساز و سامانی کہ
درخور ہم چو اوقات می باشد، خوشدل ساختہ تدبیر کار بیرای علم آرائش باز گزارند۔
بی شائبۂ اغراق اگر ایں معنی از قوہ بفعل می رسید خلقی تماشائی کرد کہ از پس پردہ چہ بیرون
خرامید[1]

نادر شاہ نے زکریا خاں کو اُس کے عہدے پر بحال رکھا۔ لاہور ہی میں اُس نے کشمیر کے سابق ناظم فخر الدولہ کی بحالی کے احکامات صادر کئے۔ جو اپنے عہدے کے معزول ہو کر لاہور میں عسرت کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے ناصر خاں کو اپنی طرف سے کابل اور پشاور کا صوبہ دار مقرر کیا۔

زکریا خاں کے دونوں بیٹوں یحییٰ خاں اور حیات اللہ خاں (شاہنواز خاں) کو اس نے اپنی ملازمت میں لے لیا۔ موخر الذکر کو پانچ سو سواروں کے دستے کا قائد بنایا[2]۔ لاہور میں اس نے اپنے نام کا سکہ ڈھلوایا۔ اس کے ایک سمت نادر السلطان اور دوسری سمت ضرب دار السلطنت لاہور ۱۱۵۱ھ خلد اللہ ملکہ، کندہ تھا۔[3]

---

[1] آنند رام مخلص، بدائع وقائع، ورق ۱۲۰ ب، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور

[2] (۱) آنند رام مخلص، بدائع وقائع ورق ۱۲۴ الف، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور

(۲) علی الدین، عبرت نامہ، ص ۱۸۵

(۳) لاک ہارٹ، نادر شاہ، ص ۱۳۱

(۴) سرکار، نادر شاہ اِن انڈیا، ص ۲۸، سرکار کا خیال ہے کہ حیات اللہ خان کو یرغمال رکھا گیا تھا۔

[3] لطیف، ہسٹری آف دی پنجاب، ص ۲۰۲ لاہور ۱۸۹۱ء

نادر شاہ نے دربار دہلی کی سرگرمیوں سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے جاسوسوں اور خفیہ خبر رسانوں کو بھیج رکھا تھا۔ وہ برابر اسے دہلی کی صورت حال سے مطلع کر رہے تھے۔[1]

کابل پر نادر شاہ کے قبضے (۳۰ جون ۱۷۳۸ء) کی اطلاعات جولائی کے پہلے ہفتے میں دہلی پہنچ گئی تھیں۔ لیکن سات ماہ تک سرحدوں کی حفاظت کے لیے کچھ نہ کیا گیا جب نادر شاہ نے درۂ خیبر عبور کر لیا (نومبر ۱۷۳۸ء) تو اس کے عزائم کے بارے میں کوئی شبہ نہیں رہ جانا چاہیے تھا۔ اس کے دو ماہ بعد خطرے کا سامنا کرنے کے لیے کوئی قدم نہ اٹھایا گیا۔

۲ دسمبر ۱۷۳۸ء کو بادشاہ نے تین اعلیٰ حکام اعتماد الدولہ قمر الدین خاں وزیر، نظام الملک آصف جاہ وکیل اور صمصام الدولہ خان دوران امیر الامرا کو حملہ آور کے خلاف تیاری کا حکم دیا۔ اور اخراجات کے لیے ایک کروڑ روپیہ کی منظوری دی۔ انھوں نے دہلی سے باہر شالامار باغ میں ڈیرہ جمایا۔ اور پورا ایک ماہ وہیں ضائع کر دیا[2]

نادر شاہ کو یہ اطلاع مل چکی تھی کہ محمد شاہ اس کے مقابلے کے لیے فوج اکٹھی کر رہا ہے چنانچہ اُس نے محمد شاہ کے نام ایک خط تحریر کیا جس کا مضمون یہ تھا۔ کہ اس کے دل میں دوستانہ جذبات کے علاوہ کچھ نہیں۔ نادر شاہ نے محمد شاہ کے اس رویے پر افسوس کا اظہار کیا جو اس کے ایلچیوں سے روا رکھا گیا۔ آخر میں اس نے تنبیہہ کی۔ کہ اگر ہندوستانی فوج نے اس کا سامنا کیا۔ تو پوری طاقت سے مقابلہ کیا جائے گا۔ اگر اطاعت کا رویہ اختیار کیا گیا۔ تو معاف کر دیا جائے گا۔[3]

---

[1] لاک ہارٹ، نادر شاہ، ص ۱۳۱

[2] (۱) مرزا مہدی، جہانگشای نادری، ص ۱۹۸

(۲) علی الدین، عبرت نامہ، ص ۱۸۵ لاہور

(۳) لاک ہارٹ، نادر شاہ، ص ۱۳۱

[3] لاک ہارٹ، نادر شاہ، ص ۱۳۱

یہ خط روانہ کرنے کے بعد نادر شاہ ۶ فروری ۱۷۳۹ء کو لاہور سے روانہ ہوا۔[1] بیاس کے کنارے پہنچ کر اس نے ایک ظالمانہ حکم صادر کیا۔ کہ وہ ایک ہزار سات سو قیدی موت کے گھاٹ اتار دئیے جائیں جو پشاور سے لاہور کے دوران مہمات میں ہاتھ آئے تھے[2]

ایرانیوں کی پیش قدمی کے دوران شاہ راہ پر پڑنے والے علاقے بری طرح پامال ہوئے[3]۔ لاہور سے کرنال تک راستوں اور دیہاتوں میں ۸ ہزار آدمی مارے گئے[4]

۱۶ فروری کو نادر شاہ سرہند پہنچا۔ وہاں اسے خبر ملی کہ محمد شاہ تین لاکھ افراد اور دو ہزار ہاتھیوں کے علاوہ بیشمار توپوں کے ساتھ کرنال پہنچ چکا ہے[5] چنانچہ اس نے بھی ۲۳ فروری کو ہندوستانیوں کے بالمقابل ڈیرے ڈال دیئے۔ ۲۴ فروری کو جنگ شروع ہوئی۔ شاہی فوجوں کو زبردست شکست ہوئی۔ ۱۰ ہزار کے قریب ہندوستانی مارے گئے۔ ایرانیوں کی طرف سے اڑھائی ہزار ہلاک

---

[1] لاک ہارٹ، نادر شاہ، ص ۱۲۱

[2] (۱) علی الدین۔ عبرت نامہ، ص ۱۸۵

(۲) لطیف، ہسٹری آف دی پنجاب، ص ۲۰۲

[3] سلطان پور کے بارے میں مصنف احوال آدینہ بیگ لکھتا ہے۔ "و قتیکہ دینا بیگ خان حاکم سلطان پور بود۔ فوج غلزئی بسیار جا آتش زوند۔ دینا بیگ خان بہ حکمت عملی ہزار گونہ ترددکردہ و صدہا روپیہ خرچ نمودہ بسیار یرغمالان زنانہ و مردانہ را رہائی دہانید۔" (ورق ۵۰ ب، ۵۱ الف، آٹو گراف پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور)

[4] فریزر، ہسٹری آف نادر شاہ، ص ۲۲۳

[5] (۱) مرزا مہدی، جہانکشای نادری، ص ۱۹۸

(۲) درہ نادرہ، ص ۴۲۹

(۳) لاک ہارٹ، نادر شاہ، ص ۱۳۱

اور ۵ ہزار زخمی ہوئے[1]

دہلی میں نادر شاہ کے قتل کی غلط اطلاع پھیلنے سے تین ہزار کے قریب ایرانی سپاہی قتل کر دیئے گئے۔ نادر شاہ نے اس سے برہم ہو کر قتل عام کا حکم دے دیا جس کے نتیجے میں ۲۰ ہزار ہندوستانی مارے گئے[2] دہلی سے جو مال غنیمت نادر شاہ کے ہاتھ آیا۔ اس کی مالیت ۷۰ کروڑ تک پہنچتی ہے[3]۔ ۱۲ مئی کو نادر شاہ نے ایک بہت بڑا دربار منعقد کیا جس میں ہندوستان کی حکومت دوبارہ محمد شاہ کو سونپی۔ محمد شاہ نے اظہار تشکر کے طور پر دریائے سندھ کا جنوبی علاقہ کشمیر سے سندھ تک نادر شاہ کے حوالے کرنے کا اعلان کیا۔[4]

۱۶ مئی کو دہلی سے کوچ کیا گیا۔ پوری فوج بے پناہ مال غنیمت سے لدی پھندی تھی۔ راستے میں مہم جو دیہاتیوں اور رہزنوں کی بن آئی۔ فریزر لکھتا ہے۔ کہ ایرانی سپاہیوں کا دستور تھا کہ دوران سفر گرد و نواح

---

[1] لاک ہارٹ، نادر شاہ، ص ۱۳۹ - ۱۴۰

(۲) جارج فورسٹر، جرنی فرام بنگال ٹو انگلینڈ، ص ۱۵۷

[2] (۱) عبدالکریم کشمیری، بیان واقع، ص ۳۵، ۳۷

(۲) مختلف مورخین نے مقتول ہندوستانیوں کی تعداد ۸ ہزار سے ۴ لاکھ تک بتائی ہے۔ تفصیلات کے لئے لاک ہارٹ، نادر شاہ، ص ۱۴۹ حاشیہ۔ نیز رضا شعبانی کا مقالہ "شورش دہلی در زمان نادر شاہ، ماہانہ وحید تہران شمارہ نومبر ۱۹۷۰ء، ص ۱۳۸۶ تا ۱۴۰۰

[3] (۱) لاک ہارٹ، نادر شاہ، ص ۱۵۲

(۲) مال غنیمت کی پوری تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، تاریخ اودھ، نجم الغنی، حصہ اول، ص ۴۷، لکھنؤ ۱۹۱۴ء

[4] (۱) لاک ہارٹ، نادر شاہ، ص ۱۵۳

(۲) سرکار، نادر شاہ ان انڈیا، ص ۷۲

کے علاقوں میں جاکر سامان رسد لوٹ کرلاتے تھے۔ اس لئے دیہاتی موقع کے منتظر رہتے اور ان سے گھوڑے اور سامان چھین لیتے۔ لاہور پہنچنے تک ایک ہزار سے زائد باربردار مویشی سامان سمیت غائب ہوچکے تھے[1]۔ دیہاتیوں کی لوٹ مار سے برہم ہوکر اس نے حکم دیا کہ وہ جہاں کہیں پائے جائیں، انھیں قتل کردیا جائے۔ اس طرح ایرانیوں نے بے پناہ قتل عام کیا۔ صرف تھانیسر کے علاقے میں ۱۲ ہزار افراد قتل ہوئے[2]۔ میدانی علاقوں میں گرمی کی شدت نے ایرانی سپاہیوں کو بے حال کردیا تھا۔ انھوں نے گرمی سے بچنے کے لیے دامانِ کوہ میں سے سفر کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ نادرشاہ نے سرہند سے شمال کا رخ کیا۔ اور سیالکوٹ کے راستے سے اکھنور کی طرف بڑھے۔ جو دریائے چناب پر واقع ہے۔ واپسی کے راستہ میں اہم وجہ یہ بھی تھی کہ

"چوں در ہنگام آمدن فوج عاشق تاراج قزلباش دیہات و قریہ جات شاہراہِ
لاہور بیاء دمنتوراشدہ بود، بنابرآں بسمت سیالکوٹ، ملتان کہ معمورہ
وآفت نارسیدہ بود، نہضت فرمود[3]"

لاہور اور سرہند کا درمیانی علاقہ ویران ہوچکا تھا۔ اب وہاں کے جانوروں کے لئے کسی قسم کے چارے اور سپاہیوں کے لئے سامان رسد کی توقع نہ تھی۔ لہذا نیا راستہ اختیار کرنے میں مصلحت سمجھی گئی۔

---

[1] (۱)، فریزر، ہسٹری آف نادرشاہ، ص ۲۱۲

(۲)، ہنوے، ریوولیشن آف پرشیا، جلد چہارم، ص ۱۹۹؛ تاہم اس نے لاہور کی بجائے تھانیسر لکھا ہے۔

[2] (۱)، فریزر، ہسٹری آف نادرشاہ، ص ۲۲۲

(۲)، لاک ہارٹ، نادرشاہ، ص ۱۵۵ (۳)، سرکار، ص ۷۳

[3] (۱)، عبدالکریم کشمیری، بیانِ واقع، ص ۵۴، لاہور ۱۹۷۰ء

(۲) لطیف، ہسٹری آف دی پنجاب، ص ۲۰۷ لاہور ۱۸۹۱ء

(۳) لاک ہارٹ، نادرشاہ، ص ۱۵۵

نادرشاہ نے دہلی سے روانہ ہونے سے قبل ہی حیات اللہ خان اور عبدالباقی خان کی معیت میں ایک دستہ لاہور روانہ کردیا تھا۔ ان کے ہاتھ زکریا خان کے لیے یہ حکم بھیجا تھا۔ کہ شہر سے ایک کروڑ روپیہ اکٹھا کیا جائے۔ زکریا خان نے عمائدینِ شہر کی مجلس طلب کی اور لاہور کو تباہی سے بچانے کے لیے نادرشاہ کی شرط کا ذکر کیا۔ چنانچہ ایک کروڑ روپیہ اکٹھا کیا گیا۔ زکریا خان خود ذاتی طور پر نادرشاہ کو یہ رقم پیش کرنے کے لیے حاضر ہوا۔ اور لاہور سے شمال مغرب ایک مقام پر اُس سے ملاقات کی اور چناب عبور کرنے تک اس کے ساتھ رہا[1]۔

نادرشاہ ۵ جون کو اکھنور پہنچا تھا۔ اس دوران شدید گرمی سے ایرانی لشکر کے بہت سے سپاہی ہر روز مرتے رہے۔ خواجہ عبدالکریم کشمیری کے الفاظ میں:

"این مردم ہرگز بچنیں ہوائے گرم خوگر نشدہ وعلاوہ آن لباس ولایت سرد

---

[1] (۱)، لاک ہارٹ، نادرشاہ، ص ۱۵۵

(۲)، لطیف، ہسٹری آف دی پنجاب، ص ۲۰۷

(۳)، فریزر کی روایت مختلف ہے۔ اس نے لکھا ہے: نادرشاہ نے دہلی سے کوچ کرنے سے کئی دن پہلے فوج کا ایک حصہ لاہور بھیج دیا تھا۔ زکریا خان نے اطلاع پاتے ہی شہر کے عمائد، سوداگر، صراف اور متمول لوگوں کو بلا کر مشورہ کیا اور قرار پایا۔ کہ شہر سے باہر جاکر ایرانی فوج کے سردار سے صاف کہہ دیں۔ کہ باشندوں کے قتل کا ارادہ ہے۔ تو ہم لوگ حاضر ہیں۔ شہر برباد کرنے کا قصد ہے تو خالی ہے اور وہاں ہمارا مال واسباب بھی ہے۔ اگر روپیہ کی خواہش ہے تو ہمارا صوبہ اور یہاں کی رعایا ایک کروڑ روپیہ سے زیادہ کا انتظام نہیں کرسکتی۔ اب جو ارادہ ہو فرمایئے۔ لاہور ایک چھوٹا سا شہر ہے دہلی کی طرح شاہی عتاب کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ یہ سن کر نادری سردار نے ایک کروڑ روپیہ لینا منظور کیا اور روپیہ وصول کرکے شاہی فوج میں شامل ہوگیا۔ نادرشاہ لاہور چھوڑتا ہوا آگے نکل گیا ——— ہسٹری آف نادرشاہ ص ۱۳-۲۱۲

سپرد بال دیگر ، ازین رہگزر بسیاری از انسان وحیوان اردوی معلی سلطان جان عزیز را
بگرداب حباب می سپردند[1] "

چناب کے کنارے پہنچ کر انہیں کچھ تسکین ہوئی۔ تاہم ایک نئی مصیبت ان کی منتظر تھی۔ شمالی علاقوں میں پہاڑوں پر بھاری بارشوں کی وجہ سے دریاؤں کی سطح میں خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔ پانی کی لہروں میں بہت تندی تھی۔ اکھنور کے مقام پر کشتیوں کا پل بنایا گیا اور اس سے پار اترنے لگے۔ تو یہ پل تند لہروں کا سامنا کر سکا اور نہ غیر معمولی بھاری بوجھ برداشت کر سکا۔ چنانچہ ابھی تھوڑی فوج پار اتری تھی کہ پل بہہ گیا۔ دو ہزار آدمی لقمۂ اجل بن گئے[2]۔ مصنف "بیان واقع" کا بیان ہے کہ

" ساکنان آں نواحی کہ از خوف اذیت اہل عسکر سمیت کوہستان مستغرق شدہ بودند موسط
شب درختہای عظیم را بریدہ بدریا انداختند، چوں آب بہ تندی تمام جریان داشت
وصدمات درختہا معین آں شدہ ، زنجیر جسر دو دفعہ از ہم گسیختہ جمعی کثیر شربت
فنا نوشش جان کردند[3]۔ "

اس پل کو مرمت کرنا یا نیا پل بنانا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ باقی ماندہ فوج کو کشتیوں کے ذریعے پار ہونے کا حکم دیا گیا اور اس مقصد کے لئے تلاش بسیار کے بعد اکھنور سے ۳۰ میل نیچے کی طرف کلووال کا مقام منتخب کیا گیا۔ کشتیوں کے ذریعے پار اترنے کا عمل خاصا طویل تھا۔ ۱۴ جولائی تک یہ مرحلہ طے ہوا۔ نادر شاہ نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ دہلی کی لوٹ مار میں اس کے آدمیوں نے کافی کچھ حاصل کیا ہے، دریا عبور کرنے سے پہلے حکم دیا کہ ہر شخص مال غنیمت کے ایک حصہ کے علاوہ باقی سب کچھ اس کے حوالے کر دے۔

---

[1] عبدالکریم، بیان واقع ، ص ۴۵
[2] (۱) فریزر ، ہسٹری آف نادر شاہ
(۲) لاک ہارٹ ، نادر شاہ ، ص ۱۵۶
[3] عبدالکریم ، بیان واقع ، ص ۴۶

بہت سوں نے حکم کی تعمیل کی۔ انھیں انعامات دیئے گئے۔ نادر شاہ کو علم تھا کہ کافی لوگوں نے اس کے حکم کا احترام نہیں کیا۔ چنانچہ اس نے گھاٹ پر اپنے متعین مقرر کر دیئے۔ جو آدمیوں کی تلاشی لیتے۔ کچھ لوگوں نے اپنے قیمتی اثاثے دفن کر دیئے۔ اس امید میں کہ بعد میں واپس آکر انھیں حاصل کر سکیں گے۔ لیکن اس سلسلے میں انھیں مایوسی ہوئی۔ بہت سے اس بات پر برہم ہوئے۔ حتیٰ کہ انھوں نے اپنے جواہرات اور دیگر مال غنیمت دریا برد کر دیا[1]۔

دریائے چناب پار کرنے کے بعد اس نے زکریا خان کو رخصت ہونے کی اجازت دی۔ اُس نے منہ مانگا انعام مانگنے کو کہا۔ خان نے درخواست کی کہ ان ہندوستانیوں کو رہا کر دیا جائے۔ جو نادر شاہ کے پاس گرفتار ہیں اور جنھیں بیگار میں ایران لے جایا جا رہا ہے[2]۔ چنانچہ ان کو رہا کر کے زکریا خان کے حوالے کر دیا گیا۔ کہ وہ ان کی گھر واپسی کا انتظام کرے۔

ان دنوں پنجاب میں موسم برسات جوبن پر تھا۔ بھاری بارشوں میں ایرانی فوج نے چناب سے جہلم تک کا سفر طے کیا۔ دریائے جہلم کشتیوں کے پل کے ذریعے عبور کیا گیا۔ یہاں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ خواجہ عبدالکریم نے لکھا ہے کہ

" شتری کہ تمام بارش ظروف طلا بود ، در وسط جسر دریائے مذکور در آب غرق شد۔
ہر چند تجسس نمودند۔ فائدہ نہ بخشید۔ ع۔ مال این بی حاصلاں اکثر بدریا می رود[3]۔ "

جہلم سے پار اترنے کے بعد تیزی سے راولپنڈی کے راستے حسن ابدال کا رخ کیا۔ اور وہاں سے ۲ دسمبر کو کابل پہنچ گیا۔ اس طرح ہندوستانی علاقے میں ایک سال تک آگ اور خون کا کھیل کھیلنے

---

[1] عبدالکریم ، بیان واقع ، ص ۴۷
[2] (۱) شاہنواز خان ، مآثر الامراء جلد دوم (اردو ترجمہ محمد ایوب قادری) ص ۴-۱۰۳ ، لاہور ۱۹۶۹ء
(۲) سرکار ، فال آف دی مغل ایمپائر (جلد اول) ، ص ۱۸۴ ، کلکتہ ۱۹۳۲ء
[3] بیان واقع ، ص ۴۸۔

کے بعد نادرشاہ اپنے وطن واپس پہنچ گیا۔

نادرشاہ کے حملے نے ہندوستانی سیاست کو درہم برہم کر کے رکھ دیا۔ جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اپنے ایک مکتوب بنام احمد شاہ ابدالی میں نادرشاہ کے حملۂ ہند کے اثرات پر جامع تبصرہ کیا ہے۔

"مسلمانان را زیر و زبر ساخت و حرمتِ و جاہت را سالم و غانم گذاشتہ رفت، ازاں باز دوست کفار قوت یافت و جنودِ اسلام از ہم پاشید و سلطنت دہلی بمنزلۂ لعبِ صلبیان گشت۔ معاذ اللہ [1] "

نادرشاہ کے حملے نے مغلیہ سلطنت کا سارا ڈھانچہ بے جان کر دیا تھا [2]۔ مرکز سے علیحدہ صوبوں میں خود مختاریاں قائم ہو گئیں تھیں [3]۔ سعادت علی خان نے اودھ میں، علی وردی خان نے بنگال میں۔ نظام الملک نے دکن میں آزاد حکومتوں کی بنا ڈال دی تھی۔ پنجاب میں سکھوں کی طاقت بڑھنے لگی۔ مغربی اور جنوبی طاقتوں میں مرہٹوں نے تسلط قائم کر لیا تھا اور بہار، اڑلیسہ اور بنگال کو تاخت و تاراج کر رہے تھے۔ دہلی میں ایرانی تورانی تنازع پورے عروج پر تھا۔ امرا آپس کے عناد اور دوسرے فریق کو شکست دینے کی خاطر مرہٹوں سے امداد لیتے تھے اور اس طرح مرہٹوں کا اقتدار دہلی کے ارد گرد کے علاقہ میں بھی بڑھ رہا تھا [4]۔

پنجاب کی حد تک یہ حملہ اس حد تک تباہ کن ثابت ہوا کہ اس کے بعد پنجاب کو کبھی سکون اور امن و امان نصیب نہ ہو سکا۔ انتظامی ڈھانچہ ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ صوبے کی معیشت، تجارت اور دیگر شعبے ٹھپ ہو کر رہ گئے، خزانہ بالکل خالی ہو گیا۔ ۱۷۳۹ء سے قبل سیاسی اور معاشی انتشار کا عمل بڑی حد تک اندرونی نوعیت

---

[1] خلیق احمد نظامی، شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات، ص ۵۲، علی گڑھ ۱۹۵۰ء

[2] اس صورت حال کے عینی شاہد وارث شاہ نے اس دور کی ذہنی کیفیت کو ایک مصرعے میں سمو دیا۔ ع

نادرشاہ توں ہند پنجاب دھڑکے میرے یا بدا تدھو بھونچال کیتو (ڈاکٹر محمد اسلم، سرمایہ عمر، ص ۹۹)

[3] جے۔ ٹی وہیلر، ارلی ریکارڈز آف برٹش انڈیا، ص ۱۳۵، ۲۰۵، لندن ۱۸۷۳ء (دوسرا ایڈیشن)

[4] خلیق احمد نظامی، شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات، ص ۱۶ (دیباچہ)

کا اور نسبتاً سست تھا۔ نادرشاہ کے حملے کے بعد اس کی رفتار اچانک تیز ہو گئی [1]۔

لطیف نے لکھا ہے کہ نادرشاہ کے حملے تک لاہور میں ہر طرح امن و امان رہا اور لاہور سکھوں کے دست تظلم سے بچا رہا۔ مرکز سے تعلقات کی نوعیت اب یہ رہ گئی تھی اور ادھر محمد شاہ دہلی میں چین اڑاتے تھے ادھر نواب خان بہادر بادشاہ سے نڈر اور سلطنت کے دباؤ سے بے خطر اس خطہ کو موروثی مال سمجھ کر جو یہاں چاہتے تھے سو کرتے تھے۔ مرہٹوں اور شاہی سپاہ کے معرکہ کا حال سن لیتے تھے۔ کبھی بھولے سے کوئی شاہی مراسلہ آیا تو اس کی تعمیل چاہا تو کی نہ چاہا تو نہ کی [2]۔

نادرشاہ کا حملہ ہند اپنی جگہ حرف آخر نہ تھا۔ بلکہ اس کے سیاسی جانشین احمد شاہ ابدالی کے لیے یہ ایک مستقل جولان گاہ ثابت ہوا اور اس طرح نادرشاہ کی قائم کردہ روایت اگلی ربع صدی پوری شدت سے جاری رہی۔ پنجاب سرحدی صوبہ اور دہلی کی راہ پر واقع ہونے کی وجہ سے ہر بار نشانہ ستم بنتا، اور ویرانی تباہی اور تخریب کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پنجاب پورے ہندوستان میں زرخیز ترین اور خوشحال ترین صوبہ شمار ہوتا تھا۔ اب اس کے کھیتوں میں راکھ اور تجوریوں میں خاک اڑنے لگی۔ زکریا خان کا خزانہ اتنا کافی نہ تھا کہ نادرشاہ کا عاید کردہ تاوان ادا کر سکتا۔ چنانچہ متمول شہریوں سے رقم اکٹھی کی گئی۔ احوال آدینہ بیگ خان کا مصنف لکھتا ہے کہ " در ادای تاوان تمام شہر تباہ شد [3] "

نادرشاہ کے حملے نے پنجاب میں باغی اور لاقانون عناصر اور انتشار پسند قوتوں کے لیے سازگار فضا فراہم کر دی۔ اس فضا سے سب سے زیادہ فائدہ سکھوں نے اٹھایا۔ زکریا خان کے مضبوط انتظامی ہاتھوں نے انھیں بڑی خوبی سے روک رکھا تھا۔ زکریا خان کے اقتدار اعلیٰ کو پاش پاش ہوتے دیکھ کر سکھوں نے ہاتھ پاؤں نکالنے اور نادرشاہ کے حملے کے دوران ہی اپنی کارروائیوں کا آغاز کر دیا حتیٰ کہ خود نادرشاہ بھی ان کی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکا۔

---

[1] رفیق احمد، پالیٹکس اینڈ اکنامک آف دی پنجاب، جرنل آف ریسرچ، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ص ۹۰، شمارہ جنوری ۱۹۶۲ء

[2] لطیف، تاریخ پنجاب (اردو)، ص ۵۶، لاہور ۱۸۸۹ء

[3] ورق ۵۰ ب، روٹوگراف پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور

باب ۵

سکھ (۲) منظم جدوجہد کا آغاز

۱۷۳۹ء ــــــ ۱۷۴۵ء

نادر شاہ کے حملے نے زکریا خان کے مضبوط انتظامی ڈھانچے کے تار و پود بکھیر دیئے تھے۔ پنجاب میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک افراتفری، لاقانونیت اور طوائف الملوکی کا دور دورہ ہوگیا۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ جو قوتیں زکریا خان کی طاقت اور دہشت سے مرعوب تھیں۔ ان پر حکومت پنجاب کا کھوکھلا پن ظاہر ہوگیا۔ اس صورت حال نے سکھوں کے لیے سنہری موقع فراہم کیا۔ ایک نسل تک خاموش رہنے کے بعد اب انھوں نے پوری شدت سے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

نادر شاہ اور سکھ

نادر شاہ کے حملے کی دہشت سے پنجاب کے بے شمار پر امن شہری پہاڑیوں کی طرف پناہ گزین ہوگئے تھے۔ سکھوں نے ان پر حملے کئے اور ان کے رہے سہے اثاثے لوٹ لئے۔ اس طرح راتوں رات بے شمار سکھ صاحب ثروت ہوگئے۔ اس کامیاب لوٹ مار اور غارتگری سے شہ پاکر انھوں نے پہاڑیوں سے اتر کر پنجاب کے شمال مشرقی میدانی علاقوں پر دھاوا بول دیا۔ اور ہر جگہ آہن و آتش کا کھیل رچایا۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ڈلیوال[1] کے مقام پر مٹی کا ایک چھوٹا سا قلعہ بنالیا۔ اور اسے اپنی سرگرمیوں کا محور قرار دیا۔ یہ

[1] ڈلیوال: دریائے راوی کے کنارے امرتسر سے شمال مغرب کی طرف ایک گھنے جنگل کے درمیان واقع تھا۔ بقیہ ص۷۹

قلعہ مال غنیمت کے سٹور کے علاوہ پسپائی اور پناہ کے لیے بھی مناسب مقام تھا۔ یہاں سے انھوں نے اپنی غارت گری کا سلسلہ جاری رکھا۔ منظم انداز میں شاہراہوں پر ڈاکہ زنی کی جاتی[1]۔ سکھوں نے اب منظم فوجی حیثیت اختیار کرلی تھی۔

Their association increased in number and strength and their ravages were not now in the open country but extended to the neighbourhood of Lahore.[2]

اس زمانے کے ممتاز سکھ سرداروں میں کپور سنگھ، باغ سنگھ اور جسا سنگھ اہلووالیہ نمایاں تھے۔ سوہن لال سوری لکھتا ہے کہ

> "باری دوآب کے علاقے میں باغ سنگھ اہلووالیہ کی زیر قیادت اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے ذرائع مواصلات منقطع کردیئے، بے شمار دیہاتوں اور قصبوں پر حملے کرکے لوٹ مار کی اور نواحی زمینداروں سے بھاری تعداد میں رقومات وصول کیں۔ جسا سنگھ اس کا بھانجا اس کا نائب تھا۔ اس زمانے میں ایسا دکھائی دیتا تھا۔ کہ پورے دوآب کا نظم و نسق سکھوں کے ہاتھ میں ہے۔"[3]

بقیہ حاشیہ ص۷۸، دگپتا، ہسٹری آف دی سکھز، صفحہ ۳)

[1] (۱)، مالکم، سکیچ آف دی سکھز، ص ۸۹، لندن ۱۸۱۲ء

(۲)، لطیف، ہسٹری آف دی پنجاب، ص ۲۱۲

(۳) این کے سنہا، رائز آف دی سکھ پاور، ص ۱۱

(۴)، گپتا، ہسٹری آف دی سکھز، ص ۳۰۲

[2] لطیف، ہسٹری آف دی پنجاب، ص ۲۱۲

[3] عمدۃ التواریخ، جلد اول، ص ۱۰۹

زکریا خان کی سخت گیرانہ پالیسی کی وجہ سے جو لوگ سکھ مت چھوڑ گئے تھے۔ ان میں سے بیشتر دوبارہ سا منحرف ہو گئے۔ ان کے علاوہ دیگر مہم باز اور لوٹ مار کے رسیا عناصر بھی تیزی سے سکھوں کی صفوں میں داخل ہونے لگے۔ سکھوں کی کارروائیوں کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ نادر شاہ دہلی کی طرف جاتے ہوئے پنجاب کی صوبائی فوج کا بڑا حصہ اپنے ہمراہ لے گیا تھا۔ اب سکھوں نے اپنے مذہبی مقام امرت سر کی زیارت کے لئے کھلے بندوں جانا شروع کر دیا۔ سکھوں کی یہ لوٹ مار اور غارت گری ابتدا میں محدود پیمانے پر تھی۔ تاہم روز بروز ان کی جرأت مندی اور بے خوفی میں اضافہ ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ نادر شاہ بھی۔ جس نے ہندوستان میں دہشت پھیلا رکھی تھی۔۔۔ ان کی زد سے محفوظ نہ رہ سکا۔ جارج فورسٹر لکھتا ہے

> **It is mentioned that the Sicque forces appeard in arms at the period of Nadir Shah's return from Delhi, when the Persian army, incumbered with spoil, and regardless of order, was attacked in the rear by detached predatory parties of Sicque Cavalry, who occassionally fell upon the baggage-guards and acquired a large plunder.**[1]

جونہی نادر شاہ دہلی سے روانہ ہوا سکھ مخبروں نے خبر پائی۔ یہ اطلاع ملنے پر سکھ سرداروں نے ایک ہلکا رسالہ مرتب کیا اور اسے نادر شاہ کی فوج پر چھاپہ مار حملوں کے لئے متعین کیا۔ نادر شاہ لاہور کے قریب پہنچا۔ تو اسے ان نقصانات کی اطلاع دی گئی۔ اسے اس پر زبردست طیش آیا۔ تاہم اب کیا ہو سکتا تھا۔ نادر شاہ کے چلے جانے کے بعد بھی انھوں نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔

زکریا خان نے نادر شاہ کے واپس جاتے ہی تنظیم نو کا کام شروع کر دیا۔ سکھوں کے ہاتھوں تباہ شدہ

۱؎ (۱) جرنی فرام بنگال ٹو انگلینڈ ۱، ص ۳۱۳، لندن ۱۸۰۸ء

(۲) مالکم، سکیچ آف دی سکھز، ص ۸۶

(۳) کننگھم، ہسٹری آف دی سکھز، ص ۸۳

قصبوں اور دیہاتوں کی آباد کاری کا انتظام کیا گیا اور کسانوں کو زراعت میں مدد دینے کے لئے تقاوی قرضے دئے گئے۔[1] زکریا خاں نے سنجیدگی سے محسوس کر لیا تھا کہ سکھ امن وامان کے سب سے بڑے دشمن اور ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ چنانچہ ایک بار پھر ہلکے رسالے کے متحرک دستے منظم کئے گئے اور انہیں سکھوں کے تعاقب میں بھیجا۔ ڈلیوال کا قلعہ نیست و نابود کر دیا گیا۔ بہت سے سکھ مارے گئے۔ متعدد گرفتار کر کے لاہور لائے گئے۔ اور یہاں ان کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

فوجی کارروائیوں کے ساتھ ساتھ حکومت نے سول مشینری کو بھی مصروف کار رکھا۔ مقامی حکام اور دیہاتوں کے چودھریوں کو حکم دیا گیا کہ اپنی عملداری میں کسی سکھ کو پناہ نہ دیں۔ ان احکامات کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزا دی جاتی تھی۔ دیہاتوں، قصبوں، میدانوں اور جنگلوں میں جاسوس اور مخبر اطلاعات بھیجنے میں مشغول رہتے تھے۔[2]

زکریا خان کے اقدامات کے نتیجے میں سکھ باری دوآب سے نکل گئے اور انھوں نے جالندھر دوآب کا رخ کیا۔[3] اس علاقے میں جاٹوں کی اکثریت تھی جو سکھوں کے بارے میں ہمدردانہ رویہ رکھتے تھے۔ چنانچہ خان نے آدینہ بیگ نامی ایک مستعد اور قابل شخص کو جالندھر دوآب کا فوجدار مقرر کیا اور اسے سکھوں کے خلاف کارروائی کرنے کا حکم دیا۔ آدینہ بیگ دوآب میں سکھوں کی لاقانونیت کو ختم کرنے اور امن وامان بحال کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ تاہم اس نے ان کے خلاف سخت اقدامات اختیار نہ کئے۔ بلکہ ان کی کچھ سرگرمیوں کو نظر انداز کیا۔ اور اس حد تک ڈھیل دی۔ کہ وہ اس کی عملداری میں سنگین گڑبڑ پیدا نہ کر سکیں۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ وہ سکھوں کی ہمدردیاں حاصل کر کے اپنی پوزیشن مستحکم رکھنا چاہتا تھا۔

۱؎ لطیف، ہسٹری آف دی پنجاب، ص ۱۹۳

۲؎ گپتا، ہسٹری آف دی سکھز، ص ۸۷

۳؎ " از ظہور این معنی خلل تمام در اطراف وجوانب صورت بروز گرفت و از نوشتن نویسان دو آبہ تمام کیفیت من وعن بجواب مطبور واضح ولائح گشت۔" (سوہن لال، عمدة التواریخ، جلد اول ص ۱۰۹)

گپتا نے بخت مل (خالصہ نامہ) کے حوالے سے لکھا ہے۔ کہ آدینہ بیگ ایک حریص انسان تھا۔ اس نے سکھوں کو کچلنے کی کوشش نہ کی۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہتا تو اس کے لئے مشکل نہ تھا۔ لیکن اس کے ذہن میں یہ بات آگئی تھی۔ کہ اگر اُس نے سکھوں کو کچل دیا۔ تو ممکن ہے اسے برطرف کر دیا جائے اور کسی ایسے فوجدار کا تقرر کر دیا جائے جو زیادہ محاصل وصول کر سکے۔ چنانچہ اس نے سکھوں سے اچھا سلوک کیا، ان کے ساتھ معاہدہ طے کر لیا۔ اس سے سکھوں کو تقویت ہوئی، اور انھوں نے بہت سے گاؤں جاگیر کے طور پر حاصل کر لئے۔[1]

یہ صورت حال زکریا خاں کے لئے قابل قبول نہ ہو سکتی تھی۔ اس نے آدینہ بیگ کو سخت احکامات بھیجے کہ سکھوں کو صوبے سے نکال باہر کیا جائے۔ اب اس کے لئے ممکن نہ رہا تھا۔ کہ اس کام کو زیادہ عرصے کے لئے ملتوی کر سکتا۔ چنانچہ اس نے سکھوں سے کہا کہ وہ یہ علاقہ خالی کر کے چلے جائیں۔ سکھوں نے جسا سنگھ ٹھوکا (بعد ازاں رام گڑھیہ) کو آدینہ بیگ سے بات چیت کے لئے بھیجا۔

جسا سنگھ نے، آدینہ بیگ کی سیاسی چالوں کے ہاتھوں مات کھا کر اس کی ملازمت قبول کر لی۔ سکھ اپنے نمایندے کی کارگزاری سے مایوس ہوئے اور انھوں نے بہتر سمجھا کہ ستلج پار کر جائیں۔ اب سکھ سرہند سرکار میں داخل ہو گئے۔ وہاں انھوں نے غارت گری کی کاروائیاں جاری رکھیں اور زبردست گڑبڑ پیدا کی۔ دہلی سے عظیم اللہ خان کے تحت ایک فوج بھیجی گئی جس نے انھیں منتشر کر دیا۔[2]

سکھوں پر ہر طرف سے زبردست دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے بچاؤ کے لئے اِدھر اُدھر بھاگنا شروع کر دیا۔ حکومت پنجاب نے سکھوں کو منظم انداز میں کچلنے کے لئے انعامات کا اعلان کیا۔ کسی سکھ کی خبر رسانی پر دس روپے دئے جاتے۔ زندہ گرفتار کرنے یا ہلاک کرنے پر پچاس روپے دئے جاتے۔ دوسری طرف سکھوں کو پناہ دینے والوں یا ان کی خبر نہ کرنے والوں کو بھی اسی قسم کی سزائیں دینے کا اعلان کیا گیا۔ فی الحقیقت پوری سرکاری مشینری متحرک تھی، چودھری، مقدم، روسا اور زمیندار تمام بہ جبر و رضا حکومت

---

[1] گپتا، سٹڈیز، ص ۶۰-۶۱ (۲) جیمز براؤن، انڈیا ٹریکٹس II، ص ۱۴

[2] سرکار، فال آف دی مغل ایمپائر، جلد اول، ص ۲۲۲-۲۲۳

کا ساتھ دے رہے تھے۔ روز بروز سکھوں کے مصائب میں اضافہ اور ان کی تعداد میں کمی ہونے لگی۔ اب پنجاب کے میدانوں میں ان کے لئے کوئی جگہ نہ تھی اور وہ اپنی مشہور کمین گاہوں — جموں اور کانگڑہ کے پہاڑی سلسلوں، بیکانیر اور مالوہ کے صحراؤں اور لکھی جنگلوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔[1]

سکھوں کو نکال دینے کے بعد زکریا خاں نے دیگر انتظامی امور کی طرف توجہ دی۔ وقت کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ سکھوں نے نیچے اترنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ اپنے مقدس مقام امرتسر کی زیارت کے لئے وہ اکثر آنے لگے۔ ناظم پنجاب نے اس بار پرانی حکمت عملی کا احیا مناسب نہ سمجھا۔ اس پر واضح ہو چکا تھا۔ کہ سخت گیری اس مسئلے کا عارضی حل ہے۔ چنانچہ اب کے اُس نے سکھوں کو ان کے حال پر رہنے دیا۔ چنانچہ کسی تصادم کی نوبت نہ آئی۔ زکریا خان کی خواہش تھی کہ سکھ پرامن کسانوں کی طرح آباد ہو جائیں۔ اپریل اور اکتوبر میں سکھ بھاری تعداد میں امرت سر میں جمع ہونے لگے۔ گپتا نے خوشونت لال کے حوالے سے لکھا ہے۔ کہ دیوان لکھپت رائے اور دیگر سرداروں کو بیساکھی اور دیوالی کے دنوں میں ایک معقول فوج کے ہمراہ امرتسر متعین کیا گیا۔ انھیں ہدایت تھی کہ سکھوں کے ساتھ جنگ نہ کریں۔ تاہم اگر سکھ پہل کریں تو صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہیں۔[2]

یکم جولائی ۱۷۴۵ء کو زکریا خان کا انتقال ہو گیا۔ طویل بحث و تمحیص اور حیل و حجت کے بعد یحییٰ خان کو ۱۷ جنوری ۱۷۴۶ء کو نائب ناظم مقرر کر دیا گیا۔ پنجاب کی سیاسی اہمیت اس امر کی متقاضی تھی۔ کہ یہاں ایک مضبوط، مستقل ناظم مقرر کیا جاتا۔ یحییٰ خاں ویسے بھی ایک کمزور شخصیت کا مالک تھا۔ اس کے چھوٹے بھائی شہنواز خان نے حصول اقتدار کے لئے جو سرگرمیاں شروع کیں۔ ان کی وجہ سے زکریا خاں کا انتظامی شیرازہ بڑی تیزی سے منتشر ہونا شروع ہو گیا۔

سکھ پہلے ہی پنجاب میں آنا شروع ہو گئے تھے۔ زکریا خان کے منظر عام سے ہٹتے ہی انہوں نے

---

[1] گپتا، ہسٹری آف دی سکھز، ص ۸-۹

[2] پرنسپ، اوریجن آف دی سکھ پاور، ص ۳، کلکتہ ۱۸۳۴ء

لوٹ مار اور غارت گری شروع کر دی ۔ پرنسپ لکھتا ہے کہ دس دس بیس بیس کے جتھوں میں مسلح سکھوں نے شاہراہوں اور دیہاتوں قصبوں پر حملے شروع کر دیئے

The early neglect of the ruling authority enabled the associations to prosper, and the most successful chiefs purchased horses wih the proceeds of their spoil and mounted and armed their followers. [1]

ہری رام گپتا کا خیال ہے کہ سکھوں نے اس وقت خود کو چھوٹے چھوٹے دستوں میں منظم کرنے کی ضرورت محسوس کی ۔ زکریا خاں کی وفات کے بعد پڑنے والی پہلی دیوالی (۱۴ اکتوبر ۱۷۴۵ء) کے موقع پر جب وہ امرتسر میں جمع ہوئے تو انھوں نے خود کو پچیس دستوں میں منقسم کیا ۔ ہر دستے میں ایک سو افراد شامل کئے گئے ۔ مندرجہ ذیل سکھ سرداران دستوں کے رہنما قرار پائے ۔

۱ ۔ شیام سنگھ (ناروکی ، ضلع سیالکوٹ) ۲ ۔ گوربخش سنگھ (کالسیہ) ۳ ۔ کروڑا سنگھ (پیچ گڑھ) ۴ ۔ کرم سنگھ (پیچ گڑھ) ۵ ۔ گوردیال سنگھ (ڈلیوال) ۶ ۔ نودھ سنگھ (سکوچک) ۷ ۔ چندا سنگھ (سکوچک) ۸ ۔ کالا سنگھ (کنگ) ۹ ۔ خیالا سنگھ (کنگ) ۱۰ ۔ دھرم سنگھ کھتری ۱۱ ۔ باغ سنگھ ۱۲ ۔ جسا سنگھ ۱۳ ۔ ہری سنگھ ۱۴ ۔ چھجا سنگھ (پنجواڑ) ۱۵ ۔ دیپ سنگھ شہید ۱۶ ۔ بھوما سنگھ ۱۷ ۔ نواب کپور سنگھ (فیض اللہ پور) ۱۸ ۔ اجے سنگھ ۱۹ ۔ سدا سنگھ ۲۰ ۔ ہیرا سنگھ (نکئی) ۲۱ ۔ آگر سنگھ ۲۲ ۔ سکھا سنگھ ۲۳ ۔ مدن سنگھ ۲۴ ۔ بیر سنگھ مذہبی ۲۵ ۔ کرم سنگھ (امرتسر) [2]

کسی بھی سرکاری حملے کا دفاع اور لوٹ مار کی کارروائیوں میں وسعت اور تنظیم کے لئے اس اہتمام کو ناگزیر تصور کیا گیا ۔ بعد میں جا کر انہیں میں سے وہ نسل تشکیل ہوئی جس نے حقیقی مقصد پنجاب پر قبضہ میں کامیابی حاصل کی ۔

---

[1] ریجن آف دی سکھ پاور ، ص ۳ ، کلکتہ ۱۸۳۴ء

[2] گپتا ، ہسٹری آف دی سکھز ، ص ۲۱

سب سے پہلے ان افراد سے نمٹنے کا پروگرام بنایا گیا جنہوں نے ان کے خلاف کارروائیوں میں حکومت وقت کا ساتھ دیا تھا ۔ چنانچہ نوشہرہ ، جیٹھ ماور دیگر دیہاتوں پر حملے کئے گئے ۔ صاحب رائے ، اور رام رندھاوا کرم چھنا ، ہر بھگت نرنجیا ، قاضی فضل احمد خان ، کھوکھر شمشیر خان اور دیگر متعدد چودھری اور مقدم ان کے انتقام کا نشانہ بنے ۔ [1] کے ساتھ ہی انھوں نے بٹالہ ، جالندھر ، تلوان ، بجواڑہ ، ڈھمک ، منجکی اور پھگواڑہ کے قصبات کو غارت کیا ۔

مورخ گیانی گیان سنگھ نے لکھا ہے کہ جنوری ۱۷۴۶ء میں پانچ ہزار کے قریب سکھوں کا ایک دستہ خود کو مغل سپاہی ظاہر کر کے ایک شام موچی دروازہ کے راستے سے لاہور شہر میں داخل ہو گیا ۔ سردی کی وجہ سے لوگ جلدی ہی گھروں میں بیٹھ رہے تھے ۔ سڑکیں اور گلیاں ویران تھیں ۔ مدھم روشنی میں مداخلت کاروں کی صحیح پہچان ممکن نہ تھی ۔ انھوں نے کئی دکانداروں کو تہ تیغ کیا ۔ اور لوٹ مار کا مال گھوڑوں پر سا تھ لے گئے [1] سکھ دستہ لوٹ مار کرنے کے بعد راوی کے کنارے گھنے جنگل میں ٹھہرے ہوئے اپنے باقی ساتھیوں سے جا ملا ۔

یحییٰ خاں ناظم پنجاب نے موچی دروازے کے اس واقعے کی خبر سنتے ہی اپنے دیوان لکھپت رائے کو حکم دیا کہ سکھوں کے خلاف فوری اقدام کیا جائے ۔ دیوان نے ایک مضبوط رسالہ بھیجا جس نے سکھوں کو آس پاس کے علاقے سے نکال باہر کیا ۔ سکھ ایمن آباد کی طرف چلے گئے ۔

جسپت رائے کا قتل

لکھپت رائے کا بھائی جسپت رائے ایمن آباد کا فوجدار تھا ۔ مالیہ کی وصولی کے سلسلے میں ان دنوں وہ یہاں سے دس کوس کے فاصلے پر موضع کھوکھراں میں مقیم تھا ۔ اسی اثنا میں گوندلانوالہ کے دیہاتی اس کے پاس شکایت لے کر آئے کہ دو ہزار سکھ گھڑ سواروں نے ان کے گاؤں پر حملہ کیا ۔

---

[1] راج خالصہ ، ص ۶۶۱ ۔ ۶۶۲ مطبوعہ ۱۸۷۶ء ۔ گپتا نے پانچ ہزار کی تعداد کو مبالغہ آمیز قرار دیا ہے ۔ ہسٹری آف دی سکھز ، ص ۲۴

اور تمام بھیڑ بکریاں ہانک کر لے گئے ہیں۔ اور نواحی گاؤں روڑی بابا نانک میں جا کر ان کا جھٹکا کر کے انھیں کھا رہے ہیں۔

جسپت رائے نے یہ سن کر سکھوں کو یہ پیغام بھیجا۔ کہ وہ مویشی فوراً لوٹا دیں۔ ورنہ اچھے نتائج نہ نکلیں گے۔ سکھوں نے جواب دیا۔ کہ ہم دو تین روز سے بھوکے تھے۔ اگلی صبح یہاں سے چلے جائیں گے۔ فوجدار نے دوبارہ پیغام بھیجا۔ کہ تمھارا ایک لمحہ کے لئے ٹھہرنا منظور نہیں ہے۔ تم لوگ اسی وقت چلے جاؤ۔ سکھوں نے پھر جواب دیا کہ ہم آج نہیں جا سکتے۔ کل چلے جائیں گے۔

جسپت رائے کو زبردست غصہ آیا، ہاتھی پر سوار ہوا جتنی سپاہ موجود تھی۔ اسے ہمراہ لے کر سکھوں پر جا پڑا۔ اور زنبورکوں سے ان پر گولہ باری شروع کر دی۔ وہ اکل و شرب میں مشغول تھے۔ اچانک مسلح ہو کر مقابلے پر اتر آئے۔ زوردار معرکہ شروع ہو گیا۔ ایک سکھ کمال بہادری سے جسپت رائے کے ہاتھی پر چڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور ہودج میں داخل ہو کر اس کا سر قلم کر دیا۔ اس واقعہ سے سرکاری فوج میں افراتفری پھیل گئی۔ کچھ بھاگ گئے متعدد تہ تیغ ہو گئے۔ میدان پوری طرح سکھوں کے ہاتھ رہا۔ تاہم انھیں صورت حال کی نزاکت کا احساس تھا۔ اس لئے فوراً پہاڑی علاقوں کی طرف چلے گئے۔ جسپت رائے کا سر انھوں نے واپس کر دیا۔ تاہم اس کے عوض پانچ روپے وصول کئے[1] یہ واقعہ مارچ ۱۷۴۶ء میں پیش آیا۔

لکھپت رائے کا جوابی اقدام

اپنے بھائی کی موت کی خبر سن کر لکھپت رائے کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے اپنے بھائی کے انتقام میں سکھ مت کو تباہ کرنے کا حلف اٹھایا۔ اُس نے کہا کہ اس مذہب کی بنیاد ایک کھتری نے

---

[1] (۱) علی الدین، عبرت نامہ، ص ۱۹۹ (۲) گپتا، ہسٹری آف دی سکھز، ص ۲۵-۲۶

(۳) گوکل چند نارنگ، ٹرانسفارمیشن آف دی سکھزم، ص ۱۳۳-۱۳۴

رکھی تھی۔ اب اس کا خاتمہ بھی ایک کھتری کے ہاتھوں ہوگا۔ چنانچہ لاہور اور اُس کے نواحی علاقوں کے سکھوں کو فوری طور پر پکڑ لیا گیا۔ بہت سے سکھوں نے دریائے راوی کے بالائی حصے میں واقع دلدلی علاقے میں پناہ لے رکھی تھی۔ یحییٰ خان اور لکھپت رائے ذاتی طور پر ان کے تعاقب میں نکلے۔ سکھ جنگل میں سے ہی دریا کے کنارے کنارے صوبے کے شمال مشرقی حصے کی طرف چلے گئے۔ بہت سی جھڑپیں بھی ہوئیں جن میں سکھوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ آخر کار وہ گورداس پور سے دس میل جنوب پرانے بیاس کے کنارے واقع مقام کنہواں کی طرف چلے گئے۔ جہاں ایک گھنا جنگل تھا۔ انھوں نے چھاپہ مار سرگرمیاں جاری رکھیں۔ دن کو چھپے رہتے اور رات کو تعاقب میں مصروف سرکاری فوجوں پر حملے کرتے۔ تاہم ان کی طاقت کمزور ہونا شروع ہو گئی تھی۔ کیونکہ محض لوٹ مار کے لئے شامل ہونے والے افراد الٹے پاؤں واپس چلے گئے تھے۔

لکھپت رائے نے دور دراز اور دشوار گزار علاقوں تک تعاقب جاری رکھا حتیٰ کہ انھیں خفیہ کمین گاہوں سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ اور بٹالہ کے میدانی علاقوں کی طرف دھکیل دیا۔ یہاں انھیں گھیرے میں لے کر یحییٰ خان اور لکھپت رائے نے کامیاب فوجی مہمات کیں۔ چار سو کے لگ بھگ مارے گئے۔ بہت سے اسیر ہوئے۔ کچھ راوی کی نذر ہو گئے۔ اور بہت سوں نے بال کٹوا کر جان بچائی۔ قیدیوں میں سے بھی جنھوں نے بال کٹوا دیئے۔ انھیں چھوڑ دیا گیا۔ فوجی دستے اور گشتی پارٹیاں ان کی تلاش میں مسلسل سرگرداں رہتے۔ جہاں کسی سکھ کو دیکھتے ہلاک کر دیتے۔ لکھپت رائے نے ہر سکھ کے سر کی قیمت پانچ روپے مقرر کی ہوئی تھی۔ جو لوگ بچ گئے۔ وہ بیاس پار کر گئے۔

لکھپت رائے نے ایک فرمان جاری کیا جس کے تحت گرو کا نام لینا جرم قرار پایا۔ اور اس کی تعزیر پیٹ چاک کرنا مقرر تھی[1] گپتا نے خالصہ نامہ رتن چند کے حوالے سے لکھا ہے۔ کہ گڑ کی بھیلی کو گڑ کہنے پر بھی پابندی لگا دی گئی تھی۔ کیونکہ لفظ گڑ سے گرو کی لفظی مشابہت پڑتی تھی۔ چنانچہ اسے روڑی کہنے

---

[1] علی الدین، عبرت نامہ، ص ۱۹۹

کا حکم دیا گیا۔ آج بھی پنجاب میں یہی نام مروج ہے[1]

اس کارروائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ سکھوں کا جوش و خروش مدھم پڑنے لگا۔ اور پنجاب میں ان کی لاقانونیت کا تقریباً خاتمہ ہو گیا۔ اگر سکھوں کے خلاف یہ کارروائی کچھ عرصہ مستقل انداز میں جاری رہتی۔ تو ان کی طاقت کو اتنا ضعف پہنچایا جا سکتا تھا۔ کہ آئندہ پانچ سات سال تک ان میں سر اٹھانے کی قوت نہ رہتی۔ لیکن آٹھ ماہ ہی گزرے تھے۔ کہ پنجاب کی داخلی سیاست میں افراتفری اور انتشار کے آثار رونما ہونے لگے۔ ۲۱ نومبر ۱۷۴۶ء کو شاہنواز خاں اپنے بھائی یحییٰ خان کے خلاف چڑھ دوڑا۔ اگرچہ والد کے ترکہ میں سے ایک معقول رقم لے کر واپس ہو گیا۔ تاہم باغیانہ سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ایبن کے سنہا نے تحریر کیا ہے کہ جب بھی یحییٰ خاں سکھوں کے خلاف دستے بھیجتا۔ شاہنواز خان نہ صرف سکھوں کو پہلے سے مطلع کر دیتا۔ بلکہ اپنے آدمی بھیج کر یحییٰ خان کے سپاہیوں کو ورغلانے کی کوشش کرتا۔ اس طرح اُس نے سکھوں کی کارروائیوں کی حوصلہ افزائی کی[2]

۲۱ مارچ ۱۷۴۷ء کو شاہنواز خان نے اپنے بھائی یحییٰ خاں کو فیصلہ کن معرکہ میں شکست دے کر لاہور پر قبضہ کر لیا۔ یہ سارا عرصہ نہ صرف سکھوں کی بحالیٔ طاقت کے لئے سازگار ثابت ہوا۔ بلکہ ان کی آئندہ ترقی کے امکانات بھی روشن ہو گئے۔ اس خانہ جنگی کے دوران وہ دوبارہ پنجاب کے میدانی علاقے میں اترنا شروع ہو گئے اور امرت سر میں حاضری دینے لگے یحییٰ خان اور لکھپت رائے کی کارروائیوں کے نتیجے میں وہ دور دراز علاقوں میں منتشر ہو چکے تھے۔ رفتہ رفتہ سب کو تازہ صورت حال کی خبر ہو گئی۔ اور انھوں نے نئے عزم اور ارادوں کے ساتھ جمع ہونا شروع کر دیا۔ مقامی حکام کو ان کی نقل و حرکت کی خبر مل گئی۔ امرت سر کے مغل فوجدار نے تالاب کے چاروں کونوں پر مینار بنوا دیئے۔ تاکہ وہاں غسل کے لیے آنے والے سکھوں پر نظر رکھی جا سکے۔ اس جگہ دن رات مسلح افراد متعین رہتے تھے اور انھیں

---

[1] گپتا، ہسٹری آف دی سکھز، ص ۳۱

[2] رائز آف دی سکھ پاور، ص ۱۷

حکم تھا۔ کہ تالاب کی طرف آنے والے ہر سکھ کو گولی مار دیں۔

ان تمام اقدامات کے باوجود سکھوں نے اکٹھے ہو کر غسل کرنا شروع کر دیا۔ سرکاری حکام سے جھڑپ ہو گئی۔ جس کے نتیجے میں حکام کو شکست ہوئی۔ اور وہ لاہور کی طرف بھاگ گئے۔ اب سکھوں کے دستے امرتسر سے نکلے اور باری اور رچنا کے دوآبوں پر ٹوٹ پڑے۔ دل کھول کر لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ سرکاری حکام جو ان کے خلاف سرگرم رہے تھے۔ ان کا خاص نشانہ بنے۔ بھاری مال غنیمت ہاتھ آیا۔ اس کے علاوہ اسلحہ، گھوڑے اور دیگر ضروریات بھی بکثرت فراہم ہو گئیں[1]

شاہنواز خان کے دو اہم سرکاری افسر کوڑا مل اور آدینہ بیگ خان سکھ حلقوں میں نسبتاً احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور خود بھی قدرے آرام و سکون حاصل کرنے کے لئے سکھوں نے اپنی غارت گری کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ادھر ابھی شاہنواز خان کی حکومت مستحکم نہ ہوئی تھی۔ اس کے مشیروں کوڑا مل اور آدینہ بیگ نے اُسے مشورہ دیا۔ کہ سکھوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ اس طرح حکومت کی طرف سے سکھوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ ہوئی۔

اسی سال ۳۰ مارچ کو بیساکھی کے موقع پر سکھ امرت سر میں جمع ہوئے۔ اس موقع پر رسمی اجتماعات کے ساتھ ساتھ خصوصی اجتماعات منعقد کئے گئے۔ جن میں آئندہ کے لیے لائحہ عمل طے کرنے پر غور کیا گیا۔ انھوں نے امرت سر کو جو ان کا مذہبی مرکز تھا۔ اپنا فوجی مرکز بنانے کا بھی فیصلہ کر لیا۔ اگرچہ امرتسر کو دو ناموافق صورتیں درپیش تھیں۔ ایک تو یہ صوبائی دارالحکومت کے نواح میں (لاہور سے تیس ۳۰ میل شمال) واقع تھا۔ دوسرے یہ لاہور اور دہلی کے پاس واقع شاہراہ پر تھا۔ گویا دفاعی نقطۂ نگاہ سے کسی طور پر محفوظ نہیں تھا۔ تاہم اس کے مذہبی تقدس کے پیش نظر یہاں قلعہ تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ انھوں نے جو مصلحت پیش نظر رکھی وہ یہ تھی کہ یہ مانجھہ کے وسط میں واقع تھا۔ جو ان کا اصلی خطہ تھا۔ یہ علاقہ ہر طرف سے گھنے جنگلات سے گھرا ہوا تھا۔ یہاں ہنگامی صورت حال میں مقامی آبادی کا تعاون اور

---

[1] گپتا، ہسٹری آف دی سکھز، ص ۳۳-۳۴

محفوظ پیا پائی دستیاب ہو سکتی تھی، یہاں سے لاہور کی سرگرمیوں اور پالیسیوں کا بھی قریبی جائزہ لیا جا سکتا تھا۔

بیساکھی کا میلہ ختم ہونے کے بعد سکھوں نے تعمیر کا کام شروع کر دیا۔ ہری مندر سے دو[۲] میل کے فاصلے پر ایک اور مقدس تالاب، رام سر کے قریب اس کی بنیادیں رکھی گئیں۔ دو گز چوڑی بنیاد کھودی گئی۔ سکھ خود ہی معمار، ترکھان اور مزدور تھے۔ یہ قلعہ مٹی سے بنایا گیا۔ اس میں پانچ سو افراد کی گنجائش تھی۔ قلعے کے اردگرد ایک گہری اور چوڑی خندق کھودی گئی۔ اس قلعے کو رام راؤنی کا نام دیا گیا[۱]۔

اب سکھوں نے بظاہر پُر امن زندگی شروع کر دی تھی لیکن یہ مدت مختصر ثابت ہوئی (مئی تا نومبر ۱۷۴۷ء) پنجاب کے افق پر ایک تباہ کن طوفان کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ احمد شاہ ابدالی نے اپنے پہلے حملۂ ہند کا آغاز کر دیا تھا۔ اس کی تفصیل بیان کرنے سے پہلے مناسب ہوگا۔ کہ ذکریا خان کی وفات سے لے کر ابدالی کی آمد تک پنجاب کی سیاست پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

---

[۱] ۱۔ گپتا۔ ہسٹری آف دی سکھز، ص ۳۵۔ ۳۶

۲۔ کننگھم، ہسٹری آف دی سکھز، ص ۸۵

باب ۶

داخلی سیاست

ذکریا خان کی وفات سے احمد شاہ ابدالی کی آمد تک

جولائی ۱۷۴۵ء ———— دسمبر ۱۷۴۷ء

یکم جولائی ۱۷۴۵ء ــــ ۱۲ ر جمادی الثانی ۱۱۵۸ھ کو مختصر علالت کے بعد ذکریا خان کا انتقال ہو گیا۔ اس مقبول اور ہر دلعزیز حاکم کی وفات پر لوگوں کو گہرا صدمہ ہوا۔ آنند رام مخلص لکھتا ہے۔

"قیامتی سرتا سر پنجاب بہ تخصیص در شہر لاہور گذشت۔ کہ تا سہ شب در ہیچ خانہ چراغی روشن نگشت، ہرگاہ جنازۂ آں مغفور از حویلی برآمد۔ سوای نوع مغل کہ ہمگی گریبانہا تا داماں چاک زدہ خاک برفرق ریزاں و تپایش بودند۔ ہزاراں ہزار مردم شہر لباس سیاہ پوشیدہ در کمال شور و شغب نالۂ وامصیبتاہ و واحسرتاہ برلب ہمراہ جنازہ راہ می پیمودند۔ و از ہر جانب بارش گل بر جنازہ آں افراط گردید۔ کہ دست آخر گلی بہ منت زری بہم نمیرسید۔ اگرچہ مانند گل شیرازۂ اوراق عمرش زود از ہم گسیخت لیکن تا در قید حیات بود۔ بنا بر جود و سخا و خلق خوشی کہ داشت۔ رنگ تسخیر دل جہانی ریخت"[۱]۔

---

[۱] بدائع وقائع ، ورق ۲۲۹ ب، ۲۳۰ الف۔ مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور

زکریا خاں کی وفات سے تاریخ پنجاب کے ایک اہم باب کا خاتمہ ہو گیا۔ اُس نے لاتعداد فتنوں کو دبا رکھا تھا۔ اس کے اٹھتے ہی انتشار، افراتفری اور بے اطمینانی کا وہ طوفان اُٹھا کہ اگلے سو سال تک پنجاب کو آرام و سکون نصیب نہ ہو سکا۔ زکریا خاں کی شادی وزیر دہلی محمد امین خان کی بیٹی اور قمر الدین خان کی بہن فخر النساء بیگم سے ہوئی تھی۔ اس کے بطن سے زکریا خان کے تین بیٹے تھے یحییٰ خاں، حیات اللہ خاں اور میر باقی، موخر الذکر کا کوئی سیاسی کردار نہیں ہے۔ تاہم دوسرے دونوں بھائیوں میں والد کی جانشینی کے مسئلے پر زوردار مجادلہ ہوا یحییٰ خاں سب سے بڑا تھا۔ وہ ایک کمزور اور زنانہ مزاج کا مالک تھا[1]۔ اس کی شادی وزیر دہلی قمر الدین خاں کی بیٹی بدر النساء بیگم سے ہوئی تھی۔[2]

حیات اللہ خاں تاریخ میں شاہنواز خاں کے نام سے معروف ہے۔ اسے یہ خطاب نادر شاہ نے دیا تھا۔ اُس کے حملۂ ہند کے دوران یہ لاہور سے دہلی تک اُس کے ہمراہ رہا۔ واپسی پر نادر شاہ نے اسے اس حکم کے ساتھ اپنے باپ کے پاس لاہور بھیجا کہ وہ اس کے لیے ایک کروڑ روپیہ تیار رکھے نادر شاہ اُسے بہت پسند کرتا تھا۔ شاید نادر شاہ ہی کی رفاقت کا نتیجہ تھا۔ کہ حیات اللہ خاں انتہائی سخت، ظالم اور بے رحم تھا۔ وزیر قمر الدین کی خواہش تھی۔ کہ پنجاب کی نظامت زکریا خان کے بیٹے اور اپنے داماد یحییٰ خان کے لئے حاصل کرے۔ لیکن بادشاہ اس کے حق میں نہ تھا۔ وہ پنجاب کو تورانی حلقے کی گود میں نہ ڈالنا چاہتا تھا۔ جہاں عبد الصمد خاں اور زکریا خاں کی وجہ سے پہلے ہی ان کی حیثیت مستحکم ہو چکی تھی۔ آنند رام مخلص نے اس بحران کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"اگرچہ فدویت و بندگی سیف الدولہ مبرور مقتضی این معنی بود۔ کہ لاہور و ملتان از انتقال آن مغفور باعز الدولہ بہادر و حیات اللہ خاں بہادر مرحمت می گردید۔
لیکن ازآنجا کہ ع رموز مصلحت ملک خسرواں دانند

[1] سرکار، فال آف دی مغل ایمپائر، جلد اول، ص ۱۹۱
[2] گپتا، لیٹر مغل ہسٹری آف دی پنجاب، ص ۱۱، لاہور ۱۹۴۴ء

بخاطر اقدس گذشت کہ صوبجات را بہ بندہائے دگر مرحمت باید فرمود۔ نواب صاحب وزیر الملک بہادر نظر باین معنی کہ چوں از مدتی شد صوبہ لاہور بہ سیف الدولہ عبد الصمد خاں بہادر مرحوم و سیف الدولہ زکریا خاں بہادر مغفور تعلق داشتہ ازیں مانند بلخ و بخارا وطن مغلیہ گردیدہ وایں ہا عمارات و باغات و مقابر در آں جا دارند۔ و در صورت مقرر شدن بدیگری ویرانی و خرابی آنہا لہذا دریں باب استادگی تمام کردہ جہت تقرر صوبجات بنام اعز الدولہ بہادر و ہزبر جنگ بہادر بعرض اشرف رسانیدند۔ و اکتفا بریں معنی نکردہ مبالغہ را کہ منافی عالم بندگیست از حد گذرانیدند لیکن بنا بر بعض جہات کہ قابل تحریر نیست اصلاً مزاج بریں پلّہ نیامد، از بوالعجبی ہای تقدیر است کہ راجہ ایسر سنگھ پسر راجہ دھراج بعد فوت پدر خود بعطای زمینداری و نظامت اکبر آباد و جاگیراتی کہ پدرش داشت سربلند شود و اعز الدولہ بہادر و ہزبر جنگ بہادر با وصف سر رشتہ بندگی درگاہ آسمان جاہ و نسبت ہمشیرہ زادگی نواب صاحب مجدۃ الملک مدار المہام یک قلم از ارث محروم باشند، یارای جای دم زدن نیست[1]۔"

پنجاب میں ناظم کی تقرری کے مسئلے پر بادشاہ اور وزیر میں اختلاف رائے اور غیر ضروری بحث کے نتیجے میں، "نظم و نسق ممالکت رو بہ برہم خوردگی آورد و ہر جانب فتنہ برخاست، یک طرف زمینداران جموں سر از اطاعت پیچیدند۔ و سکھان شوربخت مصدر شورش و فساد گردیدند[2]۔"

آخر کار جب بادشاہ زکریا خاں کے بیٹوں کے لئے قائل نہ ہو سکا۔ تو وزیر نے نظامت پنجاب

[1] بدائع وقائع، ورق ۲۳۲ الف، ۲۳۲ ب، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔
[2] آنند رام مخلص، بدائع وقائع، ورق ۲۴۳ الف، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری

اپنے لئے مانگ لی۔ بادشاہ نے طوعاً کرہاً اس کی منظوری دے دی۔ اس طرح ہندوستان کے سب سے اہم سرحدی صوبے کے لیے انتہائی غیر دانشمندانہ طریق کار یعنی غیر حاضر نیابتی صوبہ داری قائم کی گئی۔ یہ علاقہ دفاعی نقطۂ نگاہ سے اس امر کا متقاضی تھا۔ کہ یہاں ہمہ وقتی ناظم کا تقرر کیا جاتا۔ لاہور میں نائب ناظم کے عہدے پر میر مومن خان اور دیوانی پر لکھپت رائے کو مقرر کیا گیا۔ تاہم وزیر نے اپنے بنیادی مقاصد کی تکمیل کر لی۔ اور تھوڑے عرصہ بعد یحییٰ خان کو اپنا نائب بنا لیا (۳ جنوری ۱۷۴۶ء)

وزیر قمر الدین کی شہ پاکر عملی طور پر یحییٰ خان نے والد کی وفات کے فوراً بعد سے ہی پنجاب کا نظام سنبھال لیا تھا۔ اس طرح دہلی میں وزیر کی سفارتی جدوجہد کے ساتھ ساتھ لاہور میں والد کی نشست پر یحییٰ کو دیکھا۔ تو شاہنواز کے عزائم بھی بیدار ہوئے۔ وہ اس زمانے میں جالندھر دوآب کا فوجدار تھا۔ وہ اپنے دستے لے کر لاہور آن دھمکا۔ یحییٰ خان سے مطالبہ کیا۔ کہ والد کے ترکہ میں سے اس کا حصہ دیا جائے۔ یحییٰ خان نے حیل وحجت کی۔ بات چیت نے طول پکڑا۔ دونوں بھائیوں کے دستوں میں جھڑپیں شروع ہوگئیں۔ تاہم جلد ہی امن قائم ہوگیا۔ شرائط طے پاگئیں۔ اور شاہنواز مقررہ نقد رقم اور جواہرات لے کر واپس چلا گیا[1]۔

شاہنواز خان کا رویہ مفاہمانہ نہ تھا۔ وہ یحییٰ خان کو راستے سے ہٹانے اور خود کو تخت پنجاب پر متمکن کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا[2]۔ چنانچہ ۲۱ نومبر ۱۷۴۶ء کو دستے لے کر لاہور پہنچا۔ اپنے دیوان صورت سنگھ کے توسط سے یحییٰ خان سے مطالبہ کیا۔ کہ والد کی جائیداد مکمل طور پر تقسیم کی جائے۔ اس

---

[1] ۱۔ آنند رام مخلص۔ بدائع وقائع، ورق ۲۳۳ الف۔ مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری

۲۔ عبدالکریم۔ بیان واقع، ص ۱۸۰ لاہور

۳۔ سرکار، فال آف دی مغل ایمپائر، جلد اول۔ ص ۱۹۲-۱۹۳

۴۔ گپتا، لیٹر مغل ہسٹری آف دی پنجاب، ص ۶۴

[2] خواجہ عبدالکریم کشمیری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ماضی میں وہ والد کے خلاف بھی (بقیہ حاشیہ ص ۹۵ پر)

موقع پر آدینہ بیگ خان، کوڑا مل اور حشمت اللہ خان جو یحییٰ خان کے انتہائی معتمد اور اہم امراء تھے۔ اس کا ساتھ چھوڑ کر شاہنواز خان کے ساتھ مل گئے۔ یحییٰ خان والد کے ترکہ میں کچھ بھی دینے کو تیار نہ تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اس وقت لڑائی سے بھی بچنا چاہتا تھا[1]۔

بات چیت طویل ہوگئی اور کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔ طرفین کے سپاہی ایک دوسرے سے اُلجھ پڑے۔ آخر کار یحییٰ خان اپنے سرداروں میر مومن خان، دیوان لکھپت رائے، میر نعمت خان، میر امین بیگ کے ہمراہ لاہور سے باہر آیا۔ دونوں بھائیوں میں تیز جھڑپ ہوئی۔ تاہم بات زیادہ نہ بڑھی۔ کیونکہ یحییٰ خان نے اپنے والد کے خزانے میں سے اسے چھ لاکھ روپے ادا کرنے کی حامی بھر لی[2]۔

بقیہ حاشیہ ص ۹۴ علمِ بغاوت بلند کر چکا تھا۔ "بعد از رفتن (نادرشاہ) بولایت صوبہ داری ملتان بنام او مقرر کردہ، مشارٌ الیہ بنابر غلبۂ غرور جوانی و دولت و خبثِ طینت و شجاعت با پدر حقوق ورزیدہ و لوائے مخالفت برافراشتہ، بغی اختیار نمودہ بارادہ جنگِ پدر بزرگوار از ملتان بر سر لاہور لشکر کشی کردہ و آخر ذلیل و خوار شدہ بہ شاہجہان آباد نزد نواب وزیر اعظم کہ ہمشیرہ زادہ حقیقی ایشان می شد، آمد و ایشان ہم بہ پاس خاطر پدر بزرگوارش و نظر بہ قبح کردار و اطوارش روی ندادہ و او ترک روزگار نمودہ۔ در لباس درویشی در قصبہ تلپت کہ در جاگیر مادرش ہمشیرہ نواب وزیر اعظم بود، رفتہ۔ و تکیہ بستہ تا چندی از ندیمان و مخصوصان بدراہ خویش منتظر تشریف آوردن نادرشاہ باز بہ ہندوستان کہ تیقن داشت، نشست۔ تا آنکہ خبر وفات پدر و استقلال برادر بر صوبہ پنجاب و ملتان معلوم او شد۔" (بیان واقع، ص ۱۸۰

[1] ۱۔ گپتا، لیٹر مغل ہسٹری آف دی پنجاب، ص ۶۵، لاہور ۱۹۴۴ء

۲۔ سرکار، فال آف دی مغل ایمپائر، حصہ اول، ص ۱۹۳

[2] محمد علی خان، تاریخ مظفری، ورق ۷۳ ب، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔

شاہنواز خان بٹالہ کی طرف چلا گیا۔ اور یحییٰ خان کی عملداری کے بہت سے دیہاتوں پر قبضہ کرلیا۔ اور متعدد نواحی سرداروں کو اپنے تحت کرلیا۔ ان اطلاعات سے ناظم لاہور کو بہت غصہ آیا۔ اور اُس نے شاہنواز خان سے دُو دُو ہاتھ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ شاہنواز کو یحییٰ خان کے عزائم کی خبر ہوئی۔ تو اُس نے لاہور کا رُخ کیا۔ مزار حضرت ایشاں کے پاس خیمہ زن ہوا یحییٰ خان نے بھی مورچہ بندی کی۔ میر مومن ہراول میں تھا۔ ۱۷ مارچ ۱۷۴۷ء کو لڑائی شروع ہوئی۔ شاہنواز خان کی طرف سے آدینہ بیگ نے حملے کی قیادت کی۔ اور میر مومن کو اس کے مورچوں سے پیچھے دھکیل دیا۔ اگلے روز شاہنواز خاں نے خود حملہ کی رہنمائی کی۔ میر مومن کو شکست ہوئی۔ اور وہ زخمی حالت میں پکڑا گیا یحییٰ خان کے سپاہیوں کے واجبات پانچ، چھ ماہ سے واجب الادا تھے۔ انھوں نے تنخواہوں کے لیے ہنگامہ آرائی شروع کردی۔ شاہنواز خان نے انہیں بآسانی بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ ملا لیا یحییٰ خان کی بساط الٹ چکی تھی چنانچہ ۲۱ مارچ کو شاہنواز تقریبًا بلا مدافعت شہر میں داخل ہوگیا۔ یحییٰ کو گرفتار کرکے پھوپھی دردانہ بیگم کی حویلی میں نظر بند کردیا گیا۔[1]

شاہنواز نے پنجاب کی حکومت سنبھال لی۔ لکھپت رائے کی جگہ کوڑا مل کو دیوان مقرر کیا۔ آدینہ بیگ خان کو جالندھر دوآب کا فوجدار بنایا۔ ان تبدیلیوں کے علاوہ اس نے تقریبًا تمام سابقہ

---

[1] ۱۔ آنندرام مخلص، بدائع وقائع، ورق ۲۴۴ ب، ۲۴۳ ب مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری
۲۔ عبدالکریم، بیان واقع، ص ۱۸۱
۳۔ گپتا، لیٹر مغل ہسٹری آف دی پنجاب، ص ۶۵-۶۶
۴۔ علی الدین، عبرت نامہ، ص ۲۰۰
۵۔ پروفیسر شجاع الدین نے اپنے مقالہ "سیاسی اور ثقافتی تاریخ" (نقوش، لاہور نمبر ص ۹۱)، میں ان تمام واقعات کو ایک سال قبل قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک شاہنواز خان کا لاہور پر قبضہ ۲۱ مارچ ۱۷۴۶ء کو ہوا۔ یہ درست نہیں ہے۔

اہم امراء کو جو اس کے بھائی والد اور دادا کے ساتھ خدمات انجام دیتے رہے تھے۔ بیک قلم موقوف کرکے اپنی انتقامی کاروائیوں کا نشانہ بنایا۔ آنندرام مخلص لکھتا ہے۔

"میر مومن خان و میر امین خان و میر نعمت خان وغیرہ سرداران ذی شان را کہ در خدمت
سیف الدولہ عبدالصمد خان مرحوم و سیف الدولہ زکریا خان بہادر مغفور ریش سفید
کردہ، جانفشانی ہا نمودہ بودند، بجرم رفاقت آعزالدولہ بہادر نظر بند ساخت۔
... و اکثری رفقای برادر بزرگ کہ بجای پدر بود، سلوک ناپسندیدہ نمودند۔"[1]

شاہنواز نے حکومت پر قابض ہونے کے بعد اپنی فوجی جمعیت کو مستحکم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ لاہور کے وسیع خزائن اس کے ہاتھ آئے تھے چنانچہ اس نے انہیں فوجی مصرف میں خوب استعمال کیا۔ اور مفتی علی الدین کے الفاظ میں۔ " دراندک ایام قریب پنجاہ ویک ہزار سوار و پیادہ جمع نمود و چہار صد توپ تیار کنانید۔"[2]

شاہنواز سیاسی تدبر سے بے بہرہ اور لاپرواہ حکمران ثابت ہوا۔ سوہن لال سوری لکھتا ہے

"متصل دروازہ کشمیری بنگلہ نقرہ تیار کنانیدہ اوقات بہ عیش و نشاط و فرحت
و انبساط بسر می برد و از شوخ طبعی و ناتجربہ کاری معاملہ سرداری وغیرہ خصائل
مزاجش چہ مرقوم نمودہ آید۔ اگر احیانًا متنفسی من الانفاس انگشت سبابہ بطرف
بنگلہ آں جامع خوبی ہای می نمود مہ فی الحال بہ نکبت ابدی واصل می شد۔"[3]

شاہنواز کے بارے میں ہری رام گپتا نے لکھا ہے۔

---

[1] بدائع وقائع، ورق ۲۴۴ ب، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔
[2] عبرت نامہ، ص ۲۰۰
[3] عمدۃ التواریخ، جلد اول، ص ۱۱۴

The new governer is described by all contemporary writers as a man of intemperate habits and blood-thristy character. The author of Tarikhi-Mohammad Shahi depicts him as more cruel than even Nadir Shah.[1]

حکومت پنجاب پر یہ زبردستی قبضہ اور آئینی ناظم کی بے دخلی دربار دہلی کے لیئے ناقابل برداشت تھی۔ تاہم شاہنواز خان کے خلاف کوئی فوری اقدام نہ کیا گیا۔ کیونکہ وزیر قمرالدین کی خواہش تھی۔ کہ پہلے اپنے داماد یحییٰ خان کو رہا کرائے۔ خدشہ تھا کہ فوج بھیجنے کی صورت میں اس کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔ چنانچہ قمرالدین خان نے شاہنواز کو متعدد مفاہمانہ اور بعدازاں تہدید آمیز خطوط لکھے اور یحییٰ خان کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ لیکن شاہنواز خان کی طرف سے اسے ہمیشہ یہ جواب ملا۔ کہ یحییٰ خان کی رہائی صرف ایسی صورت میں ممکن ہے۔ کہ ایک شاہی فرمان کے ذریعہ اس کی نظامت کی توثیق کر دی جائے۔

یحییٰ خان کو پھوپھی کے گھر نظر بند کر دیا گیا۔ چار ماہ بعد اتفاق سے وہ رہائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ خواجہ شمس الدین خاں کی کوشش سے منصوبے کے تحت بروایت عبدالکریم۔

" بپایمردی اصیل کشیری درخوان نشستہ و آں اصیل مذکور خوان را بہ قسمی کہ مع طعام در مجلس بردہ بود۔ ہماں قسم سربستہ با میر یحییٰ خان برداشتہ، از پیش چوکیداران و نگاہبانان بدلیری و استقلال تمام بیرون بردہ۔[2] "

ایک مقررہ جگہ پر خواجہ شمس الدین خاں اور حافظ یار محمد خاں خویشگی افغان قصوری پچاس سوار[1] کے ہمراہ منتظر تھے۔ وہ یحییٰ خان کو فوراً لے کر قصور کے راستے روانہ ہو گئے۔ اس رات شاہنواز کو خبر نہ ہو سکی۔ کیونکہ " آں روز حیات اللہ خاں بہادر بزم عیش آراستہ متوجہ بہ تماشائی اہل ارباب و

ا؎ ہسٹری آف دی سکھز ، ص ۳۷

۲؎ بیان واقع ، ص ۱۸۱

نشاط بود ارباب انبساط بود۔[1] " صبح خبر ہوئی۔ تحقیق و تفتیش شروع ہوئی۔ متعلقہ حکام کی شامت آگئی۔ یحییٰ خان کے عہد کے بخشی نعمتی بیگ اور حاجی عاشو سازش میں ملوث ہونے کے الزام میں قتل کر دیئے گئے۔ دیگر متعدد افراد پر اس قدر ظلم و ستم کیا گیا۔ کہ اس کے تصور سے لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ خواجہ عبدالکریم کشمیری لکھتا ہے۔

" در دیوان مظالم نشستہ۔ در باب تحقیق و تفتیش از تعذیب و عقوبت، آنچہ در منخبیہ احدی نگہ زد۔ با بیچارہ چند بے گناہ جمعی را تیردوز و جمعی را تا بہ سینہ در زمین کندہ۔ ایستادہ کردہ بہ تیر و نیزہ دوختہ و چند کشمیری زنان اصیل را بگمانِ آں کشمیرنی جانباز، ریسمانہا در پستان ہا بستہ و سیخہا داغ کردہ علی رؤس الاشہاد در فروج آں غریباں نہادہ۔[2] "

لیکن یہ سب کچھ بے سود تھا۔ اس سے محض اس کی خون آشام فطرت کی تسکین ہوئی یحییٰ خان دہلی پہنچ چکا تھا۔ شاہنواز خان کو بھی اپنی اس حرکت کے مضمرات کا احساس تھا۔ جو اس نے پنجاب پر قبضہ کر کے کی تھی۔ اس نے اپنے میر سامان محمد نعیم خان کو لاہور پر قبضہ کے فوراً بعد دہلی ارسال کیا تھا۔ تحفے تحائف کے ساتھ بادشاہ کے نام ایک عرضداشت بھیجی۔ جس میں اپنی اس حرکت پر معذرت کی اور درخواست کی کہ پنجاب کی نائب نظامت اس کے نام کر دی جائے۔[3]

تاہم دہلی میں اس کے سفیر کی کوئی پذیرائی نہ ہوئی۔ تھوڑے ہی دنوں بعد یحییٰ خان اس کی قید سے رہا ہو کر دہلی پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ تاش کے تمام پتے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ چنانچہ

ا؎ ا۔ مخلص ، بدائع وقائع ، ورق ۲۴۹ الف ، ۲۴۹ ب مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔

۲۔ غلام حسین طباطبائی ، سیرالمتاخرین ، ص ۸۵۷ ۔

۲؎ بیان واقع ، ص ۱۸۲ ۔

۳؎ آنند رام مخلص ، بدائع وقائع ، ورق ۲۴۵ ب مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری

دربار دہلی اب اس کی سرپرست طاقت نہیں بلکہ حریف قوت تھی۔ دربار دہلی میں بھی اسے ایک نافرمان باغی اور شرپسند امیر سمجھا جاتا تھا جس کی سرکوبی ناگزیر تھی۔ یحییٰ خاں کے فرار کے بعد شاہنواز خان کی جھلاہٹ کی انتہا نہ رہی۔ اس کی اس دور کی ذہنی کیفیت کا تجزیہ مصنف "بیان واقع" نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

"بعد از خلاص یافتن میر یحییٰ خان بشامت افعال سراپا تو و بال ازبسکہ جنون و سودای سفاکی کہ از نادر شاہ تعلیم گرفتہ بود۔ دیوانہ شدہ بیک بار حاکم ملتان و پنجاب و مالک ملک و ملک جد و پدر و برادر و قابض و متصرف اندوخت ہای پنجاہ سالہ نقد و جنس گردیدہ و نسبت بپادشاہ ہندوستان و وزیر اعظم اظہار بغی و طغیان نمودہ و لفظ فدویت محمد شاہ از مہر برآوردہ۔ این بیت کندہ بود ؎

الٰہی چو بر نیتم آگہی — چوں نیت بخیر است خیرم دہی

چوں ادعائے کاذب بود۔ مآثرش بالعکس ظہور نمود و دور آں مہر را بدستور بادشاہ ہندوستان کہ اسمای اجداد و امجاد تخت نشین صاحب سکہ میکنند و آن را مہر اوزک می نامند اسمای گرامی اثنا عشر رضوان اللہ علیہم اجمعین کندہ بود۔ زیرا کہ باعتقاد فاسدش نادر شاہ را شیعہ امامیہ اثنا عشری پنداشتہ بود۔ حال آنکہ نادر شاہ مقید بدین و مذہبی نبود۔ بلکہ میلان دلش بہ مذہب تسنن بیشتر ظاہر می شد۔

بہر حال موی الیہ نظر بر باعث مذکور، برخلاف اجداد و امجاد خود ترک مذہب تسنن نمودہ، امامیہ شدہ بود، بلکہ بآن ہم مقید نہ بودہ بر دختر سکھی عاشق شدہ۔ چوں عذر سکھیت خود و اسلام او نمود ند جواب داد کہ ؎

مذہب عاشق ز مذہب ہا جدا ست — عاشقاں را مذہب و ملت خدا ست

واہگرو گفتہ کہ یک مرتبہ از دین اسلام برآمدہ سکھ شدہ۔ کڑاہی گرو کہ در وقت سکھ شدن معمول آں فرقہ گمراہ است۔ دادہ و نام خود سلطان سنگھ گذاشت و یک مرتبہ بر دختر

حلال خور فریفتہ شدہ۔ رسوم آن فرقہ کمینہ را چنانچہ باید بجا آوردہ۔ داخل آں گروہ گردید و دختر ایشاں گرفتہ۔ ازالہ بکارش نمودہ۔ بیکی از مصاحبان خود بخشید۔ غرضیکہ طرفہ معجون کثیر الشر قلیل الخیر برآمدہ بود۔ و در ظلم و عقوبات و تعذیبات حجاج و ہلاکو پیشش نی می نواختند[۱] "

اس صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ صوبے کا نظم و نسق درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ دربار دہلی کی طرف سے مداخلت کا خطرہ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ شاہنواز خان نے مایوس ہو کر چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ وہ ایک حلیف کی تاک میں تھا۔ جو اسے دہلی کے مقابلہ میں مناسب تحفظ دے سکے۔ اچانک شمال مغربی گوشے سے ایک امید کی کرن نظر آئی۔ شاہنواز خان نے اپنی کرسی بچانے کی خاطر ایک بہت بڑا جوا کھیلنے کا فیصلہ کر دیا۔

---

[۱] بیان واقع، ص ۱۸۳-۱۸۴

باب : ۷

احمد شاہ ابدالی (۱)

پہلا حملہ

۱۷۴۷ء ——— ۱۷۴۸ء

احمد شاہ ابدالی کا ظہور

۹ جون ۱۷۴۷ء کو نادر شاہ اپنے ہی سپاہیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ احمد شاہ ابدالی اس کا ایک معتمد سردار تھا۔ وہ افغان دستوں کو لے کر قندھار کی طرف چلا گیا۔ افغانوں نے اسے باقاعدہ طور پر اپنا سردار تسلیم کر لیا[1]۔ چالیس ہزار کے قریب جنگجو افغان اس کے پرچم تلے جمع ہو گئے۔ قندھار پر قبضہ مستحکم کرنے کے بعد ابدالی نے افغانستان کے دیگر علاقے اپنی عملداری میں شامل کئے۔ ایک منظم حکومت کی بنیاد ڈالی۔

[1] ۱۔ ابوالحسن بن محمد امین گلستانہ، مجمل التواریخ، ص ۶۰
۲۔ آنند رام مخلص۔ بدائع وقائع۔ ورق ۲۴۷ الف
۳۔ عبدالکریم۔ بیان واقع۔ ص ۱۸۴
۴۔ غلام حسین طباطبائی۔ سیر المتاخرین۔ ص ۸۶۰

اس نو استوار شدہ حکومت کو بے شمار مالی مشکلات کا سامنا تھا۔ انہی دنوں نادر شاہ کا ایک (ت)قی خان آختہ ہندوستان سے ۳۰ لاکھ روپیہ وصول کر کے واپس آ رہا تھا۔ اسے نادر شاہ کی (مو)ت کی خبر نہ ملی تھی۔ کابل کے نواح میں مقامی قبائلی سرداروں نے یہ خزانہ لوٹ لیا۔ ابدالی کو (خبر) ہوئی۔ تو اس نے تیزی سے ان کے خلاف کاروائی کر کے خزانہ ہتھیا لیا[1]۔ اس خزانے سے اس نے اپنی انتظامی مشکلات کی تسہیل کا کام لیا۔

کابل پر ان دنوں ناصر خاں کی حکومت تھی۔ جسے نادر شاہ نے اپنی طرف سے دوبارہ مقرر کر دیا (تھا)۔ ابدالی نے ناصر خاں سے بات چیت شروع کر دی۔ اسے پیشکش کی کہ اگر وہ سالانہ پانچ لاکھ روپے (ادا ک)رنے پر رضامند ہو جائے تو اسے ابدالی کی طرف سے گورنری پر بحال رکھا جائے گا۔ ناصر خاں اس پر آمادہ نہ ہوا۔ اور کابل چھوڑ کر پشاور آ گیا۔ اور ہندوستان کی طرف آنے والوں راستوں پر قلعہ بندیوں میں مصروف (ہو) گیا۔ احمد شاہ قندھار سے چلا۔ غزنی اور کابل پر قبضہ کر کے پشاور کا رخ کیا۔ پشاور کا ناظم عبدالصمد خان (اب)دالی سے جا ملا۔ حالات ناسازگار دیکھ کر ناصر خاں نے پشاور خالی کر دیا۔ ابدالی نے سردار جہان خاں کے تحت ایک دستہ پشاور پر قبضہ اور ناصر خاں کا تعاقب کرنے کے لئے بھیجا۔ پشاور پر بغیر کسی مدافعت کے قبضہ ہو گیا۔ ابدالی نے یہاں اپنی پوزیشن خاصی مستحکم کر لی۔

بھاری تعداد میں افغان ابدالی کے پرچم کے تلے جمع ہو رہے تھے۔ ابدالی نے ان کی نفسیات کے مطابق جہاں کشائی کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی۔ الفنسٹن اس بارے میں رقمطراز ہے

**Ahmad Shah .... had to found a monarchy over a warlike and independent people, by no means attached to that form of government, those most accustomed to be governed by a king had only felt his powers in the means which were used to compe-
... es and have**

[1] عبدالکریم۔ بیان واقع، ص ۱۸۶ - ۱۸۷

lled them to pay tribute to a foriegn state and ne... never regarded him as a powerful enemy rather than a magistrate by whom they were protected, and to whom they owed loyalty and attachment. They were never been united under a native king, & from the love of equality so conspicuous in their character they were likely to view the explanation of one of their owoтation with even more jealousy than the tyranny of a foreigner invader!

شاہنواز خان کی طرف سے ہندوستان پر حملہ کی دعوت

شاہ نواز خان کو ابدالی کی تخت نشینی اور پشاور میں آمد کی اطلاعات مل چکی تھیں۔ آدینہ بیگ نے جو اس کا معتمد مشیر تھا۔ اس پر صورت حال واضح کرتے ہوئے کہا کہ۔

"شما فقط ہمشیرہ زادہ وزیر الممالک قمر الدین بہادر اید و یحیٰی خان ہم داماد و ہمشیرہ زادہ اوست، و از دست شما گریختہ بحضور وزیر دربادشاہ رفتہ۔ البتہ وزیر در برہم کاری شما قصوری نخواہد کرد و نخواہد گزاشت کہ شما فارغ البال بودہ حکمرانی کنید۔ صلاح آنکہ احمد ابدالی کہ دریں ولایت دم از سلطنت می زند۔ با او در سازید کہ او رفاقت شما را مغتنیات و تائیدات آسمانی خواہد شمرد[2]"

یہ بات شاہنواز کے جی کو لگی۔ اس نے فورا ایک ایلچی ابدالی کی طرف روانہ کر دیا۔ "راہ مراسلات از ابدالی کشادہ نوشت۔ کہ سلطنت از شما وزارت از ما باشد[3]" ابدالی اس غیر متوقع مگر مسرور کن دعوت

---

[1] کنگڈم آف کابل، جلد ۲، ص ۲۸۲، لندن ۱۸۳۹ء

[2] غلام حسین طباطبائی، سیر المتاخرین، ص ۸۶۱

[3] ۱۔ ایضاً (۲) مفتی علی الدین نے لکھا ہے "بمقتضائی حداثت سن و نشۂ نوخیزی و بے بہری لیسودائی دیگر
بقیہ حاشیہ ص ۱۰۵ پر

سے بہت خوش ہوا۔ وہ نادر شاہ کے ہمراہ ۱۷۳۹ء میں ہندوستان آچکا تھا۔ یہاں کے سیاسی حالات پر اس کی گہری نظر تھی۔ اس نے فوراً یہ دعوت قبول کر لی اور شاہنواز کو لکھا۔ کہ اسے اس کی پیشکش منظور ہے۔ اپنے ایک معتمد بغرا خان کو اس پیغام کے ساتھ لاہور روانہ کیا اور فوج کو ہندوستان کی طرف پیش قدمی کے لئے تیار کرنے لگا۔

ابدالی نے شاہنواز خان کے ایماء پر ہر طرح سے تیاریاں مکمل کر لی تھیں کسی بھی لمحے وہ اٹک سے دریائے سندھ کو پار کر کے پنجاب میں داخل ہو سکتا تھا۔ لیکن ہندوستانی سیاست میں درون خانہ بڑی تیزی سے حالات تبدیل ہو رہے تھے۔

آدینہ بیگ کا دوسرا کردار

آدینہ بیگ نے ایک طرف تو شاہنواز خان کو مشورہ دیا تھا۔ کہ ابدالی کو دعوت دی جائے۔ دوسری طرف وزیر دہلی قمر الدین خان سے خفیہ رابطہ قائم رکھا تھا۔ اسے لکھا کہ

"مرشد زادہ مسلک خود سری بیہودہ سخن فدویان اصغائی کند۔ و با احمد شاہ ابدالی راہ مراسلات کشادہ۔ اگر از حضور تسلی اوشاں شود مارا ہم مجال التماس میسر می تواند شد۔[1]"

وزیر اس خبر پر بہت مضطرب ہوا۔ اور اس نے حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے شاہنواز کو ایک مفاہمانہ اور مشفقانہ خط لکھا۔ اپنے رشتے اور سلطنت مغلیہ سے آبائی وابستگی کا احساس دلاتے ہوئے وزیر نے تحریر کیا۔

"از خاندان ما نمک حرامی گاہی نشدہ۔ زنہار کہ چنیں ارادہ باشما نباید و حیف کہ داعیہ

بقیہ حاشیہ ص ۱۰۴ پیچید کہ احمد شاہ ابدالی را از ولایت طلبیدہ بہ ہندوستان برم، و سلطنت محمد شاہ برہم زنم۔ او بادشاہ و من وزیر الممالک شوم۔ (عبرت نامہ، ص ۲۰۱)

[1] غلام حسین طباطبائی، سیر المتاخرین، ص ۸۶۱

اطاعت افغانی بیا دل نمودہ اید۔ باید کہ مرد کہ مذکور را از دہ تمام حدود ہندوستان

را مسخر نماید کہ ہر پنج صوبہ کابل وکشمیر وٹھٹھہ و لاہور وملتان در عمل آں نورچشم خواہد بود

و این جانب را بہمہ وجوہ مصروف امداد و اعانت خود دانید۔[1] "

شاہنواز کا نمائندہ محمد نعیم ابھی دہلی ہی تھا۔ وزیر نے فوراً شاہی فرمان تیار کرا کے اُس کے حوالے کیا جس میں پنجاب کی نظامت شاہنواز خان کو دے دی گئی تھی۔ مذکورہ بالا خط شاہی فرمان کے ہمراہ بھیجا گیا۔[2] "شاہنواز خان بورود خطِ خالوی خود وزیرالممالک قمرالدین خاں مغرور گشتہ۔ عہدیکہ با

احمد شاہ نمودہ بود نسیاً منسیا گردانید[3] "

اس دوران ابدالی کا ایلچی لغراخان لاہور پہنچا۔ کچھ تو شاہنواز کا ذہن پہلے ہی تبدیل ہو چکا تھا۔ اور کچھ لغراخان کے ناپسندیدہ اطوار و انداز نے اسے بہت برہم کیا۔ علی الدین نے لکھا ہے۔

" مرد جاہل وفضول گوئی بود۔ بعد حصول ملاقات جواب نامعقول نمود۔ بسنوحِ کلام

افغان غول سرشت مزاج شہنواز خان متغیر شد۔[4] "

ابدالی دسمبر ۱۷۴۷ء کے وسط میں پشاور سے روانہ ہو چکا تھا۔ بارہ ہزار سوار و پیادہ کے ہمراہ اس نے دریائے سندھ عبور کیا۔[5] اٹک کے مقام پر یوسف زئی بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔

---

[1] غلام حسین طباطبائی ، سیرالمتاخرین ۔ ص ۸۶۱ ۔ ۸۶۲

[2] گنڈا سنگھ ، احمد شاہ درانی ، ص ۴۳ ۔ ۴۴

[3] غلام حسین طباطبائی ، سیرالمتاخرین ، ص ۸۶۲

[4] عبرت نامہ جلد اول ، ص ۲۰۱

[5] (۱) عبدالکریم ، بیان واقع ، ص ۱۸۷

(۲) گنڈا سنگھ نے لکھا ہے کہ اس کی معیت میں اٹھارہ ہزار افغان تھے جن میں سے ایک تہائی اس کے اپنے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے (احمد شاہ درانی ، ص ۴۴)

یہاں پر لغراخان نے ابدالی سے ملاقات کی اور اسے لاہور کا سارا حال کہہ سنایا۔ ابدالی کو ماحول کی تبدیلی پر قدرے تشویش تو ہوئی۔ تاہم اس نے پیش قدمی جاری رکھی۔ راستہ میں فوج نے لوٹ مار اور تاخت و تاراج کی کاروائیاں جی بھر کر جاری رکھیں۔[1]

پنجاب کے قلب میں پہنچ کر اس نے ایک اہم دفاعی چوکی قلعہ رہتاس پر قبضہ کیا۔ یہاں فوج نے چند سے قیام کیا۔ ابدالی کے مرشد پیر صابر شاہ ایک افغان امیر محمد یار خان ضرب باشی کو لے کر ابدالی کے منع کرنے کے باوجود لاہور کی طرف روانہ ہو گئے۔ اور مدعا یہ ظاہر کیا کہ اپنی والدہ سے ملاقات اور لاہور کے بزرگان دین کے مزارات کی زیارت مقصود ہے۔ لاہور میں ان کی آمد ابدالی کی کوئی خفیہ چال محمول کی گئی۔

" ہرکارہ ہای شہنواز خان خبر بردند۔ کہ ساحر احمد شاہ بہ شہر آمدہ است۔ می خواہد کہ

توپ خانہ این طرف را باطل سازد۔[2] "

صابر شاہ نے مفتی عبداللہ کے مکان میں قیام کیا۔[3] یہ اطلاعات ملنے پر شہنواز خان نے آدینہ بیگ اور کوڑا مل کو حقیقتِ حال معلوم کرنے کے لیے بھیجا۔ وہ درویش کے پاس گئے۔ صابر شاہ نے کہا۔ " مرا تعرضی با شما نیست اما حقوق این شہر کہ منشا و مولد من است وحقوق مردم این شہر

وحکامش کہ با این ہا بسر بردہ ام بر گردن است بنا بریں می گویم کہ بدعہدی پیش خلق

وخالق ممدوح ومحمود نیست وتیغ شما با تیغ احمد ابدالی برابر نہ۔ "

کسی نے کہا۔ کیوں؟ کیا ہماری تلوار لکڑی کی ہے۔ اور ابدالی کی لوہے کی؟۔ صابر شاہ نے جواب دیا۔ نہیں دونوں تلواریں آہنی ہیں۔ مگر ابدالی کا اقبال عروج پر ہے۔ اور تم اس کے ہم پلہ نہیں ہو۔

---

[1] عبدالکریم ، بیان واقع ، ص ۱۸۷

[2] ایضاً ، ص ۱۸

[3] غلام حسین طباطبائی ، سیرالمتاخرین ، ص ۸۶۲

آدینہ بیگ نے ان باتوں سے شاہنواز خان کو مطلع کیا۔ وہ یہ سن کر بہت جھلایا اور صابر شاہ اور محمد یار خان کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔[1]

علی الدین نے لکھا ہے۔ کہ صابر شاہ نے شہنواز کے سامنے بے باکانہ اور گستاخانہ انداز میں گفتگو کی۔ "شہنواز خان بطریقِ ظرافت پرسید کہ برادر احمد خان بخیریت است؟ پیرزادہ جواب داد کہ او بادشاہ ولایت و خراسان است و نیز داعیہ تسخیر ہندوستان پیش نہاد خاطر خطیر دارد۔ تو کہ صوبہ دار یک مکان و ملازم و تابعدار دیگر باشی باز ہیچ صرف از زبان می گوئی۔[2]"

شاہنواز خان کہ از حد مشتعل مزاج تھا۔ ان گستاخانہ الفاظ کو برداشت نہ کر سکا۔ اس نے اپنے بخشی خواجہ عصمت اللہ خان کو حکم دیا۔ کہ درویش کے منہ میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ البتہ محمد یار خان کو چھوڑ دیا گیا۔[3] احمد شاہ ابدالی کو اپنے پیر کے بارے میں یہ افسوسناک حالات معلوم ہوئے۔ تو اس کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ اس نے تیزی سے لاہور کی طرف پیش قدمی کر دی۔ گجرات کے علاقے پر ممتاز گکھڑ سردار سلطان مقرب خان کی نیم خود مختارانہ حکومت تھی۔ اس نے اطاعت قبول کر لی۔ ابدالی نے اسے بحال رہنے دیا۔[4] سودھرہ کے مقام سے دریائے چناب کو عبور

---

[1] غلام حسین طباطبائی، سیر المتاخرین، ص ۸۶۲

[2] علی الدین، عبرت نامہ جلد اول، ص ۲۰۲

[3] آنند رام مخلص کے ہاں اس واقعہ کی روایت یوں ہے۔ "شاہ صابر نام درویشی را کہ گویند پیرزادہ اش بود پیش حیات اللہ خاں بہادر فرستادہ پیغام کرد۔ کہ چوں بادشاہ ہندوستان ملالی از شما بخاطر دارد و در مقام انتقام است۔ بہتر این است کہ رفاقت ما اختیار کنید۔ تا در اعزاز و احترام شما بیفزائیم و شغل خطر وزارت را کہ بہترین اشغال کارخانہ فرماں روائی است۔ بنام شما مقرر نمائیم۔ ہرگاہ درویش مذکور بہ لاہور رسیدہ، بگذارش پیغام پرداخت با آنکہ شاید بسبب دیگر فتنہ ہا گاہ گاہ پیش از خطرہ رفاقتش بخاطر می گذشت بمقتضای نجابت دراں وقت یکلی این خیال را از صفحہ دل محو ساختہ جواب گزارندہ پیغام حوالہ زبان شمشیر شد۔ و ارادہ کارزار تصمیم یافت۔"
(بدایع وقائع، ورق ۲۵۸ ب - ۲۵۹ الف - مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری)

[4] مقرب خان ۱۷۴۱ء سے اس علاقے پر حکومت کر رہا تھا۔ (گجرات ڈسٹرکٹ گزیٹیئر ۸۴-۱۸۸۳ء - ص ۱۵)

کرنے بعد ۸ جنوری ۱۷۴۸ء کو ابدالی شاہدرہ پہنچ گیا۔ اور مقبرہ جہانگیر کے احاطے میں خیمہ زن ہوا۔

شاہنواز نے دہلی کی طرف سے پروانہ نظامت موصول ہوتے ہی ابدالی کے خلاف دفاعی کاروائیاں شروع کر دی تھیں۔ شہر کے ارد گرد مورچے کھدوائے۔ تاہم اس کی فوجی تیاریوں میں سب سے بڑی خامی یہ رہی کہ اس نے شہر کے دفاع پر ساری توجہ مرکوز رکھی۔ اس کے برعکس ابدالی کی پیشقدمی روکنے کی کوشش نہ کی۔ اندرونی طور پر اس کی حکومت کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ تمام اکابر امرا زیرِ عتاب تھے۔ اس کے ظلم و ستم نے رعایا کو اس سے متنفر کر دیا تھا۔

۱۰ جنوری ۱۷۴۸ء کو افغان فوج نے دریائے راوی کو پایاب عبور کر کے شالامار باغ کا رخ کیا۔ اور وہاں سے شمال مغرب محمود بوٹی گاؤں کے کھیتوں میں ڈیرے ڈال دیئے۔ شاہنواز خان شہر سے باہر ایک بڑی فوج اور بھاری سامان حرب کے ساتھ ابدالی کا منتظر تھا۔ اپنی ذاتی کمان کے علاوہ اس نے فوج کے دو حصے کیئے ایک حصہ مزار حضرت ایشان رح کے پاس ایک چھوٹے سے قلعے میں بخشی خواجہ عصمت اللہ خاں کے ماتحت رکھا۔ اس میں دس ہزار سوار اور پانچ ہزار بندوقچی تھے۔ دوسرا دستہ جس میں پانچ ہزار گھڑسوار اور بہت سے برقندار تھے۔ لاچین بیگ کے زیرِ قیادت درگاہ شاہ بلاول اور پرویز آباد کے درمیان متعین تھا۔

یہ اطلاع ملنے پر کہ ابدالی نے دریا پار کر لیا ہے۔ شاہنواز نے قصور کے ممتاز سردار جملہ خان[1] کو اس کے مقابلے پر بھیجا۔ لیکن وہ اپنے تمام سپاہیوں کے ہمراہ ابدالی سے مل گیا۔ اگلی صبح (۱۱ جنوری) افغانوں نے شہر کی طرف پیش قدمی شروع کی۔ ابھی وہ شاہ بلاول اور درگاہ شاہ حسین کے نواحی میدانوں ہی میں تھے۔ کہ خواجہ عصمت اللہ خاں بخشی اور لاچین بیگ اپنے اپنے دستوں کے ہمراہ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے مورچوں سے نکل آئے۔ اور توپوں اور رہکلوں سے افغانوں پر گولہ باری شروع

---

[1] عبرت، علی الدین میں اس کا نام جمعہ خان درج ہے، ص ۲۰۳

(۲) گنڈا سنگھ نے اسے جہلہ خاں قرار دیا ہے (احمد شاہ درانی، ص ۵۳)

کردی۔ ابدالی نے فوجی تدبیر سے کام لیا۔ اور اپنی فوج کو توپوں کے منہ میں جھونکنے سے گریز کیا۔ اس نے گھڑ سوار دستوں کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک ہزار گھڑ سوار تیزی سے لاہوری فوجوں کے مورچوں پر بار بار یلغار کرنے کے لئے منتخب کئے گئے۔ وہ پوری شدت کے ساتھ گھوڑے دوڑاتے ہوئے آتے اور مورچوں کو روندتے ہوئے واپس چلے جاتے۔

مقامی فوج نے کاملاً دفاعی پوزیشن اختیار کئے رکھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس روز انہیں جنگ نہ کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ سیر المتاخرین کی یہ روایت درست معلوم ہوتی ہے۔ کہ

" شاہنواز خان از درویشی شاہ کلب علی نام کہ در جفر دخلی داشت کسی را فرستادہ استعلام نمود۔ کہ پایان این جنگ چہ خواہد بود۔ او گفتہ فرستاد کہ امروز بر شما دشوار است اگر جنگ نہ شود بہتر واز فردا ظفر شما است۔ ہر قسم و ہر گاہ کہ بخواہد بکنید۔ شاہ نواز خان، آدینہ بیگ خان و کوڑا مل دیوان خود را فرستادہ بہ سرداران لشکر ممانعت کرد۔ کہ امروز کسی بحرب ابدالی بیرون نرود۔ اگر آنہا زور آرند از اندرون لشکر مدافعہ باید نمود۔"[۱]

تاہم لاہوری فوج نے زیادہ دیر تماشائی بننا پسند نہ کیا۔ ابدالی کے گھڑ سوار دستے نے جب ایک بار ادھر کا رخ کیا۔ تو مقامی فوج کے دو سو قزلباش ان پر جا پڑے اور انھیں بھگا دیا۔ افغان سوار کچھ دیر بعد پہلے جمعیت کے ساتھ حملہ آور ہوئے اور انھوں نے قزلباشوں کو پیچھے دھکیل دیا، حتیٰ کہ ان کے مورچوں تک پیچھا کیا۔

شاہنواز کی کوشش کے باوجود عام لڑائی چھڑ گئی۔ مقامی فوج میں جلد ہی افراتفری پھیل گئی۔ عصمت اللہ نے کمک طلب کی۔ آدینہ بیگ نے کوئی تعاون اور امداد نہ کی محض تماشائی بنا رہا۔ اس اثنا میں شام کی تاریکی پھیلنے لگی۔ لڑائی کا زور ٹوٹنے لگا۔ " قریب بغروب آفتاب افواج نظامت دست از زد و خود باز داشتہ ویورش را بر فردا موقوف گزاشتہ در تہیہ مراجعت بودند"[۲]

---

[۱] غلام حسین طباطبائی۔ ص ۸۶۲

[۲] آنندرام مخلص۔ بدائع وقائع، ورق ۲۵۹ الف۔ مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور

اسی اثنا میں افغانوں نے پلٹ کر تازہ دم حملہ کر دیا۔ مقامی فوج نے بھاگنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ امور فوج کا سربراہ عصمت اللہ خان بخشی فرار ہونے والوں میں شامل تھا۔ اگرچہ حضرت ایشاں کے قریب واقع قلعہ مناسب پناہ ثابت ہو سکتا تھا تاہم سب لوگ شہر کی طرف بھاگے۔

شاہنواز نے صورت حال کو سنبھالنے کی بے حد کوشش کی۔ اس کی خواہش تھی۔ کہ فوج کو دوبارہ اکٹھا کر کے جمایا جائے۔ تاہم اس کے بعض مشیروں نے اسے شہر میں قلعہ بند ہو کر مقابلہ کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ وہ بھی میدان سے واپس آ گیا۔ اس کے ہاتھی کو شہر کی طرف جاتا دیکھ کر باقی ماندہ فوج بھی دل برداشتہ ہو کر شہر کی طرف بھاگی۔ افغانوں نے عین اس وقت حملہ کیا اور کافی نقصان پہنچایا۔

فوج اس حد تک منتشر اور تتر بتر ہو چکی تھی۔ کہ قلعہ بند ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ مزید مدافعت بے سود تھی ہتھیار ڈالنے کی بھی کوئی صورت نہ تھی۔ ابدالی کسی طرح بھی اسے معاف کرنے پر تیار نہ ہو سکتا تھا۔ اب شہر سے فرار ہو کر ہی جان بچائی جا سکتی تھی۔ چنانچہ آدھی رات کے وقت شاہنواز لاہور کو افغانوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر فرار ہو گیا۔

اگلی صبح (۱۲ جنوری ۱۷۴۸ء) شاہنواز کے فرار کی خبر عام ہو چکی تھی۔ احمد شاہ ابدالی نے فوراً پیش قدمی کر کے شہر پر قبضہ کر لیا۔ شہر میں کوئی ذمہ دار فرد یا ادارہ موجود نہ تھا۔ جو فاتح سے بات چیت کر کے لاقانونیت کا انسداد کر سکتا۔ یہ دن اہل لاہور پر بہت بھاری گزرا۔ آنندرام مخلص لکھتا ہے۔

" دار السلطنت لاہور از غلبہ افغان دار الآشوب و فتنہ بود"[۱]

ظفر نامہ کا مصنف محی الدین خان رقم طراز ہے۔ " ہر چہار طرف شہر خموشاں افتاد۔"[۲] صاحب سیر المتاخرین کے الفاظ میں۔ " ابدالیان در شہر آمدہ، دقیقہ از نہب و غارت فرو نگہذاشتند۔"[۳] آزاد بلگرامی لکھتے ہیں

---

[۱] بدائع وقائع، ورق ۲۶۰ ب، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور۔

[۲] ورق ۴ الف، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور

[۳] غلام حسین خان۔ ص ۸۶۳

" درانیان بہ شہر درآمدہ دست بغارت دراز کردند و انواع خرابی با بعمل آوردند[1]" حدیقۃ الہند کا مصنف رضی الدین لکھتا ہے - " ابدالیان دقیقہ از نہیب و غارت فرو نگذاشتند و شہر را تاخت و تاراج نمودند[2]" مفتی علی الدین نے لکھا ہے - "بعد حصول فتح و فیروزی برائے پرورش عساکر و فوج ظفر موج حکم بغارت شہر لاہور داد - لشکریان مغلیورہ را کہ باندازہ یک کروہ بیرون شہر لاہور است لاہور تصور کردہ دست غارت و قتل دراں برکشادند[3]" مصنف تاریخ مظفری کے الفاظ میں -

" امتعہ و اموال سکنہ آنجا را یک قلم بہ غارت و تاراج داد[4]"

میر مومن خان، میر نعمت خان، سید جمال الدین اور میر اعین خان جو کئی ماہ سے نظر بند تھے رہا کر دیئے گئے - مومن خان، لکھپت رائے اور سورت سنگھ ابدالی سے ملاقات کے لیئے گئے -

" و در باب امان مردم و محافظت شہر مستدعی گشتند[5] "

انھوں نے ۳۰ لاکھ روپیہ ادا کرنے کا وعدہ کیا - ابدالی نے فوراً شہر میں امن و امان بحال کرنے اور لوٹ مار سے محفوظ کرنے کا حکم دے دیا - اس طرح غارت گری کا طوفان کم ہوا - اس سلسلے میں میر مومن خان کی خدمات قابل ذکر تھیں - آنندرام مخلص میر موصوف کے بارے میں لکھتا ہے -

" آہ، اگر ایں سردار جہاں دیدہ صاحب فطرت مطلق العنان و آں می بود - اول افغان از آب اٹک چرا می گذشت و اجیاناً گزشت، چہ معنی داشت کہ بے آنکہ جنگ عظیمی واقع شود - برانداختہ ہائی عمر سیف الدولہ عبدالصمد خان بہادر دلیر جنگ مرحوم و

---

[1] خزانہ عامرہ، ص ۹۷

[2] ورق ۱۸ ب مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور

[3] عبرت نامہ جلد اول، ص ۲۰۳

[4] ورق ۴۷ الف، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور

[5] مخلص، بدائع وقائع، ورق ۲۵۹ ب، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور

سیف الدولہ زکریا خان مغفور متصرف می گشت[1] - "

لاہور سے ابدالی کو بے پناہ مال غنیمت حاصل ہوا - خراج کے علاوہ ناظم اور امراء کے خزانے اور جائیدادیں، سامان حرب کے وسیع ذخائر جن میں توپیں، رہکلے، گولے شامل تھے، ہاتھ آئے - شہر اور اُس کے گرد و نواح سے جتنے اونٹ اور گھوڑے فراہم ہو سکے لے لیے گئے -

قیام لاہور کے درمیان ابدالی کے پاس جموں، باہو اور دیگر پہاڑی راجاؤں نے اپنے وکلا بھیج کر اظہار اطاعت کیا اور پنجاب کے اہم سرداروں اور امراء نے اطاعت کا دم بھرا - لاہور کے دار الضرب میں سکہ ڈھالا گیا جس پر یہ کلمات کندہ تھے -

" دُرِّ دُرّان احمد شاہ بادشاہ ـــ ضرب دار السلطنت لاہور ـــ جلوس میمنت مانوس احد - "

۱۹ فروری کو ابدالی نے لاہور سے روانگی اختیار کی اور دہلی کی راہ لی - لاہور میں اُس نے ایک مقامی حکومت تشکیل دی تھی - جملہ خان اس کا سربراہ، مومن خان نائب اور لکھپت رائے دیوان مقرر ہوئے[2]

شاہی فوج سے مقابلہ

ابدالی کی تمام سرگرمیوں کی اطلاع باقاعدگی سے دہلی پہنچ رہی تھی - لاہور پر اس کے قبضے اور دہلی کی طرف روانگی کی خبر بھی موصول ہو چکی تھی - تاہم دہلی کی طرف سے کوئی کاروائی بروقت نہ کی گئی - البتہ دو لاکھ کا لشکر جرار شہزادہ احمد اور قمر الدین خان وزیر کی قیادت میں ابدالی کو روکنے کے لیے روانہ ہوا - ۲۵ فروری کو شاہی فوج سرہند پہنچی - ابدالی ۲ مارچ کو سرہند پہنچ گیا چند روز بعد یہاں سے ۱۰ میل شمال مغرب منوپور کے مقام پر دونوں فوجوں میں جنگ چھڑ گئی - پہلے ہی دن

---

[1] بدائع وقائع، ورق ۲۶۰ ب، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لاہور -

[2] علی الدین، عبرت نامہ جلد اول، ص ۲۰۳

(۱۱ مارچ) وزیر قمرالدین گولہ لگنے سے مارا گیا۔ تاہم اس کے بیٹے معین الملک نے صورت حال کو سنبھالا۔ اور افغان فوج پر زبردست دباؤ ڈالا۔ افغانوں کے ذخیرۂ بارود میں آگ لگ گئی۔ ایک ہزار افغان موقعہ پر ہلاک ہو گئے۔ ابدالی نے میدان چھوڑ دیا۔ اور پسپا ہو گیا۔ شاہی فوج نے تعاقب کی ضرورت محسوس نہ کی۔[1]

احمد شاہ تیزی سے واپس ہوا۔ لاہور سے اپنا مال و اسباب اور خزانہ ہمراہ لیا اور افغانستان کا رُخ کیا۔ ۹ اپریل کو ایک شاہی فرمان کے تحت معین الملک کو پنجاب کا ناظم مقرر کر دیا گیا۔[2]

احمد شاہ ابدالی کا یہ حملہ پنجاب کی حد تک کامیاب اور دہلی کی حد تک ناکام رہا تھا۔ منوپور میں شکست کے بعد اصل میں پنجاب کی فتح کے اثرات زائل ہو گئے۔ تاہم ابدالی نے اپنے اگلے ہی حملے میں یہ قرض اتار دیا۔ ابدالی کا یہ حملہ اس کے ایک لامتناہی سلسلہ کا آغاز تھا۔ انتظامی طور پر پہلے ہی پنجاب کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ ابدالی کے حملہ نے رہی سہی کسر نکال دی۔ حملہ آور فوجوں کی یلغار سے سارا علاقہ تاخت و تاراج ہو گیا۔ اور ملکی زراعت اور معیشت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ افغانوں کی لوٹ مار اور غارت گری اس زمانے کی ایک مقبول ضرب المثل سے عیاں ہے۔

کھادا پیتا لاہے دا   رہندا احمد شاہے دا[3]

معین الملک ایک قابل منتظم تھا۔ اس نے پنجاب کی شیرازہ بندی میں دن رات محنت کی۔ جس کے نتیجہ میں انتظامی اور سیاسی طور پر حالات قدرے بہتر ہونے لگے۔

---

[1] (۱) سرکار، فال آف دی مغل ایمپائر، اول، ص ۲۱۰-۲۱۱

(۲) گنڈا سنگھ، احمد شاہ درانی، ص ۵۳

[2] اس کے ساتھ ہی ناصر خاں کو کابل کا گورنر بنایا گیا (سرکار اول، ص ۲۳۳)

[3] سیتا رام کوہلی مقالہ "احمد شاہ ابدالی اینڈ سکھز"، انڈین ہسٹری کانگریس، پروسیڈنگز، ص ۴۰۷، الہ آباد ۱۹۳۸ء

باب ۸

احمد شاہ ابدالی (۲)

دوسرا اور تیسرا حملہ

۱۷۴۹ء ——— ۱۷۵۲ء

میر معین الملک نے پنجاب کی نظامت سنبھالتے ہی صوبائی نظم و نسق اور علاقائی دفاع کو مضبوط بنانا شروع کر دیا۔ زکریا خان کی وفات کے بعد سے پنجاب کی حالت دگرگوں ہوتی جا رہی تھی۔ اب معین کے ماہر اور مضبوط ہاتھوں نے اسے از سر نو زندگی بخشی۔ لیکن یہ مہلت فرصتِ یک لحظہ ثابت ہوئی۔ ۱۷۴۹ء کے اواخر میں احمد شاہ ابدالی نے ایک بار پھر پنجاب کا رُخ کر لیا تھا۔

ممتاز سکھ مورخ گنڈا سنگھ کے خیال میں ابدالی کے اس حملے کی تین وجوہات ہو سکتی ہیں۔

۱۔ معین الملک نے افغانستان کی مشرقی سرحد پر اپنی حکومت کو اچھی طرح مستحکم کر لیا تھا اور اس کی فوجی قوت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ابدالی کی قندھار سے غیر حاضری کے دوران معین پشاور اور سرحدی علاقوں کے لیے خطرہ بن سکتا تھا۔

۲۔ ناصر خان سابق گورنر کابل کو دوبارہ اس علاقے کا گورنر مقرر کیا گیا۔ (۱۲ اپریل ۱۷۴۸ء) وہ لاہور پہنچ چکا تھا۔ جہاں معین نے اسے حصولِ کابل کے لیے ہر ممکن امداد دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اگر ابدالی ہرات کی مہم میں الجھتا تو معین اور ناصر کی متحدہ فوجیں کابل کے لیے خطرہ بن سکتی تھیں۔

۲۔ ہندوستان میں شکست کی وجہ سے ابدالی کی حیثیت اندرونِ ملک خاصی مجروح ہوئی تھی[1] ابدالی کے دل میں ہندوستان سے سابقہ ناخوشگوار واپسی کے دوران ہی ایک بار پھر ہندوستان پر حملہ کرنے کا عزم پیدا ہو چکا تھا۔ اس دوران ہندوستان کی سیاست میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اور فضا بیرونی حملے کے لئے زیادہ سازگار ہو چکی تھی۔

شاہِ دہلی محمد شاہ کا ۱۵ اپریل ۱۷۴۸ء کو انتقال ہو گیا۔ شہزادہ احمد، احمد شاہ کے نام سے تخت نشین ہوا۔ نئے بادشاہ کی جوانی حرم میں گزری تھی، اسے لڑائی اور نظمِ مملکت کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ وہ عشرتوں میں غرق تھا۔ اور اس کی توجہ امورِ مملکت کی بجائے لہو و لعب پر مرکوز تھی[2]

Dull by nature, indolent by habit and given to sensual pleasure, he was a puppet in the hands of eunuchs of the haram and danced to the tune of selfish and vulgar courtiers.[3]

قمرالدین خان کی جگہ اب صفدر جنگ وزارتِ دہلی پر فائز تھا۔ اس نے استحکامِ ملکی پر توجہ دینے کی بجائے اپنی ذاتی خواہشات کی تسکین کو اولیت دی۔ قمرالدین سے اس کی پرانی رقابت تھی۔ صفدر جنگ نے اس کی موت کے بعد بھی دشمنی کو ترک نہ کیا۔ اور اس کے بیٹے معین الملک ناظم پنجاب کو اپنی انتقامی کارروائیوں کا ہدف بنایا۔ وہ معین کی قابلیت اور بہادری سے ہراساں تھا۔ اس کے تحت الشعور میں یہ خدشہ موجود تھا۔ کہ معین ترقی کر کے اپنے باپ کا منصب حاصل کرنے کی کوشش کرے گا[4] چنانچہ ایسے آدمی کے برسر اقتدار ہوتے ہوئے معین کو کسی حملہ کی صورت میں دہلی سے کسی امداد کی توقع

[1] گنڈا سنگھ، احمد شاہ درانی، ص ۷۲

[2] تاریخ احمد شاہ، ایلیٹ اینڈ ڈوسن، ہسٹری آف انڈیا جلد ہشتم، ص ۱۱۲

[3] گنڈا سنگھ، احمد شاہ درانی، ص ۷۳

[4] سرکار، فال آف دی مغل ایمپائر، جلد اول، ص ۳۳۰

نہ تھی۔

پنجاب کو بھی کامل داخلی سکون کب نصیب تھا؟ سکھ پورے صوبے میں سرگرمِ عمل تھے۔ ان حالات میں ابدالی نے مناسب سمجھا کہ لگے ہاتھوں اپنی شکست کا داغ دھو لیا جائے۔ روانہ ہونے سے پہلے اس نے پشاور اور نواحی علاقے کے قبائل کو یہ پیغام بھیج دیا تھا۔ کہ وہ اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار رہیں۔ چنانچہ جونہی اس نے پشاور کی طرف قدم بڑھائے۔ آس پاس کے جملہ قبائل جوق درجوق اس سے آ ملے۔ پشاور پہنچ کر اس نے سردار جہان خاں کو ایک دستہ دے کر آگے روانہ کیا۔ اٹک کے مقام پر بہت سے خٹک ان میں شامل ہو گئے۔ جوں جوں وہ آگے بڑھتے گئے مقامی زمینداروں اور سرداروں کی شمولیت کی وجہ سے ان کی فوج پھیلتی گئی۔ جہلم اور چناب عبور کر کے اب وہ حکومتِ لاہور کے دروازے پر پہنچ چکے تھے۔ احمد شاہ ابدالی بھی ان کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔ دسمبر ۱۷۴۹ء کے وسط میں اس نے دریائے سندھ عبور کیا۔

معین الملک کو افغان لشکر کی اطلاع مل چکی تھی۔ اور اس نے مناسب دفاعی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ اس نے حملہ آور کو روکنے کے لیے ایک فوج کے ساتھ لاہور سے کوچ کیا۔ اپنی غیر حاضری کے دوران سید عوض خان کو لاہور میں اپنا نائب مقرر کیا۔ اور خود دریائے چناب کے کنارے سودھرہ[1] کے مقام پر پہنچ کر ڈیرے ڈال دیئے۔ مفتی علی الدین کے الفاظ میں۔

"نہضت بہ سمت راہ آمدن مدعی نمودہ راہ بر احمد شاہ مسدود ساخت[2]"

معین الملک کی فوج کئی ماہ سے تنخواہ کی ادائیگی سے محروم تھی۔ اس نے اپنے دیوان لکھپت رائے سے کہا کہ ان کی تنخواہیں ادا کر دی جائیں۔ لیکن دیوان نے جواب دیا۔ کہ ان مضطرب ایام میں رقم اکٹھی کرنا ممکن نہیں۔ خزانہ پہلے ہی خالی ہے۔ اس پر معین الملک نے مجبوراً اپنے

[1] وزیرآباد سے ۲ میل مشرق

[2] عبرت نامہ، ص ۲۰۹۔

ذاتی خزانے کا منہ کھول دیا ۔ اور اس طرح سپاہیوں کی تنخواہیں ادا کی گئیں۔[1]

اس کے ساتھ ساتھ اس نے چند تیز گام پیغام رساں دہلی روانہ کئے۔ اور حکام سے درخواست کی۔ کہ اس نازک موقعہ پر فوری کمک ارسال کریں ۔ معین کی فوجی حیثیت اتنی مستحکم نہ تھی کہ وہ افغانوں پر حملہ کی جرأت کر سکتا ۔ اس نے عمومی حملے کا منصوبہ دہلی کی کمک تک ملتوی رکھا لیکن یہ ایک سعیٔ لاحاصل تھی ۔ دہلی کے ارباب بست وکشاد کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی ۔

دونوں فوجوں میں معمولی جھڑپوں کا سلسلہ جاری رہا ۔ کوئی فیصلہ کن مرحلہ سامنے نہ آیا ۔ تو ابدالی نے ایک منصوبے کے تحت اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کیا ۔ ایک حصہ اپنے زیر کمان رکھا ۔ اور اسے یہیں رہ کر اسی طرح معین کو مصروف رکھنا تھا ۔ دوسرا حصہ سردار جہان خان کی کمان میں دے کر اُسے حکم دیا کہ معین کے عقب کو پریشان کریں ۔ اور لاہور کے گرد و نواح کے علاقے کو تباہ و برباد کر دیں ۔ جہاں خاں نے آتش و آہن کی زبردست کاروائی کے ذریعے سارے علاقے میں تباہی اور غارت گری کی صفِ ماتم بچھا دی[2] ۔ مصنف تاریخ احمد شاہ نے لکھا ہے ۔

Ahmad Khan's forces. seperating in all directions, laid waste the villages and fields on every side till they arrived in the neighbourhood of of Lahore destroying all the country in its r oximity.[3]

جہان خان کے دستے کھیتوں اور بستیوں کو تباہ و برباد کرتے ہوئے شاہدرہ تک پہنچ گئے عوض خان قائم مقام ناظم نے راوی کے گھاٹوں پر توپیں نصب کروا رکھی تھیں ۔ انہیں پار کرنا مشکل تھا توپوں سے افغان دستوں پر گولہ باری کی گئی ۔ شہر پر قبضہ کرنے کی کوشش ناکام ہوتے دیکھ کر

---

[1] گنڈا سنگھ ، احمد شاہ درانی ، ص ۷۵

[2] گنڈا سنگھ ، احمد شاہ درانی ، ص ۷۵

[3] ایلیٹ اینڈ ڈوسن ، ہسٹری آف انڈیا جلد ہشتم ، ص ۱۱۵

جہاں خان تقریباً دو ماہ بعد تباہی اور غارت گری کے بعد واپس آ کر ابدالی مل گیا[1] ۔

افغانوں کے اس حملے اور جہاں خان کی غارت گری کی اطلاعات باقاعدگی سے دہلی پہنچ رہی تھیں ۔ لیکن بادشاہ اور وزیر نے معین کی مدد کے لئے کسی قسم کی کمک بھیجنے کی کوئی کوشش نہ کی ۔ بلکہ اس کے برعکس وزیر صفدر جنگ معین کی پریشانی پر قدرے مسرور تھا[2] ۔ ابدالی نے اپنا ایک ایلچی معین کے پاس بھیجا جس میں اسے ہتھیار ڈالنے کو کہا گیا ۔ معین صورت حال کی نزاکت سے آگاہ تھا ۔ دہلی کی طرف سے کسی امداد کی توقع نہ تھی ۔ کہ ابدالی کے جنگجو دستوں کا مقابلہ کر سکتے ۔ معین نے صلح کی شرائط مانگیں[3] ۔ ابدالی نے مطالبہ کیا ۔ کہ چار محال، پسرور، گجرات، سیالکوٹ اور اورنگ آباد کا سالانہ محصول جو تقریباً ۱۴ لاکھ بنتا ہے ، اسے ادا کیا جایا کرے ۔ معین نے دہلی رابطہ قائم کیا ۔ وہاں سے فوراً اس کی توثیق ہو گئی[4] چنانچہ " نواب معین الملک زر چہار محال بوعدہ سال آئندہ وادنی کردہ و

اجناس لائق تحفہ پادشاہانہ درآن وقت پیش کش بادشاہ ساخت و احمد شاہ نیز خلعت

ہائ فاخرہ برائے سرفرازی نواب فرستادہ مرخص شد[5] "

یہ چاروں اضلاع پنجاب کے زرخیز ترین علاقے تھے ۔ سیالکوٹ میں ۱۴۸۴ دیہات اورنگ آباد میں ۳۰۷ دیہات ، پسرور میں ۶۳۲[6] دیہات اور گجرات میں ۱۵۸۱ گاؤں[7] تھے ۔ یہ معاہدہ دراصل ۱۷۴۹ء

---

[1] گنڈا سنگھ ، احمد شاہ درانی ، ص ۷۶

[2] تاریخ احمد شاہ ، ایلیٹ اینڈ ڈوسن ، ہسٹری آف انڈیا جلد ہشتم ، ص ۱۱۵

[3] طہماس بیگ کے ہاں اس حملے کی تفصیل قدرے مختلف ہے ۔ اس نے لکھا ہے ۔ " ابدالی کے حملے کی اطلاع ملتے ہی معین نے لاہور سے باہر پیش قدمی کی ابھی افغان اس مقام سے پندرہ کوس دور تھے ۔ چند دنوں بعد دونوں فوجوں میں لڑائی شروع ہو گئی ۔ معین کے ۲،۳ ہزار مغل دستوں نے افغانوں کو بہت نقصان پہنچایا ۔ اس پر ابدالی نے ان کے ساتھ مذاکرات شروع کر دیئے ۔ (طہماس نامہ ، ص ۱۱ ، ملخص انگریزی ترجمہ)

[4] (۱) غلام علی آزاد بلگرامی ، خزانہ عامرہ ، ص ۹۸ ۔ (۲) غلام محمد غبار، احمد شاہ بابا ، ص ۲۰۶ ، کابل ۱۹۴۲ء

[5] علی الدین ، عبرت نامہ ، ص ۲۰۹

[6] سیالکوٹ ڈسٹرکٹ گزٹیر ، ص ۱۵ ۔ لاہور ۸۴-۱۸۸۳ء

[7] گجرات ڈسٹرکٹ گزٹیر ، ص ۱۷ ، لاہور ۸۴-۱۸۸۳ء

کے اس معاہدہ کی تجدید تھی ۔ جو نادر شاہ اور محمد شاہ دہلی کے درمیان طے پایا تھا ۔ یہ فتح ابدالی کی تسکین کے لیے کافی تھی ۔

He had brough the victor Manupur to his knees and removed the Mughal danger from the east.[1]

فروری ۱۷۴۸ء میں ابدالی نے افغانستان کی راہ لی ۔

ابدالی کا یہ حملہ معین کے لیے مسائل اور مشکلات کا ایک انبار چھوڑ گیا ۔ اس نے مختصر سی مدت میں جو پرامن ماحول پیدا کیا تھا ۔ وہ رخصت ہوگیا ۔ سکھوں نے سرگرمی سے اپنی کاروائیوں کا آغاز کر دیا تھا ۔ نظم و نسق درہم برہم ہوگیا ۔ پنجاب کا وسیع علاقہ افغان فوج کے ہاتھوں پامال ہو چکا تھا ۔ ان مشکلات کے ساتھ ساتھ دہلی میں صفدر جنگ مسلسل معین کے خلاف منصوبہ بندی میں مصروف تھا ۔ چنانچہ جلد ہی معین کو دو اہم بغاوتوں سے نبرد آزما ہونا پڑا ۔ جن کے پس پردہ صفدر جنگ کا ہاتھ کام کر رہا تھا ۔

ناصر خان کی بغاوت (جولائی ۱۷۵۰ء)[2]

ناصر خاں سابق گورنر کابل احمد شاہ ابدالی کے عروج کے بعد کابل سے بھاگ کر دہلی آگیا تھا ۔ دہلی میں کسی نے اس کی پذیرائی نہ کی ۔ اس نے لاہور کا رخ کیا ۔ معین نے اس کی بڑی عزت کی ۔ اور خوش ہوا ۔ کہ ایک تجربہ کار منتظم دستیاب ہوگیا ہے ۔ معین نے اسے چہار محال کا فوجدار مقرر کر دیا اسے کہا کہ ان محال کا انتظام خوب اچھے طریقہ سے کرو ۔ ان کے محصولات کی آمدنی سے ایک فوج تیار

---

[1] گنڈا سنگھ ، احمد شاہ درانی ، ص ۷۸

[2] جادو ناتھ سرکار نے اس واقعہ کو جولائی ۱۷۴۹ء میں قرار دیا ہے (فال آف دی مغل ایمپائر جلد اول ص ۲۶۱) گپتا نے تفصیلی بحث کے بعد جولائی ۱۷۵۰ء کو درست ثابت کیا ہے (دیکھیے ، ہسٹری آف دی سکھز ، ص ۶۶ حاشیہ)

کرو ۔ ایک دو سال میں تمہارے پاس عمدہ مسلح فوج تیار ہو جائے گی ۔ اگر خدا نے چاہا ۔ تو میں تمہارا ساتھ دوں گا ۔ اور تمہیں کابل کا گورنر بنوا دوں گا ۔ احمد شاہ کو اس علاقے سے نکال دیں گے اور یہ علاقہ دوبارہ اپنی مملکت میں شامل ہو جائے گا ۔

ناصر خاں سیالکوٹ چلا گیا ۔ اور اس نے وہاں اس علاقے کا نظم و نسق سنبھال لیا ۔ وزیر دہلی صفدر بیگ نے اس سے خفیہ طور پر رابطہ قائم کر لیا ۔ اور اسے یقین دلایا ۔ کہ اگر وہ معین کو تباہ و برباد کر دے تو اسے لاہور کی نظامت مل سکتی ہے ۔ چنانچہ ناصر خاں نے اپنی فوجی جمعیت میں بھرپور اضافہ شروع کر دیا ۔ اس نے معین کے ایک ہزار مغل سپاہیوں کو بھاری تنخواہوں کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا ۔ معین کو اس کی احسان فراموشی پر بہت غصہ آیا ۔ وہ فوراً لاہور سے چند دستوں کے ساتھ نکلا ۔ اور سیالکوٹ کے قریب ناصر خاں کو شکست دی ۔ موخر الذکر ذلت و رسوائی کے ساتھ دہلی کی طرف بھاگ گیا ۔[1]

شاہنواز خان کی بغاوت (ستمبر ۱۷۵۰ء)

معین ناصر خاں کی بغاوت سے فارغ ہوا ہی تھا ۔ کہ صفدر جنگ کی ایک اور سازش اس کے اقتدار اعلیٰ کے لیے خطرہ بن گئی ۔ وزیر دہلی نے شاہنواز خان کو ملتان کا خود مختار حکمراں نامزد کر دیا ۔ اس طرح معین کا ایک اہم صوبہ اس کی حکومت سے جدا کر دیا ۔ صفدر جنگ نے شاہنواز کو اس امر پر بھی انگیخت کیا ۔ کہ وہ لاہور پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے ۔ کیونکہ یہ علاقے وراثتاً اس کا حق

---

[1] (۱) طہماس نامہ ، ص ۱۲

(۲) محمد اسلم ، فرحت الناظرین ، ایلیٹ اور ڈوسن ، ہسٹری آف انڈیا جلد ہشتم ، ص ۱۶۶

(۳) سرکار ، فال آف دی مغل ایمپائر جلد اول ، ص ۲۶۱

(۴) گپتا ، ہسٹری آف دی سکھز ، ص ۶۶ - ۶۷

ہیں۔ شاہنواز خان فوراً ملتان جا پہنچا۔ اور اپنی فوجی جمعیت مستحکم کرنا شروع کر دی۔ معین کے وہ بھگوڑے مغلیہ دستے جو ناصر خان کے ساتھ جا ملے تھے۔ اب دوبارہ معین کے پاس واپس آ گئے تھے۔ ایک بار پھر انھوں نے ابن الوقتی کا مظاہرہ کیا۔ اب شاہنواز سے جا ملے۔

پندرہ ہزار کے لگ بھگ فوج اکٹھی کر کے شاہنواز نے لاہور کا رخ کیا۔ لاہور کے قریب پہنچ کر معین سے درخواست کی کہ اسے اپنے والد کی قبر پر حاضری دینے کی اجازت دی جائے۔ معین اس کی نیت سے آگاہ نہ تھا۔ وہ اسے لاہور آنے کی اجازت دینے پر آمادہ تھا۔ مگر اس کے مشیروں نے اس کی تائید نہ کی۔ انھوں نے کہا کہ شاہنواز خاں کی غدارانہ ذہنیت سے بے خبر نہ رہنا چاہیئے۔ اس نے چالاکی اور مکاری سے اپنے بڑے بھائی کو گرفتار کر کے خود اقتدار سنبھال لیا تھا۔ چنانچہ معین نے شاہنواز سے کہا۔ کہ وہ ایک چھوٹے سے دستے کے ہمراہ شہر میں داخل ہو سکتا ہے۔ اس پر شاہنواز نے اپنے چہرے سے نقاب اتار پھینکا۔ اور کہلا بھیجا۔ کہ وہ لاہور ضرور آئے گا۔ اور صوبے پر قبضہ کرے گا۔ کیونکہ وہ اس کا حق ہے۔

معین الملک پر اس کے عزائم بے نقاب ہو چکے تھے۔ اس نے کوڑا مل کی سرکردگی میں ایک بہترین مسلح فوج اس کے خلاف روانہ کی۔ کوڑا مل نے بہت سے سکھوں کو بھی ساتھ لے لیا۔ اور شاہنواز خان کی طرف روانہ ہوا۔ دونوں فوجوں میں ملتان کے قریب زبردست تصادم ہوا۔ شاہنواز خان بہادری سے لڑا تاہم مارا گیا۔ اور اس کی فوج کی شکست ہوئی۔ اس طرح دوسری اہم بغاوت بھی دبا دی گئی۔[1] کوڑا مل کو اس کی کارکردگی کی بنا پر راجہ کا خطاب اور ملتان کی حکومت عطا کی گئی۔ ان بغاوتوں سے عہدہ برآ ہونے کے بعد معین الملک نے امن عامہ کی حالت بہتر بنانے پر توجہ مرکوز کی۔ سکھوں کے خلاف موثر کاروائیاں کی گئیں۔

---

[1] (۱) طہماس نامہ ، ص ۱۳-۱۴

(۲) سرکار ، فال آف مغل ایمپائر جلد اول ، ص ۲۱۶-۲۱۷

(۳) گپتا ، ہسٹری آف دی سکھز ، ص ۶۷-۶۸

احمد شاہ ابدالی کا تیسرا حملہ

دسمبر ۱۷۵۱ء ——— مارچ ۱۷۵۲ء

احمد شاہ ابدالی فروری ۱۷۵۰ء میں چہار محال کے سالانہ محصول کی ادائیگی کا وعدہ طے کر کے واپس چلا گیا تھا۔ پورا سال گزر گیا۔ لیکن لاہور کی طرف سے ادائیگی کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ معین نے عمداً رقم بھیجنے سے انکار نہیں کیا تھا۔ بلکہ صورت حال ہی ایسی ہو گئی تھی۔ کہ وہ کچھ بھی ادا کرنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ اس نے چہار محال کی فوجداری پر اس لیے ناصر خاں کو مقرر کیا تھا کہ یہ منجھا ہوا منتظم ہے۔ اس علاقے کا انتظام اچھی طرح سنبھالے گا۔ مگر ناصر خاں کی باغیانہ روش نے نہ صرف پہلے سال کے محاصل میں کچھ نہ دیا۔ بلکہ اس کے خلاف فوجی کاروائی پر مزید اخراجات اٹھ آئے

تاہم اس صورت حال کی ذمہ داری حکومت لاہور پر عاید ہوتی تھی۔ اس سلسلے میں کسی قسم کا عذر قابل قبول نہ ہو سکتا تھا۔ ابدالی نے راجہ سکھ جیون کو لاہور بھیجا۔ تاکہ رقم وصول کرے۔ مگر اسے معمولی رقم دے کر لوٹا دیا گیا۔ شاہ نے نئے حملہ کی تیاری شروع کر دی۔ تاہم روانہ ہونے سے پہلے اس نے مصالحت کی ایک سعی کی اور ہارون خان کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا۔ ہارون خان ۳ اکتوبر ۱۷۵۱ء کو لاہور پہنچا۔ شہر پہنچنے پر اسے نزد شاہی قلعہ اندرون مستی گیٹ سرائے حکم میں تمام آداب کے ساتھ ٹھہرایا گیا۔ ۱۰ اکتوبر کو اس نے معین سے ملاقات کی اور اسے واجبات کی فوری ادائیگی

کی ضرورت اور اہمیت کا احساس دلایا۔ معین نے مذاکرات کو طوالت دے دی۔ دوسری طرف اس نے ملتان سے کوڑا مل کو بلوا بھیجا۔ نومبر کے وسط میں کوڑا مل لاہور پہنچ گیا۔ افغان نمائندے پر واضح کر دیا گیا کہ کسی ادائیگی کا امکان نہیں ہے۔ اور وہ ابدالی کا مقابلہ کرنے کے لیئے تیار ہیں۔ ہارون خاں کو لاہور روک لیا گیا۔

ادھر ابدالی چالیس پچاس ہزار سپاہ کے ساتھ[1] ۱۲ ستمبر ۱۷۵۱ء کو کابل سے چل کر پشاور پہنچ گیا اسے ہارون خان کی مصالحتی بات چیت کے نتائج کا انتظار تھا۔ ۱۹ نومبر سے جہان خاں نے پیش قدمی شروع کر دی۔ صوبائی دارالحکومت میں افغانوں کی نقل و حرکت کی اطلاع پہنچ چکی تھی۔ اور اس سے شہر میں خاصی افراتفری پھیلنے لگی۔ لوگوں نے محفوظ مقامات کی سمت پناہ لینا شروع کر دی[2]۔ معین الملک نے اپنی تیاریاں کافی پہلے سے شروع کر رکھی تھیں۔ یہ اطلاع ملنے پر کہ جہان خاں اس کے علاقے میں داخل ہو چکا ہے۔ اس نے اپنی تیاریوں میں تیزی پیدا کر دی بھاری تعداد میں نئی بھرتی کی گئی۔ مقامی فوجدار اپنے اپنے دستوں سمیت لاہور پہنچ گئے۔ کوڑا مل کے توسط سے خاصی تعداد میں سکھ معین کے لشکر میں شامل ہو گئے۔ ان کے جتھوں کی قیادت سردار سنگت سنگھ اور سکھا سنگھ کر رہے تھے۔

اس اثناء میں ابدالی کی طرف سے ایک اور پیغام آیا۔ کہ تم نے وعدہ خلافی کی ہے۔ تین سالوں کا محصول تمہارے ذمہ واجب الادا ہے۔ اگر تم ادائیگی کر دو۔ تو میں یہیں سے واپس چلا جاتا ہوں۔ معین کو اپنی پوزیشن پر کچھ زیادہ ہی اعتماد تھا۔ اس نے لکھا کہ میں صرف ایک سال کا بقایا دے سکتا ہوں اگر تم لڑنا چاہتے ہو تو بھی میں تیار ہوں۔ معین نے نو لاکھ روپیہ ارسال کر دیا۔ احمد شاہ ابھی سندھ کے اس پار تھا۔ اس نے رقم وصول کر لی۔ تاہم پیش قدمی جاری رکھی۔ دوسری طرف یکم دو دسمبر کو جہان خاں

---

[1] طہماس نامہ، ص ۱۴

[2] گنڈا سنگھ، احمد شاہ درانی، ص ۱۰۳

امین آباد تک پہنچ چکا تھا۔ ابدالی بھی تیزی سے اس کے پیچھے پیچھے بڑھا چلا آ رہا تھا حتیٰ کہ اس نے ۳ دسمبر کو وزیر آباد کے نزدیک موضع کوٹلہ سیداں میں ڈیرے ڈال دیئے۔

معین الملک نے اپنی تیاری مکمل کرنے کے بعد ۲۹ نومبر کو لاہور کے ممتاز اولیائے کرام کے مزارات پر حاضری دی۔ اور درویشوں سے نیاز حاصل کرنے کے بعد اگلے روز راوی عبور کیا۔ لاہور سے ۴ کوس سرائے علی خان میں خیمہ زن ہوا۔ عوض خان کو لاہور میں اپنا نائب مقرر کیا۔[1] بیگمات اور دیگر اہل خانہ کو جموں کی طرف روانہ کر دیا۔ گنڈا سنگھ کے خیال میں اس قسم کے حفاظتی اقدامات سے شہریوں کے خوف و ہراس میں اضافہ ہوا۔ اور لوگوں نے بھاری تعداد میں دہلی اور محفوظ پہاڑی مقامات کا رخ کیا[2]۔

اس دوران جہان خاں کے دستوں نے چناب اور راوی کے مابین (رچنا دوآب) علاقہ کو پوری طرح نیست و نابود کیا۔ ابدالی دستے معین کے مقابل آ کر خیمہ زن ہو گئے۔ دونوں فوجوں میں جھڑپوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تاہم عام لڑائی کی نوبت نہ آئی۔ کافی دنوں تک گومگو کی صورت رہی۔ تو ایک روز ابدالی نے ایک فوجی حکمت عملی کے تحت جرأت مندانہ قدم اٹھایا۔ اس نے اپنی نقل و حرکت مخفی رکھنے کے لیے اپنا خیمہ اور کیمپ وہیں چھوڑا اور دائیں جانب سے ایک لمبا چکر کاٹ کر جنوری ۱۷۵۲ء کے وسط میں غازی پور کے گھاٹ سے دریائے راوی عبور کر لیا۔ نیاز بیگ کے راستے موضع سنجروال میں داخل ہو گیا۔ وہاں سے لاہور کی مشرقی سمت بڑھا اور شالامار کے شمال مشرق میں ڈیرے ڈال دیئے۔ اس کی افواج شاہ بلاول سے محمود بوٹی تک پھیل گئی تھیں۔ دوسری طرف جہان خاں سیدھے راستے سے پیش قدمی کر رہا تھا۔ اپنی دس ہزار سپاہ کے ہمراہ

---

[1] علی الدین نے لکھا ہے۔ "نواب ممدوح درین وقت بہ عارضہ بدنی مبتلا بود۔ بہ پیش رفتن مرعی طاقت مدید و استحکام محاربہ در جوار لاہور نمود" (عبرت نامہ، ص ۲۰۹)

[2] احمد شاہ درانی، ص ۱۰۵، نیز گپتا، ہسٹری آف دی سکھز، ص ۷۳

وہ بھی راوی پار کر آیا۔ اور فیض باغ کے قریب خیمہ زن ہوا۔

جب معین کو افغانوں کے راوی پار کرنے کی خبر ملی۔ وہ فوراً گراج گھاٹ پہنچا۔ اس کے مغل دستوں نے جن کی قیادت خواجہ مرزا خاں کے ہاتھوں میں تھی۔ فیض باغ کے قریب افغانوں پر حملہ کر دیا۔ اگرچہ مغلوں کی تعداد صرف نو سو تھی۔ تاہم انھوں نے اس تندی و تیزی کے ساتھ حملہ کیا۔ کہ افغانوں کو بھاری نقصان اٹھا کر شالامار کی طرف پسپا ہونا پڑا[1]۔ اگلے روز معین نے اپنے پچاس ہزار سوار و پیادہ اور چار سو توپیں فوری طور پر لاہور منتقل کیں۔ اور شہر کی دیواروں کے ساتھ ساتھ مورچے سنبھال لئے۔ معین نے مورچہ بندی دور دور تک پھیلا دی۔ گنڈا سنگھ نے لکھا ہے۔

The neighbourhood of Lahore was then full of beatiful gardens and archards, reminding them of the old grandeur of the capital, but they were all cut down for the purpose of entrenchments. ....and green gardens were converted into dry and dusty lands, studded with trenches all over.

دونوں فوجوں میں معمولی جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ تاہم کسی بڑی لڑائی کی نوبت نہ آئی۔ توپ خانہ نہ ہونے کی وجہ سے شہر پر عمومی حملہ ابدالی کے لیے خاصا دشوار تھا۔ دوسری طرف معین کے پاس بھی اتنی مضبوط فوج نہ تھی جو افغانوں پر حملہ کرنے کی جسارت کر سکتی۔ اس طرح جنگ تعطل کا شکار ہو گئی۔ طہماس بیگ لکھتا ہے۔ جب احمد شاہ ابدالی نے دیکھا۔ کہ اس طرح وہ معین الملک کو پریشان نہیں کر سکا۔ تو اس نے گرد و نواح کے علاقے کو تباہ و برباد کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اگلے چار ماہ تک افغان دستوں نے لاہور کے آس پاس چالیس کوس تک کا علاقہ بری طرح تباہ اور ویران کر کے رکھ دیا۔ یہ علاقہ اس شدت سے نیست و نابود کیا گیا۔ کہ میلوں تک رات کو کسی گھر میں

[1] طہماس نامہ ، ص ۱۵

[2] احمد شاہ درانی ، ص ۱۰۸

چراغ فروزاں نظر نہیں آتا تھا۔ فصلیں اُجڑ جانے سے غلے کی بڑی کمی ہو گئی[1]۔ مفتی علی الدین کے الفاظ میں۔ "جوار لاہور تا دور دور کہ دست گاہ فوج احمد شاہ بود بتاخت و تاراجی ویران و خراب کردند[2]" لاہور میں آٹا دو سیر فی روپیہ بکا۔ گھاس اور بھوسہ اس نرخ پر بھی دستیاب نہ تھے۔ مویشیوں کے لیے چارہ عنقا ہو گیا[3]۔

تعطل کی یہ صورت حال ڈیڑھ ماہ تک رہی۔ معین کو دہلی سے کمک کی توقع تھی۔ ابدالی کے حملے کی خبر سننے کے بعد مغل بادشاہ نے کئی بار اپنے وزیر صفدر جنگ کو لکھا۔ کہ وہ احمد خان بنگش اور سعد اللہ خاں روہیلہ کے خلاف مہمات ختم کر کے فوری طور پر دارالحکومت پہنچ جائے۔ لیکن صفدر جنگ معین کی مدد کرنے کی بجائے اسے تباہ ہوتے دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس نے روہیلوں کے خلاف مہم ختم کر کے مرہٹہ حلیفوں کو منتشر کر دیا۔ اور اپنے صوبے اودھ کی طرف چلا گیا۔ دہلی سے کمک کی امیدیں خاک میں ملنے کے بعد معین نے ایک جنگی مشاورت طلب کی۔ تاکہ افغانوں کے خلاف کوئی منصوبہ بندی کی جا سکے۔ اس مجلس میں معین کے علاوہ راجہ کوڑا مل، آدینہ بیگ خان، بھکاری خان اور میر مومن شریک ہوئے۔ معین کے امراء میں کافی اختلاف رائے تھا۔ بھکاری خان نے ہر قیمت پر امن کی وکالت کی۔ مومن خان کا رویہ بھی امن اور جنگ کے بین بین تھا۔ آدینہ بیگ نے خیال ظاہر کیا۔ کہ دہلی سے کسی قسم کی امداد کی توقع نہیں ہے لہذا بیشتر اس کے کہ چند دن تک مزید محاصرہ جاری رہنے کی صورت میں ضروریات زندگی ختم ہو جائیں، حملہ کر دینا چاہیئے۔ اور موجودہ قلعہ بندی کی صورت حال ختم کر کے کھلے میدان میں لڑائی لڑی جائے۔

کوڑا مل نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ اس نے واضح کیا۔ کہ ہماری فوجوں کی افغانوں

[1] طہماس نامہ ، ص ۱۵-۱۶

[2] عبرت نامہ ، ص ۲۱۰

[3] گنڈا سنگھ ، احمد شاہ درانی ، ص ۱۰۸ - ۱۰۹

کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔ لیکن چونکہ آس پاس کا سارا علاقہ تباہ و برباد ہو چکا ہے۔ لہذا افغان جلد یا بدیر ضروریات زندگی کی کمی کا شکار ہوں گے اور بیس روز تک موسم گرما کی حدت اتنی ضرور ہو جائے گی۔ کہ شاہ کے دستوں کے لیے میدانی علاقوں کی دھوپ اور ہوا ناقابل برداشت ہو جائے گی۔ چنانچہ وہ یا تو واپسی پر مجبور ہو جائیں گے۔ یا اپنے ناسازگار حالات کے پیش نظر حملہ کریں گے[1] جنگی نقطۂ نگاہ سے کوڑا مل کی تجویز حسب سے موزوں تھی۔ مگر معین نے آدینہ بیگ کے مشورے کو اپنے ذہن سے ہم آہنگ پایا۔ چنانچہ اس نے فوری طور پر افغانوں سے دو دو ہاتھ کرنے کا فیصلہ کر لیا

۵ مارچ ۱۷۵۲ء کی صبح معین نے اپنی فوج کو حملہ کے لئے تیار کیا۔ مدار المہام بھکاری خان میر مومن خان اور خنجر خان کو ہراول دستوں کی قیادت سونپی گئی۔ دایاں بازو آدینہ بیگ اور بایاں سید جمیل الدین اور محمد خان کو سونپا گیا۔ عقب میں مہدی علی خاں، راجہ بہارا مل بندھیلہ اور میر امان اللہ خان متعین کئے گئے۔ ابدالی کو صورت حال کے ایک ایک لمحے کی خبر پہنچ رہی تھی۔ اس نے بھی فوج کو مرتب کیا۔ ہراول دستہ میں برخوردار خان دیوان بیگی اور عبدالصمد خٹک تھے۔ دایاں بازو شاہ ولی خان کے پاس تھا۔ عقب میں اورک زئی سردار محمد سعید خان اور اللہ یار خاں تھے۔

لڑائی شروع ہوئی۔ افغان فوج کے دائیں بازو نے آدینہ بیگ کا حملہ روکا۔ برخوردار خان

---

[1] (۱) گنڈا سنگھ، احمد شاہ درانی، ص ۱۱۰-۱۱۱

(۲) باقر، آدینہ بیگ خان، ص ۱۵

طہماس بیگ نے لکھا ہے۔ کہ معین دشمن کے خلاف پیش قدمی کرنے والا تھا۔ کہ آدینہ بیگ نے مشورہ دیا۔ کہ ایک ہفتہ مزید انتظار کر لیا جائے۔ میرا خیال ہے کہ حریف واپسی کی فکر میں ہے۔ کوڑا مل نے رائے دی۔ کہ ہمیں مورچہ بندی کی موجودہ پوزیشن چھوڑ کر ۵ کوس اوپر کی طرف چلے جانا چاہیئے۔ کیونکہ کیمپ اور مورچوں کی فضا غیر صحت مندانہ ہو چکی ہے۔ معین نے یہ تجویز پسند کی اور فوری طور پر شمال کی طرف منتقل ہو جانے کا منصوبہ بنایا (طہماس نامہ، ص ۱۶)

اور عبدالصمد خان نے بھکاری خاں کی پیش قدمی روکی۔ اور انھیں پیچھے دھکیل دیا۔ انھوں نے عقب میں متعین مہدی علی خاں سے مدد مانگی۔ وہ فوری طور پر پہنچ گیا۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد افغانوں کے قدم اکھڑنے لگے۔ چند نمایاں افغان سردار مارے گئے۔ لاہور کی فوجوں کا دباؤ جاری تھا۔ کہ شام ہو گئی اور لڑائی بند ہو گئی۔

اپنی فوجی منصوبہ بندی کو ناکام ہوتے دیکھ کر ابدالی نے راتوں رات ایک نئی حکمت عملی اختیار کی اور اپنے دستوں کو شمالی جانب بارہ کوس تک پیچھے لے گیا۔ تاکہ از سر نو منصوبہ بندی کر کے میدان میں آئے۔ افغان اس خفیہ انداز میں منتقل ہوئے کہ دس روز تک معین کے افراد اس کی خبر ہی نہ پا سکے۔ گیارھویں روز انھیں ابدالی کی نئی پوزیشن کے بارے میں خبر ملی۔

ابدالی نے ابھی تک صلح کے امکانات کو مسترد نہیں کیا تھا۔ انہی دنوں اس نے شاہ غلام محمد فاروقی، جہاں خان کے مرشد اور مفتی عبداللہ پشاوری کو معین کے پاس بھیجا۔ معین مذاکرات کے لیے تیار نہ تھا۔ اس سفارت کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ موقع کی نزاکت نے پیش نظر کیا جا سکتا ہے۔ کہ سفارت بنیادی طور پر معین کی توجہ ہٹانے اور اس کی فوجی تیاری کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے روانہ کی گئی۔

معین نے بھی از سر نو اپنی فوجی حکمت عملی مرتب کی۔ اور شہر سے باہر نکل کر شالامار باغ کے شمال مشرق میں ایک پرانے اینٹوں کے بھٹے کو اپنی دفاعی لائن کا محور بنا کر دیا۔ توپیں نصب کیں۔ ایک بار ناظم نے اپنی فوج حسب ذیل انداز پر ترتیب دی۔

دایاں بازو - آدینہ بیگ خان، میر مومن خان، خنجر خان اور میر نعمت خان

بایاں بازو - بھکاری خان، سید جمیل الدین احمد، فرید الدین خان اور خلف محمد خان۔

قلب - میر معین الملک بذات خود

عقب - مہدی علی خان، راجہ بہارا مل بندھیلا اور جموں، جسرونتہ، کانگڑہ اور ہری پور کے پٹھاری راجے۔ کوڑا مل کو خاص طور پر جہاں خان کے خلاف مقرر کیے گئے

دستوں کی کمان کرنا تھی[1]

اس دوران ابدالی راوی کے کنارے کنارے لاہور کی طرف آگیا اور محمود بوٹی کا دل کے میدانوں میں خیمہ زن ہوا۔ افغانوں نے فوراً معین کی فوج پر حملہ کر دیا۔ ابدالی نے گھڑ سوار دستوں سے خاص طور پر کام لیا۔ انھوں نے کامیابی سے معین کے دستوں کو روندا۔ اور مدافع سپاہ کو مورچوں میں پناہ لینا پڑی۔ ابدالی نے توپ خانہ سے محرومی کے اثرات کو بڑے عمدہ انداز میں ہموار کر لیا۔

اس مرحلے پر آدینہ بیگ نے تجویز پیش کی۔ کہ کوڑا مل کو ایک دستے کے ہمراہ آگے بھیجا جائے۔ تاکہ ایک ٹھوس اور بھرپور حملے کا آغاز کیا جا سکے۔ کوڑا مل نے جواباً پیغام بھیجا۔ کہ اگر اس کی پوزیشن میں تبدیلی کی گئی۔ تو اس کے دستوں پر اس کا اچھا اثر مرتب نہ ہوگا۔ معین نے اسے اپنے پاس طلب کیا۔ کوڑا مل اپنے نائبوں کو مقرر کر کے ہاتھی پر معین کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے ابھی ایک کوس فاصلہ طے کیا تھا۔ کہ اسے اطلاع ملی۔ کہ افغانوں نے اس کے دستے پر حملہ کر دیا ہے۔ اور اس کے سپاہیوں نے بھاگنا شروع کر دیا ہے۔ وہ جلدی سے واپس مڑا اور صورت حال اپنے قابو میں کر لی۔ اس کے ساتھ ہی لاہوری فوجوں نے عام حملہ کر دیا۔ عقب پر متعین افران نے فوری اور موثر کمک فراہم کی۔ کامیاب انداز میں پیش قدمی جاری تھی۔ کہ کوڑا مل کے ہاتھی کا پاؤں ایک خستہ قبر پر پڑ گیا۔ اور وہ دھنس گیا۔ عین اس وقت ایک گولہ لگنے سے کوڑا مل مارا گیا[2]

لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا۔ افواج لاہور آگے بڑھتے ہوئے قدم پسپائی پر مجبور ہو گئے۔ سارا دباؤ

---

[1] گنڈا سنگھ، احمد شاہ درانی، ص ۱۱۳

[2] (۱) گنڈا سنگھ، احمد شاہ درانی، ص ۱۱۴

(۲) مصنف فتوح الناظرین نے آدینہ بیگ پر الزام لگایا ہے۔ کہ اس نے کوڑا مل کو مروایا تھا (دیکھئے ایلیٹ اینڈ ڈوسن، ہسٹری آف انڈیا جلد ہشتم، ص ۱۶۸)

علی الدین نے بھی اسی قسم کی روایت بیان کی ہے (عبرت نامہ، ص ۲۰۰)

بھکاری خان اور معین الملک پر آپڑا۔ آدینہ بیگ اپنی جگہ سے پسپا ہو کر شہر کی طرف آگیا۔ ابدالی نے ایک بار پھر گھڑ سوار دستوں کو میدان میں استعمال کیا۔ انھوں نے مضطرب اور بدحال لاہوری فوج کو زبردست پریشان کیا[1]۔ معین بدستور میدان میں ڈٹا رہا۔ اس نے نمازیں میدان جنگ ہی میں ادا کیں اور اپنے جوانوں کا حوصلہ بڑھاتا رہا۔ اب اس کے آس پاس صرف دس ہزار سپاہی رہ گئے تھے[2]۔

رات کو دونوں فوجیں اپنے اپنے مورچوں میں چلی گئیں۔ معین کے ساتھیوں نے کئی تجاویز پیش کیں۔ کچھ نے مشورہ دیا۔ کہ دہلی کی طرف نکل جانا چاہیئے۔ کچھ نے رائے دی۔ کہ پہاڑیوں میں پناہ لی جائے۔ لیکن معین نے تمام تجاویز مسترد کر دیں۔ اور اعلان کیا۔ میں شہر میں قلعہ بند ہو کر جنگ جاری رکھوں گا[3]۔

چنانچہ معین شہر کی طرف آگیا۔ اور دفاعی تیاریاں شروع کر دیں۔ مختلف مقامات پر دستے متعین کیئے گئے اور توپیں نصب کرائی گئیں۔ اگلے روز صبح ابدالی نے شہر کو گھیرے میں لے لیا۔ نواحی علاقوں کو جن کی حالت پہلے ہی ابتر تھی، تباہ و برباد کر دیا گیا۔

ابدالی کا خیال تھا۔ کہ معین کھلے میدان میں مات کھانے کے بعد ہتھیار ڈال دے گا۔ مگر معین قدم قدم پر مدافعت کر رہا تھا۔ ابدالی اس صورت حال سے بڑا پریشان تھا۔ اس نے شاہ ولی خاں، جہاں خاں، شاہ غلام پیرزادہ اور مفتی عبداللہ پشاوری کو ایک خط دے کر معین کے پاس روانہ کیا۔ خط میں لکھا کہ چار ماہ سے طرفین کے مسلمان مارے جا رہے ہیں۔ اب تم نے مزید لڑائی کا اہتمام کر لیا ہے۔ اس کا نتیجہ مزید مسلمانوں کی ہلاکت کی صورت میں رونما ہوگا۔ خدا اور اس کا رسول

---

[1] گزٹیئر لاہور ڈسٹرکٹ میں لڑائی کی تفصیل بیان کرنے کے بعد لکھا ہے۔ کہ اس علاقے میں اب تک انسانی ہڈیاں ملتی ہیں۔ ص ۳۶

[2] طہماس نامہ، ص ۱۶

[3] ایضاً

اس امر کو پسند نہیں کرتے۔ تم اپنے نمائندے بھیجو۔ اور بات چیت کرو۔ تم خود بھی بلا جھجک میرے پاس آسکتے ہو۔[1]

معین نے یہ پیشکش قبول کرلی۔ اور خود ذاتی طور پر ابدالی کے پاس جانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کے امرا نے کہا۔ کہ اس طرح چلے جانا مصلحت کے خلاف ہے۔ تاہم معین نے پرواہ نہ کی۔ ابدالی کے کیمپ میں اس کی خوب پذیرائی ہوئی۔ ابدالی اس سے مل کر بہت خوش ہوا۔ اور اس کی تعریف کی۔

"بعدہ احمد شاہ فرمود۔ کہ اگر ما بدولت ایں طور بدست شما می آمدیم، شما با من چہ سلوک در پیش می آوردید؟" نواب عرض کرد۔ کہ خنجرہ آہنی انداختہ بحضور پادشاہ خود می رسانیدم۔ بادشاہ باستماع ایں معنی فرمود۔ کہ حیف باریاں پادشہ کہ برائے ایں چنیں مرد نمک حلال استمداد ننمود۔ باز شہ فرمود۔ حالا کہ شما بدست من گرفتار آمدہ اید بشما چہ پاداش گستاخی و ہنگامہ آرائی و قتل صدہا مردان بدہم؟ نواب در آں جواب عرض کرد۔ کہ اگر تاجری زر بگیر و اگر ظالمی قتل کن و اگر پادشاہی بہ بخش"[2]

ابدالی معین کی دلیری سے خوش ہوا۔ لاہور کو امان دے دی گئی۔ تاہم اس دوران خاصی لوٹ مار مچائی جاچکی تھی۔ جنگ کے دوران صرف ۲ ہزار افراد مارے گئے۔ جب کہ جنگ کے بعد شہر میں پانچ ہزار افراد موت کے گھاٹ اتر گئے۔ شاہ نے دہلی کی طرف جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ تاہم معین کی درخواست پر ارادہ منسوخ کردیا۔

ابدالی نے معین کو اپنی طرف سے پنجاب کی حکومت پر بحال رکھا۔ معین تین روز تک افغان کیمپ میں رہا۔ واپسی پر ابدالی کو پیش کرنے کے لئے رقم اکٹھی کی گئی۔ پانچ روز بعد معین اور

---

[1] (۱) طہماس نامہ، ص ۱۷

(۲) گنڈا سنگھ، احمد شاہ درانی، ص ۱۱۶

[2] علی الدین، عبرت نامہ، ص ۲۱۰-۲۱۱

بھکاری خاں دونوں نے چھ لاکھ روپیہ پیش کیا۔ ایک رسمی معاہدہ طے پایا۔ جس کی رو سے مجموعی طور پر معین کو ۳۰ لاکھ روپیہ[1] ادا کرنا تھا۔

دس لاکھ	جان بخشی کے لیے
دس لاکھ	حکومت پنجاب پر بحالی کے لیے اور
دس لاکھ	باقی ہندوستان کو حملے سے بچائے جانے کے لیے

چنانچہ معین نے طوعاً و کرہاً ۲۶ لاکھ روپیہ ادا کردیا۔ اور باقی ۴ لاکھ کے بارے میں وعدہ کیا کہ ابدالی کے دریائے سندھ پہنچنے تک بھیج دیا جائے گا۔[2]

تاوان کے اس معاہدے کے علاوہ معین اور ابدالی میں حسب ذیل معاہدہ طے پایا۔

۱۔ لاہور اور ملتان کے صوبے احمد شاہ ابدالی کی افغان حکومت کا حصہ متصور ہوں گے۔

۲۔ معین الملک، ابدالی کی طرف سے ان صوبوں کا ناظم رہے گا۔

۳۔ یہ علاقے اندرونی معاملات میں کامل خود مختار ہوں گے۔ فالتو محاصل افغانستان بھیج دیئے جائیں گے۔

۴۔ زیادہ اہم امور میں افغان بادشاہ کا فیصلہ ضروری ہوگا۔

ابدالی نے اپنا نمائندہ قلندر بیگ دہلی بھیجا تاکہ اس معاہدہ کی شاہ دہلی سے توثیق کرائے۔ یکم اپریل ۱۷۵۲ء کو وہ دہلی پہنچا۔ ۶ اپریل کو شاہ سے ملاقات کی۔ دہلی کے حکام نے اس کو بغیر کسی ذہنی تحفظ کے منظور کرلیا۔ ۱۳ اپریل کو قلندر خان دہلی سے چل کر ۲۰ اپریل کو لاہور پہنچا۔ اور ۲۱، ۲۲ اپریل کو احمد شاہ ابدالی نے واپسی کا سفر اختیار کیا۔

ابدالی کے ان حملوں نے پنجاب کو زبردست انتظامی اور مالیاتی بحران سے دوچار کردیا۔

---

[1] علی الدین نے پچاس لاکھ لکھا ہے۔ عبرت نامہ، ص ۲۱۱

[2] گنڈا سنگھ، احمد شاہ درانی، ص ۱۲۰

ایک اعتبار سے پنجاب نے یہ اہم کارنامہ انجام دیا۔ کہ ابدالی کو ستلج سے پار نہ جانے دیا۔ اور اس طرح دربار دہلی کی سازشوں کا شکار بدنصیب صوبہ پنجاب بھاری قربانیاں دے کر دہلی کو محفوظ کرتا رہا۔ پنجاب کی طرف سے یہ آخری مدافعانہ لمحات تھے۔ بعد میں ابدالی جب بھی ہندوستان آیا۔ دہلی تک کوئی قوت اس کے راستے میں حائل ہونے کی جرأت نہ کرسکی۔ یہ معین الملک کی زبردست فراست اور دور اندیشی تھی۔

زیر بحث دور میں سکھوں کا کردار بھی بہت اہمیت کا حامل رہا ہے۔ ان کی سرگرمیوں کو ساتھ ساتھ بیان کرنے کی بجائے ان کے لیئے علیحدہ باب مختص کیا جاتا ہے۔

باب : ۹

سکھ (۳)

دل خالصہ کا قیام اور معین الملک

۱۷۴۷ء ـــــــ ۱۷۵۳ء

بیان کیا جاچکا ہے۔ کہ سکھوں نے شاہنواز خان کے برسر اقتدار آنے کے بعد لوٹ مار کی سرگرمیوں میں کمی کردی تھی۔ اور پر امن طور پر اپنی طاقت بڑھانے میں مصروف ہو گئے تھے۔ سیاسی حالات نے بہت جلد نئی کروٹ لی۔ نومبر ۱۷۴۷ء میں احمد شاہ ابدالی کی آمد آمد کی خبر گرم ہوئی۔ سکھ اس قسم کے مواقع کی تاک میں رہتے تھے۔ انھوں نے ایک بار پھر ہتھیار اٹھالیئے۔ اپنے اپنے اہل و عیال کو دوسرے لوگوں کی طرح جموں، چھمب، کانگڑہ اور ہوشیارپور کی طرف پہنچا دیا تھا۔ اب انھوں نے اپنے پرانے انداز میں کارروائیوں کا آغاز کردیا۔ سرکاری افواج اور مقامی حکام افغان حملے سے نمٹنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ سکھوں کی راہ میں کوئی راہ رکاوٹ حائل نہ ہوئی وہ پورے پنجاب میں پھیل گئے۔ باری دوآب کا شمالی علاقہ ان کی یلغار کا خاص ہدف بنا۔ مالکم لکھتا ہے۔

Encouraged by the confusion which took place at the first Afghan invasion, the Sikhs made themselves master of a considerable part of the Do-aab

of Ravi and Jalandhar, and extended their incursions to the neibouring countries.[1]

ابدالی کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد شاہنواز خاں نے تو دہلی کی راہ لی ۔ البتہ آدینہ بیگ اپنے دستوں کے ہمراہ جموں اور راجپور کی طرف نکل گیا۔ ابدالی کے قیام ہند کے دوران وہ اسی علاقے میں رہا۔ یہاں متعدد سکھ سرداروں سے اس کی جھڑپیں ہوئیں ۔ گنڈا سنگھ بھنگی ، جسا سنگھ رام گڑھیا ، حقیقت سنگھ کا ہنیا ، جے سنگھ کا ہنیا اور امر سنگھ کنگرہ سے اس کے کئی تصادم ہوئے اور اس نے ان سب کو شکست دی۔[2]

ابدالی کو منو پور کے مقام پر دہلی کی شاہی فوجوں کے ہاتھوں ۱۱ مارچ ۱۷۴۸ء کو شکست ہوئی ۔ افغانوں نے تیزی سے واپسی کی راہ لی ۔ سکھ موقعے کی تاک میں تھے ۔ انھوں نے پنجاب میں سے گزرتی ہوئی شکست خوردہ فوج پر جا بجا چھاپہ مار حملے کئے ۔ اور اسے خاصا پریشان کیا ۔ افغان فوج نے ۷ ار مارچ کو ستلج پار کیا ۔ اور لاہور سے اپنا مال و اسباب لے کر افغانستان کی طرف تیزی سے روانہ ہوئی ۔ گپتا لکھتا ہے۔

They fell upon his rear-guard at many places till he reached the Chanab, acquiring good booty in the shape of baggage, arms, camels and horses.[3]

سنہا نے لکھا ہے ۔ کہ چڑھت سنگھ کی احمد شاہ ابدالی سے جھڑپ ہوئی ۔ اور ابدالی کا کچھ مال غنیمت اس کے ہاتھ آیا۔[4]

---

[1] سکیچ آف دی سکھز ، ص ۹۱

[2] (۱) احوال آدینہ بیگ خان ، ورق ۵۲ ب

(۲) محمد باقر ، آدینہ بیگ خان ، ص ۱۴ ، لاہور ۱۹۳۶ء

[3] ہسٹری آف دی سکھز ، ص ۴۵

[4] این ۔ کے ۔ سنہا ، رائز آف دی سکھ پاور ، ص ۲۳

ابدالی کی ہندوستان میں موجودگی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی افراتفری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سکھوں نے اپنی تنظیم نو کی طرف سب سے زیادہ توجہ دی ۔ اس سے پہلے ۱۷۴۵ء میں وہ خود کو پچیس چھوٹے چھوٹے دستوں میں منقسم کر چکے تھے ۔ اب تک یہ دستے سرگرم عمل رہے تھے ۔ تاہم انھیں اپنی پوری فوجی جمعیت متحد کرنے کا موقع نہ مل سکا تھا ۔ مذہبی تقاریب میں عارضی طور پر وہ تمام ضرور جمع ہوتے ۔ تاہم وہ کسی ایک کمان کے تحت نہیں تھے ۔ نصف صدی کی تربیت نے انھیں پیدائشی جنگجو بنا دیا تھا ۔ اب پوری سکھ قوم ایک مارشل ریس کی حیثیت اختیار کر چکی تھی ۔ کوگل چند نارنگ لکھتا ہے ۔

Khalsa had know become a state, a power to be reckoned with, and though often beaten it was destined to shake the Mughal power to its foundations and build its own sovereignty on its ruins.[1]

اس وقت تک سکھوں کے اندر چھوٹے چھوٹے سرداروں کی ایک بھاری کھیپ موجود تھی ۔ ہری رام گپتا نے مندرجہ ذیل پینسٹھ سرداروں کے نام تحریر کئے ہیں ۔

ہری سنگھ بھنگی ، جھنڈا سنگھ ، گنڈا سنگھ ، نتھا سنگھ ، گلاب سنگھ ، چڑھت سنگھ ، دیوان سنگھ ، گوجر سنگھ ، کرجا سنگھ ، نبوہا سنگھ (پنجواڑ) لہنا سنگھ (مصطفیٰ آباد) پھولا سنگھ (روڑانوالہ) ، سانول سنگھ رندھاوا (دھاگا) گوربخش سنگھ (ڈوڈا) ، دنبہ سنگھ (کلال والا) ، تارا سنگھ (چین پور) باغ سنگھ (گاؤں سید محمود) حقیقت سنگھ ، متاب سنگھ ، (گاؤں سید محمود) ، جے سنگھ ، جھنڈا سنگھ ، نارا سنگھ ، منوہر سنگھ (کاہنہ) سوبھا سنگھ (بھیکہ) نواب کپور سنگھ (فیض اللہ پور) ، بھگیل سنگھ (جھابل) گلاب سنگھ ڈالیوالیہ ، ہری سنگھ ڈالیوالیہ ، سوبھا سنگھ ، بھیم سنگھ (کاہنہ) ،

---

[1] ٹرانسفارمیشن آف سکھزم ، ص ۱۳۶

امرسنگھ باگھا، جسا سنگھ اہلووالیہ، نودھ سنگھ سکرچکیہ، گلاب سنگھ، جہناب سنگھ، کروڑا سنگھ، ہاردسنگھ، لجا سنگھ، نند سنگھ سنگھانیا، کپور سنگھ سوریانوالہ، امرسنگھ کنگرہ، صاحب سنگھ (قلعہ جیون سنگھ) جیون سنگھ، دیپ سنگھ، نتھا سنگھ شہید، موہر سنگھ رانیاں والا، جہان سنگھ رانیانوالہ، باغ سنگھ (لانکا فرانکیا) جھنڈا سنگھ سلطانونہ، مرزا سنگھ کاہلون، شام سنگھ مان (بلاقی چک)، مالا سنگھ (بلاقی چک) باہل سنگھ، امیر سنگھ (شیخوپورہ) ہیرا سنگھ، گنگا سنگھ، لال سنگھ، امرسنگھ، جہناب سنگھ روپ سنگھ، انوپ سنگھ نکئی، دسوندھا سنگھ، نارا سنگھ کمبیہ، دھرم سنگھ کھتری (امرت سر) سکھا سنگھ (ماڑی)[1]

۲۹ مارچ ۱۷۴۸ء کو بیساکھی کے موقع پر تمام سکھ امرت سر میں جمع ہوئے۔ سنہا نے اس اجتماع کی تعداد چھ سات ہزار بیان کی ہے[2]۔ اس موقعہ پر نواب کپور سنگھ نے پنتھ کے استحکام کے لئے اجتماع کی ضرورت پر زور دیا۔ جسا سنگھ اہلووالیہ کو تمام سکھ فوجوں کا کمانڈر مقرر کیا۔ اور اس طرح پوری جنگجو برادری کو دل خالصہ کا نام دیا گیا۔ ان پینسٹھ سرداروں میں گیارہ سردار نمایاں اہمیت کے حامل تھے۔ چنانچہ گیارہ بڑے جتھے بنائے گئے۔ ہر ایک دستے کا اپنا امتیازی نشان اور جھنڈا مقرر ہوا۔

ان گیارہ جتھوں اور ان کے سرداروں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ اہلووالیہ جتھا۔ اس کی قیادت جسا سنگھ اہلووالیہ کے ہاتھ میں تھی۔ جو سکھوں کا عمومی قائد بھی تھا۔ جسا سنگھ لاہور کے قریب واقع موضع اہلو سے تعلق رکھتا تھا۔

۲۔ فیض اللہ پوریا، یا سنگھ پوریا جتھا:۔ نواب کپور سنگھ اس کا سردار تھا۔ نواب کا تعلق موضع فیض اللہ پور سے تھا۔ بعدازاں اس کا نام بدل کر سنگھ پور رکھ دیا گیا۔

۳۔ سکرچکیہ جتھا:۔ گوجرانوالہ کے گاؤں سکرچک کا نودھ سنگھ اس جتھے کا سردار تھا۔

---

[1] ہسٹری آف دی سکھز، ص ۴۸۔۴۹۔

[2] رائز آف دی سکھ پاور، ص ۲۲

۴۔ نشان والہ جتھا:۔ اس کا قائد دسوندھا سنگھ تھا۔

۵۔ بھنگی جتھا:۔ ہیرا سنگھ بھنگی اس دستے کا سردار تھا۔

۶۔ کاہنیا جتھا:۔ لاہور کے نواحی گاؤں کاہنہ کا رہنے والا جے سنگھ کاہنیا اس کا سردار تھا۔

۷۔ نکئی جتھا:۔ ضلع لاہور کی تحصیل چونیاں کے گاؤں باہووال کا ہیرا سنگھ نکئی اس جتھے کا سردار تھا۔

۸۔ ڈالیوالیہ جتھا:۔ کنار راوی ڈیرہ بابا نانک کے نواحی موضع ڈالیوال کا گلاب سنگھ اس کا سردار تھا۔

۹۔ دیپ سنگھ کا جتھا:۔ بعد میں یہ شہیدی جتھا کے نام سے موسوم ہوا۔

۱۰۔ کروڑا سنگھیا جتھا:۔ پنج گڑھ کا کروڑا سنگھ اس کا سردار تھا۔

۱۱۔ نند سنگھ سنگھیانیا:۔ جو بعد میں رام گڑھیا جتھا کہلایا[1]

دل خالصہ کی تشکیل سکھوں کی تاریخ میں بے حد اہمیت کی حامل ہے۔ نصف صدی تک انفرادی طور پر نبرد آزما رہنے والے جنگجو اب ایک وحدت کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ ان دنوں سیاسی فضا پہلے سے کہیں زیادہ ان کے لئے سازگار تھی۔

معین الملک اور سکھ

سکھوں کو توقع تھی۔ کہ دہلی کی طرف سے پنجاب کی نظامت پر کسی کمزور شخص کا تقرر کیا جائے گا۔ اور اب انھیں کھل کھیلنے کا موقع مل سکے گا۔ لیکن معین الملک کی تقرری نے ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اپریل ۱۷۴۸ء میں نئے ناظم نے اپنا عہدہ سنبھال لیا۔ سکھوں نے اس وقت تک اپنی تعداد بہت بڑھالی تھی۔ اور فوجداروں سے جھڑپوں کا آغاز کر دیا تھا[2]۔

---

[1] گپتا، ہسٹری آف دی سکھز، ص ۵۰۔۵۲

[2] (۱) سنہا، رائز آف دی سکھ پاور، ص ۲۴

(۲) نارنگ، ٹرانسفارمیشن آف سکھزم، ص ۱۳۷

معین نے سب سے پہلے امن و امان کی بحالی پر اپنی توجہ مرکوز کی۔ سکھ امن عامہ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ چنانچہ مئی جون ۱۷۴۸ء میں ان کے خلاف تادیبی دستے بھیجے گئے۔ سکھ منو پور میں اس کی شجاعت اور دلیری کا ذکر سن چکے تھے۔ اس لئے وہ اس سے خاصے مرعوب تھے۔ انھوں نے اس کے دستوں کا مقابلہ کرنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ اور راہِ فرار اختیار کرنا شروع کی۔ باری دوآب خالی کر کے جالندھر دوآب میں داخل ہو گئے۔ جہاں آدینہ بیگ فوجدار تھا۔ معین نے اسے سخت احکامات بھیجے۔ کہ سکھوں کے خلاف موثر کاروائی کی جائے۔

آدینہ بیگ نے با دلِ ناخواستہ ان کے خلاف فوج کشی کی۔ بھرپور مجادلہ ہوا جس میں فریقین کا بھاری جانی نقصان ہوا۔ اگرچہ چھ سو سکھ مارے گئے۔ تاہم ان کی عددی اکثریت کی وجہ سے آدینہ بیگ کو پسپا ہونا پڑا۔ اور اُس نے معین سے کمک مانگی۔ اس دوران بارشیں شروع ہو گئیں اور تین ماہ تک (جولائی، اگست، ستمبر) کوئی کاروائی ممکن نہ ہوئی۔ اکتوبر میں جب موسم برسات کے اثرات محو ہو چکے تھے۔ میر معین الملک بذاتِ خود فوجی دستے لے کر لاہور سے نکلا۔ اس دوران سکھ دیوالی کے موقعہ پر امرتسر میں جمع ہو چکے تھے۔ ہنگامی حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے انھوں نے پانچ سو افراد قلعہ رام راونی میں متعین کر دئے تھے۔ باقی نواحی جنگلوں میں چھپ گئے تھے۔ آدینہ بیگ بھی معین سے آملا۔ انھوں نے امرتسر پہنچ کر رام راونی کا محاصرہ چار ماہ تک جاری رکھا۔ روزانہ جھڑپیں ہوئیں۔ اس دوران دو سو سکھ مارے گئے۔ جسا سنگھ ٹھوکا در جو رام گڑھیا ان دنوں آدینہ کا ملازم تھا۔ سکھوں نے اسے پیغام بھیجا۔ کہ اگر آج تو ہماری مدد نہ آیا۔ تو تجھے پنتھ سے خارج کر دیا جائے گا۔ اس پر جسا سنگھ آدینہ بیگ کا ساتھ چھوڑ کر سکھوں سے آملا۔ اور ان کی حالت قدرے بہتر ہو گئی۔ اب جسا سنگھ نے کوڑا مل دیوان کو پیغام بھیجا۔ کہ تمہاری کوشش سے تین سو افراد کی جان بچ سکتی ہے۔ کوڑا مل نے معین سے درخواست کی۔ کہ سکھ ہمیشہ بدامنی اور انتشار پیدا کرتے ہیں۔ اگر ان کے ساتھ تصفیہ کر لیا جائے۔ تو وہ اس طرز عمل سے باز آجائیں گے۔ بعد میں اگر یہ کوئی گڑبڑ کریں۔ تو اس کی ذمہ داری میں اٹھاتا ہوں۔

آدینہ بیگ نے اس طرز فکر کی شدید مخالفت کی۔ اور سکھوں کے ساتھ نرم سلوک کو ازحد نقصان دہ قرار دیا۔[1] تاہم معین نے کوڑا مل کا مشورہ پسند کیا۔ جارج فورسٹر لکھتا ہے۔

Meer Munnoo ...... made a vigourous attack no them and it was supposed that their force would then have been annihilated, had not thus people found a strenuous advocate in his minister Kora Mal. who was himself of the Khalsa sect, and diverted Meer Munnoo from reaping the full fruits of the superiority be had gained.[2]

معین نے کوڑا مل کی تجویز پر سکھوں کو پرگنہ پٹی کے محاصل میں سے ¼ دینے کا اعلان کیا۔ اور محاصرہ ختم کر کے لاہور کی راہ لی۔ بہت سے سکھوں نے کوڑا مل کی ملازمت اختیار کر لی۔ اور ایک بار پھر انھوں نے پرامن رہنے کا عہد کر لیا۔[3] سنہا نے اس قسم کی کسی صلح کا ذکر نہیں کیا۔ اور لکھا ہے۔ کہ تقریباً ہر ماہ سکھوں کے خلاف متحرک دستے بھیجے جاتے تھے۔ سکھ مقابل آکر لڑنے سے گریز کرتے لیکن پرگنوں کو تباہ و برباد اور غارت کرتے۔ جب بھی سرکاری دستے ان کا تعاقب کرتے سکھ یا تو کسانوں کی طرح زندگی شروع کر دیتے یا پہاڑیوں اور جنگلوں کی طرف فرار ہو جاتے۔ جب ناظم کے دستے واپس جاتے۔ وہ اپنی غارت گری کا آغاز کر دیتے۔ تاہم معین نے ان اقدامات کے نتیجے میں ایک سال کے اندر شاہراہیں اور راستے محفوظ ہو گئے اور بہت سے سکھوں نے پرامن زندگی اپنائی۔[4] نارنگ کے ہاں بھی اسی طرح کا بیان ہے۔[5]

---

[1] گپتا، ہسٹری آف دی سکھز، ص ۶۰-۶۱

[2] جرنی فرام بنگال ٹو انگلینڈ۔ ۳۱۴

[3] گپتا، لیٹر مغل ہسٹری آف دی پنجاب، ص ۷۵

[4] سنہا، رائز آف دی سکھ پاور، ص ۲۲۔

[5] نارنگ، ٹرانسفارمیشن آف دی سکھز، ص ۳۷

تاہم سکھوں کے ساتھ معین الملک کی مفاہمانہ پالیسی اور گپتا کے بیان کردہ واقعات قرین قیاس ہیں۔ سکھوں نے فی الواقعہ اس وقت تک خاصی اہم حیثیت حاصل کر لی تھی۔ اب وہ پنجاب میں ایک متوازی طاقت کی حیثیت سے ابھرنا شروع ہو گئے تھے۔

سکھ اور احمد شاہ ابدالی کا دوسرا حملہ

فروری ۱۷۴۹ء سے لے کر دسمبر ۱۷۴۹ء تک سکھوں نے پُرامن زندگی گزاری۔ تاہم حکومت اور سکھوں کے مابین یہ معاہدہ دیرپا ثابت نہ ہو سکا۔ فریقین کے دلوں میں عداوت پرورش پا رہی تھی۔ سکھ خاص طور پر اس بے شورش اور خاموش زندگی سے اکتا گئے تھے۔ احمد شاہ ابدالی نے دسمبر ۱۷۴۹ء میں دوسرا حملہ شروع کر دیا تھا۔ سکھوں نے حسب معمول موقع غنیمت جانا۔ بھاری تعداد میں امرت سر میں جمع ہوئے اور ایک بار پھر پورے صوبے میں لوٹ مار کا آغاز کر دیا۔ حتیٰ کہ ان کا ایک مضبوط دستہ لاہور پر بھی چڑھ دوڑا۔ اور "شہر بیرونی را تاراج نمودہ پاک بسوختند۔"[1] اس کے بعد نواب کپور سنگھ شہر میں داخل ہوا۔ کوتوالی کے چبوترہ پر بیٹھا۔ عزت خان قائم مقام ناظم اپنے دستے لے کر آیا۔ تو سکھوں نے راہِ فرار اختیار کی۔[2] جون ۱۷۵۰ء میں ابدالی کی واپسی کے بعد جب معین واپس لاہور آیا۔ تو اسے اپنے خوب صورت دارالحکومت کے تباہ شدہ نواحی علاقے دیکھ کر زبردست طیش آیا۔[3] اس نے سکھوں کی جاگیریں ضبط کر لیں۔ ان کی مراعات روک لیں۔ اور ان کے خلاف نئے سرے سے فوجی کارروائیوں کا آغاز کر دیا۔ ابدالی کی واپسی کے فوراً بعد معین

---

[1] علی الدین، عبرت نامہ، ص ۲۰۹

[2] گپتا، ہسٹری آف دی سکھز، ص ۶۵

[3] (۱) علی الدین، عبرت نامہ، ص ۲۰۹

(۲) نارنگ، ٹرانسفارمیشن آف سکھزم، ص ۱۳۹

کو دو اہم بغاوتوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ ان کی وجہ سے سکھوں کے خلاف فوری طور پر مؤثر اقدامات نہ اٹھائے جا سکے اور وہ اس دوران بلا روک ٹوک حسب معمول لوٹ مار میں مصروف رہے۔ گزشتہ باب میں ناصر خاں اور شاہنواز خان کی ان بغاوتوں کی تفصیل بیان کی جا چکی ہے۔ کوڑا مل کا اثر و رسوخ ہنوز کارگر تھا۔ چنانچہ شاہنواز خان کے خلاف کارروائی کے دوران اس کے ہمراہ سکھوں کا ایک مضبوط دستہ بھی تھا۔ تاہم جونہی معین الملک ان بغاوتوں سے عہدہ برا ہوا۔ اس نے اپنی ساری توجہ سکھوں پر مرکوز کر دی۔

سابقہ تجربات کی روشنی میں اس پر واضح ہو چکا تھا۔ کہ مفاہمت کی کوئی حکمت عملی کارگر نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اس نے فوجی اور سول حکومتی مشینری کو پوری شدت سے سکھوں کے خلاف استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ضلعی اور دیہی حکام کے نام احکامات بھیجے۔ کہ سکھوں کو نیست نابود کر دیا جائے۔ انہیں پناہ دینے والوں کو سزائے موت کی دھمکی دی گئی۔ حکومت کے ان اقدامات کے نتیجے میں سکھوں کو نواحی قصبوں اور دیہاتوں سے دھکیل کر راوی، بیاس اور ستلج کے کناروں پر واقع ان کی پناہ گاہوں میں چلے جانے پر مجبور کر دیا گیا۔

۳ اکتوبر ۱۷۵۱ء کو معین نے میر مومن خان کی زیر قیادت ایک دستہ ان سکھوں کے خلاف بھیجا۔ جو لاہور کے گرد و نواح میں گڑبڑ کر رہے تھے۔ انہیں دھکیل دیا گیا۔ سکھوں کے خلاف یہ اقدامات اس شدت سے کیے گئے کہ وہ ایک بار پھر اپنی پرانی آماجگاہوں دامان ہمالیہ وسطی اور مشرقی پنجاب کے گھنے جنگلات اور مالوہ اور بیکانیر کے صحراؤں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔[1] مفتی علی الدین نے لکھا ہے۔

> "نواب معین الملک در پدم بنیان این گروہ سعی بلیغ بکار می برد۔ چنانچہ صدہا سکھ بہ قتل درآوردہ از سرہای اوشان چاہ ہا پُر کنانیدہ"[2]

---

[1] گپتا، ہسٹری آف دی سکھز، ص ۶۸-۷۰

[2] عبرت نامہ، ص ۲۰۸

ان دنوں یہ شعر سکھوں میں زبان زد عوام تھا۔

منو ساڈی دانتری اسی منو دے سوئے
جوں جوں سانوں وڈّدا اساں تیوں تیوں دونے ہوئے[1]

اس پالیسی کے بارے میں گپتا لکھتا ہے۔

The reign of terror failed in achieving its object. the oppressed Jat peasantry from fear of the government torture and molestation, fled from their fields and homes and converted themselves to the creed of Guru Gobind Singh and thus the Khalsa ranks began to swell even in exile.[2]

ابدالی کا تیسرا حملہ

دسمبر ۱۷۵۱ء میں ابدالی ایک بار پھر پنجاب کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ مارچ ۱۷۵۲ء تک وہ اس علاقے میں موجود رہا۔ یہ چار ماہ سکھوں کے لئے ایک بار پھر سنہری ایام ثابت ہوئے۔ انھوں نے حسب معمول غارت گری، قتل عام اور لوٹ مار کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ باری دوآب کو غارت کرنے کے بعد جالندھر دوآب کی طرف آئے۔ اس کے بعد ستلج پار کیا۔ حتیٰ کہ تھانیسر تک کا علاقہ ان کی چیرہ دستیوں کا نشانہ بنا۔ دل خالصہ کا ایک حصہ مغرب میں رچنا اور چج دوآبوں میں مصروف کار تھا۔[3]

ابدالی کی واپسی کے بعد معین نے ایک بار پھر سکھوں سے دو دو ہاتھ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے صادق بیگ خان کو آدینہ بیگ خان کے ہمراہ جالندھر دوآب کی طرف بھیجا۔ کہ سکھوں کے خلاف

---

[1] عبرت نامہ، نیز شجاع الدین، سیاسی اور ثقافتی تاریخ، نقوش لاہور نمبر، ص ۹۶

[2] گپتا، ہسٹری آف دی سکھز، ص ۷۱

[3] گپتا، ہسٹری آف دی سکھز، ص ۷۷

تادیبی کارروائی کی جائے۔ سکھ مکھووال میں بیساکھی کا تہوار منانے کے لئے جمع ہو رہے تھے۔ دونوں کمانڈروں نے انہیں اچانک جالیا۔ بہت سے تہ تیغ ہو گئے۔ باقی جان بچا کر بھاگ گئے۔ اس کے بعد ایک مہم مومن خان کے زیر قیادت لکھی جنگل کی طرف بھیجی گئی۔ جہاں سکھوں نے پناہ لے رکھی تھی۔ یہ مہم کامیاب نہ رہی۔ میر مومن کو واپس بلا لیا گیا۔ اور حسین خان کے تحت نئی مہم بھیجی گئی۔ اس نے سکھوں کو شکستیں دیں۔ سکھوں نے باری دوآب کے شمالی حصوں کی طرف بھاگنے کا پروگرام بنایا۔ جہاں انھوں نے غیر محفوظ دیہاتوں کو لوٹا۔[1]

معین الملک نے امن عامہ کی بحالی کا کام اپنی ذاتی نگرانی میں شروع کر رکھا تھا۔ وہ اس مقصد کے لیے صوبے کے مختلف علاقوں میں دورے کرتا تھا۔ طہماس بیگ خان نے لکھا ہے۔ جن دنوں وہ بٹالہ میں تھا۔ اطلاعات آئیں کہ سکھ گڑبڑ پیدا کر رہے ہیں۔ معین نے سید جمیل الدین خاں اور بخشی غازی بیگ خان کو ان کے خلاف بھیجا۔ انھیں منتشر کر دیا گیا۔ تاہم ان میں سے نو سو رام راونی کے قلعے میں جمع ہو گئے۔ ان کا محاصرہ کر لیا گیا۔ محاصرے سے تنگ آ کر سکھ قلعے سے نکلے اور محاصرین پر جا پڑے۔ دست بدست لڑائی ہوئی۔ بے شمار سکھ مارے گئے۔ باقی فرار ہو گئے۔[2]

تاہم میر معین کی کوشش کے زیادہ مثبت نتائج نہ نکلے۔ سکھوں کی سرگرمیاں جاری رہیں۔ ۱۷۵۲ء کے موسم سرما میں سکھوں نے دوبارہ اپنی کارروائیوں میں شدت پیدا کر دی اور لاہور کے نواح تک پہنچے۔ معین نے خود ان کے خلاف فوج کشی کی۔ طہماس بیگ خان لکھتا ہے۔ معین لاہور سے سات کوس کے فاصلے پر راوی کے کنارے پر خیمہ زن تھا۔ وہاں سے خواجہ

---

[1] (۱) گپتا، ہسٹری آف دی سکھز، ص ۷۸-۷۹

(۲) گپتا، لیٹر مغل ہسٹری آف دی پنجاب

(۳) باقر، آدینہ بیگ خان، ص ۱۶

[2] طہماس نامہ، ص ۱۸

مرزا خان کے زیر قیادت مغلیہ دستوں کو ہر سمت میں سکھوں کو کچلنے کے لئے روانہ کیا۔

خواجہ مرزا خاں اپنے دستوں کے ہمراہ بیس بیس[2] بسا اوقات تیس تیس[3] کوس تک پیش قدمی کرتا۔ جہاں کہیں سکھوں کی خبر سنتا۔ اچانک ان پر جا پڑتا۔ جو آدمی سکھوں کو زندہ پکڑ لاتے یا ان کے سر قلم کر کے لاتے یا ان کے گھوڑے چھین لاتے انہیں انعامات سے نوازا جاتا تھا۔ اگر کسی مغل سپاہی کا گھوڑا میدانِ جنگ میں ضائع ہو جاتا۔ تو اسے حکومت کی طرف سے بہتر گھوڑا فراہم کیا جاتا۔ جو سکھ زندہ پکڑے جاتے انہیں لکڑی کے ہتھوڑوں سے ہلاک کیا جاتا۔ ایک دفعہ آدینہ بیگ خان نے جالندھر دوآب سے چالیس پچاس سکھ قیدی بھیجے۔ انھیں حسب قاعدہ لکڑی کے ہتھوڑوں کی ضربوں سے ہلاک کر دیا گیا[1]

سکھوں کے خلاف ان تادیبی کاروائیوں کے دوران ہی اسی مقام پر ۳ر نومبر ۱۷۵۳ء کو معین الملک نے وفات پائی۔ معین الملک کی وفات کے ساتھ ہی تاریخ پنجاب کا ایک اہم دور اختتام پذیر ہو گیا۔ وہ پنجاب کا آخری قابل ذکر ناظم تھا۔ اس نے اپنے مختصر سے عہد نظامت میں انتشار کی قوتوں کے عمل کی رفتار خاصی دھیمی کر دی تھی۔ اس کی وفات سب سے زیادہ سکھوں کے لئے سازگار ثابت ہوئی۔ ہری رام گپتا نے لکھا ہے۔

their misfortunes ended.[2]

---

[1] طہماس نامہ، ص ۱۹

[2] گپتا، ہسٹری آف دی سکھز، ص ۸۳

طوائف الملوکی

۱۷۵۳ء — ۱۷۵۶ء

میر معین الملک کے انتقال کی خبر ۱۲ر نومبر کو دہلی پہنچی۔ اگلے روز احمد شاہ نے پنجاب کی نظامت پر اپنے تین سالہ بیٹے شہزادہ محمود شاہ کو مقرر کیا۔ اور معین کے دو سالہ شیر خوار بچے محمد امین خان کو اس کا نائب بنایا۔ دربار دہلی کی طرف سے یہ نامزدگی بالکل غیر حقیقی اور رسمی حیثیت رکھتی تھی۔ کیونکہ ۱۷۵۲ء سے پنجاب انتظامی طور پر افغان مملکت کا حصہ بن چکا تھا۔ لہٰذا اب اقتدار اعلیٰ کا اصل منبع احمد شاہ ابدالی تھا۔ نہ کہ احمد شاہ، شاہِ دہلی، چنانچہ مغلانی بیگم (میر معین کی بیوہ اور محمد امین کی والدہ) نے ابدالی کی طرف سے نامزدگی کی توثیق کو زیادہ اہمیت دی۔ افغان حکمران کی طرف سے جنوری ۱۷۵۴ء میں محمد امین کی تقرری بحیثیت ناظم کی توثیق کر دی گئی۔ اور میر مومن خان کو اس کا نائب مقرر کیا گیا۔ تاہم شیر خوار ناظم کے ایجنٹ کی حیثیت سے انتظامی امور مغلانی بیگم انجام دیتی تھی۔ دربار میں سرکاری حکام امین خان کو آداب پیش کرنے کے بعد، جسے ایک خواجہ سرا گود میں اٹھائے ہوئے ہوتا تھا، بیگم کے پاس جاتے تھے۔ جو پردے کے پیچھے سے ضروری احکامات جاری کرتی تھی[1]

---

[1] (۱) طہماس نامہ، ص ۲۱ (۲) گپتا، لیٹر مغل ہسٹری آف دی پنجاب، بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۸ پر

معین الملک کا ایک دست راست ہونے کی حیثیت سے بھکاری خاں کو توقع تھی۔ کہ نائب نظامت کا منصب اسے ملے گا۔ مومن خان کی تقرری سے اس کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اس نے وزیر دہلی میر نظام الدین انتظام الدولہ سے رجوع کیا۔ جو معین الملک کا بھائی تھا۔ وہ اپنی بھاوج کے خلاف تھا۔ اس نے بھکاری کو نائب ناظم مقرر کر دیا۔ مغلانی بیگم نے اس حکم کو سختی سے مسترد کر دیا۔

بھکاری خاں کی بغاوت (جنوری ۱۷۵۴ء)

اس پر بھکاری خان نے بزور طاقت قبضہ کا پروگرام بنایا۔ اس نے دربار میں حاضری ترک کر دی۔ قصور سے افغان بھرتی کرنا شروع کر دیئے۔ اپنی حویلی پر توپیں نصب کروا دیں۔ اور کھلم کھلا بیگم کے اقتدار سے انکار کر دیا۔ بیگم نے اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے فوری اقدامات کئے۔ اس نے بھکاری خان کے فوجیوں کو انعامات، اعزازات اور دیگر نوازشات کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ حتیٰ کہ اس کے معتمد ساتھی خواجہ مرزا خاں تک کو بہکا لیا۔ اسے خان کا خطاب دے کر ایمن آباد کا فوجدار مقرر کر دیا۔ اسی خواجہ مرزا نے بھکاری خان کو گرفتار کر کے بیگم کی خدمت میں پیش کر دیا۔ بیگم نے بھکاری خاں کے دستوں کو لوٹ لینے کا حکم دیا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ بعد ازاں اُن کی درخواست پر لوٹا ہوا مال واگزار کر دیا گیا[1]۔ بزدل اور سہل پسند وزیر دہلی انتظام الدولہ نے اس ذلت کو بآسانی برداشت کر لیا۔ اور بھکاری کی نامزدگی منسوخ کر دی۔ اور لاہور کے حکام کے لیے خلعتیں روانہ کیں[2]۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۷ (۳) گپتا ، ہسٹری آف دی سکھز ، ص ۸۴ - ۸۵
(۴) گنڈا سنگھ ، احمد شاہ درانی ، ص ۱۳۸

[1] طہماس نامہ ، ص ۲۱ - ۲۲

[2] گنڈا سنگھ ، احمد شاہ درانی ، ص ۱۴۰

قاسم خاں کی بغاوت (مارچ ۱۷۵۴ء)

قاسم خاں بھکاری خاں کا ایک متمد ترک سردار تھا۔ اس نے بھکاری خاں کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ بیگم نے اسے پٹی پرگنہ پر مامور کیا۔ نیز اسے چند ہزار سپاہی، توپیں، اور روپے بھی دیئے۔ قاسم خاں پٹی کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں سکھوں سے اس کی جھڑپ ہوئی۔ ایک ماہ اسی طرح سکھوں سے نبرد آزمائی جاری رہی۔ اس کے بھائی علیم بیگ خان کو ایک روز دار معرکے میں پسپا ہونا پڑا۔ اس میں اس کے تین سو بدخشانی سپاہی مارے گئے۔ چند روز بعد لاہور کی طرف آیا۔ اس کے ذہن میں لاہور پر قبضہ کرنے کی امنگ تھی۔ اس نے بڑی بے وقوفی کے ساتھ ہزاروں روپے اور اسلحہ ان سکھوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ جنھوں نے اسے حمایت کا یقین دلایا۔ بعد ازاں سکھ دستے فرار ہو گئے۔ اس کی اپنی فوج کی بہت بری حالت تھی۔ اب اس پاس اتنی رقم نہ تھی۔ کہ ان کی تنخواہیں ادا کر سکتا۔ انھوں نے تنخواہوں کی ادائیگی کا مطالبہ کیا۔ حتیٰ کہ اسے پکڑ کر اس کی تذلیل کی۔ اس کے خیمہ کی طنابیں کاٹ دیں اور اُسے بیگم کے پاس لے آئے جس نے اسے پکڑ کر جیل میں ڈال دیا[1]۔

خواجہ سراؤں کا غلبہ

طہماس بیگ لکھتا ہے۔ کہ ہر طرف خواجہ سرا چھائے ہوئے تھے۔ انہی کی آواز موثر تھی۔ انہی کے توسط سے ہر کام انجام پاتا تھا[2]۔ ہری رام گپتا نے لکھا ہے۔ کہ مغلانی بیگم خواجہ سراؤں کے توسط سے حکومت چلاتی تھی۔ اور اس طرح یہ مکمل طور پر خواجہ سراؤں کی حکومت تھی۔ دیوان بخشی اور دیگر اعلیٰ حکام صبح کے وقت بیگم کے ہاں جاتے۔ اور خواجہ سراؤں کے توسط سے احکامات حاصل کرتے۔

[1] طہماس نامہ ، ص ۲۲ تا ۲۴

[2] طہماس نامہ ، ص ۲۳

تین خواجہ سرا میاں خوش فہم، میاں ارجمند اور میاں محبت اس کے خاص معتمد تھے۔ مزید ستم ظریفی یہ تھی۔ کہ یہ تینوں شاید ہی کسی معاملے میں متفق ہوتے تھے ہمیشہ لڑتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ نظم و نسق بد نظمی کا شکار ہو گیا۔ اور ہر جگہ گڑبڑ پھیلنے لگی[1]

شیر خوار ناظم کی وفات

مئی ۱۷۵۴ء میں محمد امین خان فوت ہو گیا معین کے بچے کی موت بھی پراسرار حالات میں ہوئی۔ اس کے جسم کا داہنا حصہ نیلا پڑ گیا تھا۔ خود معین کی موت کے بارے میں اسی قسم کا بیان ملتا ہے۔ طہماس بیگ نے جو اس موقع پر موجود تھا۔ لکھا ہے۔ کہ عجیب بات یہ تھی۔ کہ چہرہ سے چھاتی تک نعش کا رنگ نیلا پڑ گیا[2]۔ باپ بیٹے کی ان یکساں طرز کی المناک اموات کے پس منظر میں کیا سازش تھی؟ ہم عصر تاریخ اس سوال کا واضح جواب فراہم نہیں کرتی۔ تاہم قیاس آرائیاں بہت تھیں۔ طہماس نے لکھا ہے۔ کہ لوگوں کا کہنا تھا۔ کہ بھکاری خاں نے خواجہ سرا زمرد کے ذریعے محمد امین خان کو زہر دلوایا تھا[3]

مکمل اختیارات تو پہلے ہی مغلانی بیگم کے ہاتھ میں تھے۔ اب اس نے خود کو سربراہ صوبہ کی حیثیت سے تسلیم کرانے کی کوشش شروع کر دی، اس نے اپنے نمائندے قندھار اور دہلی روانہ کئے۔ تاکہ اپنے لئے نظامت حاصل کر سکے۔ جب بیگم کا ایلچی دہلی پہنچا۔ تو احمد شاہ عماد الملک سے کشمکش میں مصروف تھا۔ اس لیے پنجاب کے حالات پر فوری توجہ نہ دے سکا۔ اس کے جانشین عالمگیر ثانی نے ۲۵ اکتوبر ۱۷۵۴ء مومن خاں کو پنجاب کا ناظم مقرر کر دیا لیکن بیگم کے سامنے وہ مجبور محض تھا۔ تمام اختیارات بیگم نے اپنے پاس رکھے[4]

---

[1] گپتا، لیٹر مغل ہسٹری آف دی پنجاب، ص ۱۲۰ - ۱۲۱

[2] طہماس نامہ، ص ۲۰

[3] طہماس نامہ، ص ۲۰

[4] گپتا، لیٹر مغل ہسٹری آف دی پنجاب، ص ۱۲۰

ملکی نظم و نسق تیزی سے درہم برہم ہوتا جا رہا تھا۔ ملتان احمد شاہ ابدالی کے علیحدہ گورنر کے تحت تھا۔ چہار محال ـــ گجرات، اورنگ آباد، پسرور، سیالکوٹ ـ پر ابدالی کی طرف سے براہِ راست نامزد شدہ رستم خاں حکومت کر رہا تھا ـــ شمالی اضلاع ـــ امرت سر، بٹالہ، کلانور اور پٹھان کوٹ پر سکھوں کی مضبوط گرفت تھی۔ جالندھر دوآب میں آدینہ بیگ نے آزاد اور خود مختار حیثیت حاصل کر لی تھی۔ ستلج اور جمنا کا درمیانی علاقہ دہلی کے تحت تھا۔ ناظم لاہور کی عملداری اب صرف لاہور اور اس کے قرب و جوار تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

بات یہیں تک ہوتی تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ مگر مغلانی بیگم ایک اعلیٰ اور پاکیزہ کردار کی حامل خاتون ثابت نہ ہوئی۔ اس کی اخلاقی گراوٹ کے چرچے دربار شاہی سے نکل کر زبان زدِ خاص و عام ہو چکے تھے۔ غازی بیگ خان بخشی کے ساتھ اس کے تعلقات کا چرچا لاہور کے بچے بچے کی زبان پر تھا[1]

خواجہ مرزا خاں کی بغاوت

لاہور کے اعلیٰ درباری حلقوں میں بلند ترین منصب پر فائز خاتون حاکم کا یہ اخلاقی زوال قابل قبول نہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ بیگم کے خلاف متعدد بغاوتوں نے جنم لیا۔ خواجہ مرزا، معین کا ایک معتمد ازبک سردار تھا۔ وہ بھکاری خاں کا حامی تھا۔ تاہم بعد میں بیگم کے ساتھ آملا۔ اور ایمن آباد کی فوجداری پر فائز ہو گیا۔ خواجہ مرزا کا بھائی خواجہ سعید خاں، بھکاری خاں کی نگرانی پر مامور تھا۔ بھکاری خاں نے اسے صورت حال کی نزاکت کا احساس دلایا اور کہا نواب معین مرحوم کی عزت خاک میں مل رہی ہے، اس کا حل یہی ہے۔ کہ خواجہ مرزا کو بلایا جائے۔ تاکہ وہ صوبے کا نظم و نسق سنبھال لے۔ چنانچہ خواجہ سعید نے خواجہ مرزا کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ اور لاہور آنے کی دی۔ دسمبر ۱۷۵۴ء میں وہ اچانک لاہور پہنچ گیا۔ بیگم کے خبر رسانوں نے اطلاع دی۔ کہ اس بار خواجہ مرزا کی آمد بُری نیت

---

[1] طہماس نامہ، ص ۱۲۱ - ۱۲۲

سے ہے۔ بیگم نے اس پر کان نہ دھرا اور کہا کہ وہ میرا ملازم ہے اور غیر وفادارانہ حرکات کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ اسی وقت خواجہ مرزا خاں نے محل پر یلغار کی چند ملازمین نے مدافعت کرنے کی کوشش کی اور مارے گئے۔ محل میں داخل ہونے کے بعد عام لوٹ مار شروع کر دی گئی۔ خواجہ سعید خاں نے محل کے ملازمین کو پہلے ہی بدعنوان کر دیا تھا۔ سب نے جمع ہو کر لوٹ مچائی۔ شام تک لاکھوں جائیداد لوٹ لی گئی[1]

اگلی صبح سات آٹھ ہزار پوربیا پیادوں نے جن کی مدد پر توپ خانہ بھی تھا، مرزا خاں کے دستوں پر حملہ کیا: تاہم انھیں پسپا کر دیا گیا۔ مغلانی بیگم کو اس کی والدہ کی رہائش گاہ میں منتقل کر دیا گیا۔ اور ارجمند نامی خواجہ سرا کو اس کی نگرانی پر مامور کیا۔

خواجہ مرزا خاں نے اپنے لیے نواب کا لقب پسند کیا۔ تمام مغلایان مغل سردار ــــ مثلاً بھکاری خان، عاشور علی خاں، بالابش خاں، فرمان بیگ خان، ابراہیم قلی خاں، اسماعیل علی خاں اور راجی علی خاں وغیرہ اُسے آداب پیش کرنے آئے۔ اور اس کی اطاعت قبول کر لی۔ تاہم یہ وابستگی اور اتحاد وقتی ثابت ہوا۔ چند روز بعد ان کا حسد اور عداوت کھل کر سامنے آنے لگی۔ محافل خورد نوش اور تقاریب طرب و نشاط میں دوستی اور اتحاد کے وعدوں کے باوجود وہ جلد ہی اختلاف رائے کا شکار ہو گئے[2]

خواجہ مرزا نے لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد امن و امان بحال کرنے کی کوشش کی سکھوں کے خلاف اس نے موثر مہمات بھیجیں۔ اس کے بھائی خواجہ قاضی نے پانچ چھ ہزار سپاہیوں کے ساتھ آس پاس کے علاقے میں سکھوں سے کئی لڑائیاں کیں اور انھیں شکست دی[3]۔ تاہم مجموعی

---

[1] طہماس نامہ، ص ۲۶

[2] طہماس نامہ، ص ۲۷-۲۸

[3] ایضاً، ص ۲۹

طور پر خواجہ مرزا نظم و نسق کی مؤثر بحالی، محاصل کی تسلی بخش وصول یابی اور اپنے حامیوں کے انتشار اور افراتفری کو کنٹرول کرنے میں پوری طرح ناکام ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مقامی سردار اور باغی اپنے اپنے دائرۂ اختیار میں مکمل خودمختار ہو گئے[1]

افغان مداخلت

مغلانی بیگم کے لئے اقتدار سے محرومی کی صورت قابلِ قبول نہ تھی۔ خواجہ مرزا خان اور بھکاری خان اس کی تباہی کے حقیقی ذمہ دار تھے۔ اس نے خفیہ طور پر دہلی اور قندھار سے مراسلت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ وزیر دہلی غازی الدین عماد الملک سے اس کی بیٹی عمدہ بیگم کی نسبت طے پا چکی تھی۔ بیگم نے اپنے داماد کو اپنی صورت حال سے آگاہ کیا۔ اور مدد چاہی۔ عماد الملک دربار دہلی کے امور میں مصروفیت کی وجہ سے توجہ نہ دے سکا۔ بیگم نے احمد شاہ ابدالی سے بھی رابطہ قائم کر لیا تھا۔ ابدالی ان دنوں قندھار میں مقیم تھا۔ بیگم نے اپنے ماموں خواجہ عبداللہ خان کو اس کے پاس بھیجا[2] اور مغلیہ امراء کے خلاف شکایت کی۔ کہ انھوں نے پنجاب میں بدانتظامی اور گڑبڑ پھیلا دی ہے۔

احمد شاہ ابدالی نے اپنے جرنیل جہان خاں کے بھائی امان خاں کو دس ہزار سپاہیوں کے ہمراہ بیگم کی مدد کے لئے بھیجا۔ امان خاں نے لاہور کی طرف پیش قدمی کی۔ دریائے چناب کے کنارے خیمہ زن ہوا۔ خواجہ مرزا خاں کا بھائی قاضی خواجہ پانچ ہزار مغلیہ دستوں کے ہمراہ چناب کی طرف روانہ ہوا۔ تاہم مغل سردار فوجی لائحہ عمل ترتیب دینے میں متفق نہ ہو سکے۔ انھوں نے

---

[1] گپتا، لیٹر مغل ہسٹری آف دی پنجاب، ص ۱۲۳، ۱۲۴

[2] خواجہ عبداللہ اس خیال سے طویل سفر پر آمادہ ہو گیا۔ کہ شاید اُسے صوبے کی حکومت مل جائے۔ (گنڈا سنگھ احمد شاہ درانی، ص ۱۴۳)

لاہور کی طرف ہٹنے کا مشورہ دیا۔ اور کہا کہ وہاں لڑائی لڑی جائے۔ مختصر یہ کہ مغلیہ دستے پیچھے ہٹ آئے۔ اور لاہور پہنچ گئے۔ امان اللہ بھی ان کے تعاقب میں شاہدرہ پہنچ کر خیمہ زن ہوا۔[1]

افغان فوج دروازے پر پہونچ گئی۔ تو مرزا خاں بہت خوف زدہ ہوگیا۔ اس نے ڈر کے مارے خواجہ عبداللہ کو پیغام بھیجا۔ کہ "میں مرحوم معین الملک کا نوکر اور خادم ہوں۔ اب تک میں نے لاہور کو باغیوں سے بچائے رکھا۔ اب تم آگئے ہو۔ ملک تمہارا ہے۔ میں تمہارا ایک ملازم رہوں گا۔ اگر میری جان بخشی کرو اور اس پر ایمانداری سے قائم رہو۔ تو میں تمہاری خدمت میں حاضر ہو جاتا ہوں۔" خواجہ اس پیش کش سے خوش ہوا۔ اس نے مرزا خاں کی جان بخشی کا وعدہ کر لیا۔ دونوں کی ملاقات ہوئی۔ عبداللہ نے مرزا خاں سے کہا۔ کہ امان اللہ خاں سے ملاقات وقت کا تقاضا ہے۔ چنانچہ مرزا اسے ملنے گیا۔ امان خان نے اسے جیل میں ڈال دیا۔[2]

طہماس بیگ خاں نے اس واقعہ کا حال قدرے مختلف انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ مغل سرداروں نے خواجہ عبداللہ خاں کے توسط سے جو ابھی افغان فوج میں تھا۔ افغان فوج سے روابط قائم کر لئے۔ امان خان نے مغلوں کو ضروری ضمانتیں دیں۔ تب انھوں نے خواجہ مرزا خاں کو مشورہ دیا۔ کہ وہ امان خاں سے ملاقات کرنے جائے۔ امان خان سے درخواست کی گئی۔ کہ وہ خواجہ عبداللہ خاں کو لاہور کا ناظم اور دیوان مقرر کرے۔ اور خواجہ مرزا خاں اس کا نائب رہے۔ معاہدہ کی توثیق کے بعد خواجہ مرزا خاں، امان خاں سے ملنے گیا۔ اس نے پکڑ کر جیل میں ڈال دیا۔ ساتھ ہی ان مغل سرداروں کو بھی جو افغانوں سے کامیاب مذاکرات پر پھولے نہ سماتے تھے۔[3]

امان خاں نے لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد شہر کو لوٹ مار کے حوالے کر دیا۔ کم و بیش دو ماہ

---

[1] طہماس نامہ، ص ۲۰

[2] گنڈا سنگھ، احمد شاہ درانی، ص ۱۴۳، ۱۴۴

[3] طہماس نامہ، ص ۳۰

تک اندھا دھند غارت گری جاری رہی۔[1] اس لوٹ مار سے افغانوں نے چالیس لاکھ روپیہ حاصل کیا۔[2]

مغلانی بیگم کی بحالی

صوبے کی نظامت ایک بار پھر مغلانی بیگم کے ہاتھ آگئی۔ خواجہ عبداللہ خاں اس کا نائب مقرر ہوا بھکاری خاں بڑی بے رحمی کے ساتھ بیگم کے انتقام کا نشانہ بنا۔ اسے گرفتار کر کے بیگم کے سامنے لایا گیا۔ اُسے ہاتھ پاؤں باندھ کر پیٹا گیا۔ حتیٰ کہ اس نے جان دیدی۔ اور اس کی لاش بیرون شہر ایک گڑھے میں پھینک دی گئی۔[3] یہ واقعہ اپریل ۱۷۵۵ء میں رونما ہوا۔

خواجہ عبداللہ کا لاہور پر قبضہ

امان خان تمام اہم مغل سرداروں کو مع خواجہ مرزا خاں اپنے ساتھ قندھار لے گیا۔ عبداللہ خاں نے جو مغلانی بیگم کا نائب تھا۔ اپنی من مانی شروع کر دی۔ اس نے ایک عورت اور وہ بھی اپنی بھانجی کی اتباع کو اچھا نہ سمجھا۔ اس نے پندرہ بیس ہزار سپاہی تیار کر لئے۔ جب بیگم نے دیکھا۔ کہ عبداللہ خان اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ تو اس نے بھی آدمی بھرتی کرنا شروع کر دیئے۔ اب دونوں میں کھلم کھلا اقتدار کی رسہ کشی شروع ہوگئی۔ بیگم زیادہ تعداد میں سپاہ فراہم نہ کر سکی۔ محض دو تین ہزار آدمی بھرتی ہو سکے۔ جولائی ۱۷۵۵ء میں فریقین کی کشمکش عروج پر پہنچ گئی۔ اور دونوں کے دستوں میں جھڑپیں شروع ہوگئیں بیگم کی فوجی جمعیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ خواجہ عبداللہ خاں کو غلبہ حاصل ہوگیا۔ تاہم اس دوران میر مومن خاں اور افغان نمائندے ہادی خاں کی مداخلت سے گڑبڑ ختم ہوگئی۔ عبداللہ خاں نے اقتدار

---

[1] گنڈا سنگھ، احمد شاہ درانی، ص ۱۴۴

[2] گپتا، لیٹر مغل ہسٹری آف دی پنجاب، ص ۱۲۴

[3] "بضرب شلاق بہ دار البقا، فرستاد، و در خندق انداخت" (مفتی علی الدین، عبرت نامہ، جلد اول ص ۲۱۲

سنبھال لیا۔ بیگم کو معزول کر کے اس کی والدہ کے گھر نظر بند کر دیا گیا[۱]۔

بگڑتی ہوئی سیاسی صورت حال لوگوں کے لیے مصائب میں مسلسل اضافہ کرتی جا رہی تھی۔ خواجہ عبداللہ نے بغیر سوچے سمجھے اپنے عزائم پورا کرنے کے لئے بھاری فوج اکٹھی کر لی تھی۔ خزانہ خالی تھا۔ اب اسے فوجی ضروریات کے لیے رقم کی شدید ضرورت تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اس نے ہر جائز و ناجائز طریقے سے رقم اکٹھا کرنا شروع کر دی۔

عوام سے رقم اکٹھی کرنے کے لیے اس نے جبر و تشدد کا ہر حربہ آزمانے کا تہیہ کر لیا۔ شہر کے دروازے بند کر دئے گئے۔ بھکاری خاں کی حمایت کرنے کا عذر لے کر تمام متمول افراد کو۔ بلا لحاظ مذہب۔ بے دریغ لوٹنا شروع کر دیا۔ اسی لوٹ مار میں متعدد شہریوں کو تہہ تیغ کر دیا گیا۔ اس اندھیر نگری کا یہ نتیجہ نکلا۔ کہ شہر میں اشیائے صرف کی شدید قلت ہو گئی۔ اور خورد و نوش کی چیزیں انتہائی گراں داموں پر فروخت ہونے لگیں[۲]۔

اسی زمانے میں لاہور میں یہ ضرب المثل مشہور ہوئی۔ حکومت نواب عبداللہ
نہ رئی چکی، نہ رہیا چُلھا[۳]

عماد الملک کی مداخلت

مغلانی بیگم نے ایک بار پھر اپنی زائل شدہ حیثیت بحال کرانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع

---

[۱] (۱) طہماس نامہ، ص ۳۱

(۲) ہری رام گپتا، لیٹر مغل ہسٹری آف دی پنجاب، ص ۱۲۵

(۳) گپتا، ہسٹری آف دی سکھز، ص ۸۸

(۴) گنڈا سنگھ، احمد شاہ درانی، ص ۱۴۴

[۲] گپتا، سٹڈیز، ص ۱۲۶

[۳] شجاع الدین، نقوش لاہور نمبر ص ۱۰۲

کئے۔ اس نے وزیر دہلی غازی الدین عماد الملک سے خفیہ مراسلت شروع کی۔ اسے لکھا کہ جب مجھ پر ظلم ہوا۔ تو احمد شاہ ابدالی نے قندھار سے آ کر میری مدد کی۔ تم پر میری مدد لازم ہے۔ میں نے اپنی بیٹی تمہیں دی ہے اگر تم خود نہیں آ سکتے۔ تو کم از کم ایک بہترین مسلح فوج ہی بھیج دو۔ بیگم کے کئی خطوط ملنے پر عماد الملک شہزادہ علی گوہر کو ساتھ لے کر ۱۵ر جنوری ۱۷۵۶ء کو دہلی سے چلا اور سرہند پہنچا (۲ر فروری ۱۷۵۶ء) یہاں آدینہ بیگ فوجدار جالندھر دوآب کا خط موصول ہوا۔ کہ آپ سرہند ٹھہریں۔ دو تین ہزار سپاہ بھیج دیں۔ میں بھی اپنے دستے بھیجتا ہوں۔ لاہور میں کافی زیادہ فوج ہے۔ آپ کی آمد اسے خبردار کر سکتی ہے۔ اس سے گڑبڑ کی توقع ہے جسے دبانے میں طویل مدت درکار ہو گی۔

عماد الملک نے آدینہ بیگ کی تجویز پسند کی۔ اس نے خواجہ سرا نسیم خان کو دو تین ہزار سپاہ دے کر کہا۔ کہ وہ آدینہ بیگ کے پاس جائے اور اس کی ہدایت پر عمل کرے۔ جونہی یہ دستے آدینہ بیگ کے پاس پہنچے۔ اس نے صادق بیگ خان کو دس ہزار فوج دے کر نسیم خاں کے ہمراہ کر دیا۔ یہ فوج تیزی سے لاہور آئی۔ اور پُرامن انداز میں لاہور پر قابض ہو گئی۔

بیگم کی نجی زندگی کا تذکرہ عماد الملک تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے سوچا۔ کہ بیگم کا مزید حکومتِ پنجاب پر فائز رہنا مناسب نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے ایک تجربہ کار اور دانش مند امیر سید جمیل الدین کو دس ہزار سپاہ دے کر روانہ کیا۔ تاکہ بیگم کو اس کے پاس سرہند لے آئے۔ جمیل الدین اچانک لاہور میں آ وارد ہوا۔ محل کا محاصرہ کر لیا۔ بیگم کو ہاتھی پر بٹھا کر تزک و احتشام سے سرہند کی طرف بھیج دیا (۲۸ر مارچ ۱۷۵۶ء)

مغلانی بیگم، عماد الملک کے اس رویے پر بہت برہم ہوئی۔ اس نے وزیر کو گالیاں دیں۔ اور کہا کہ تمہارا یہ سلوک دہلی کی تباہی اور ذلت کا باعث بنے گا۔ ابدالی جلد ہی اس توہین کا بدلہ لینے آئے گا۔ اور تمہیں سزا دے گا[۱]۔

---

[۱] "عماد الملک و ملازمانش را مورد فحش و دشنام داشت و بہ بانگ دہل می گفت کہ این حرکت باعث خرابی عالم و ویرانی شاہجہان آباد و تاراج و بی ناموسی غلامان سلطنت و تمام مملکت است۔" سیر المتاخرین، ص ۸۹۸

وزیر نے لاہور اور ملتان ۳۰ لاکھ سالانہ کے عوض آدینہ بیگ خاں کو دے دیئے[49] اور سید جمیل الدین خان کو اس کا نائب مقرر کر دیا۔

سید جمیل الدین خاں

نیا ناظم ایک تجربہ کار آدمی تھا۔ عدل و انصاف کے معاملے میں وہ بہت سخت تھا۔ ناکافی فوج اور خالی خزانے کے باوجود اس نے امن و امان کے لیے خاصا کام کیا۔ طہماس بیگ خاں نے جمیل الدین کے انتظامی اقدامات کے بارے میں لکھا ہے۔ ایک بار ایک مشہور آدمی نے کسی کو قتل کر دیا۔ سید موصوف نے شکایت پہنچی۔ اس نے قاتل کے قتل کا حکم دیا۔ اس کا سر قلم کر کے شہر کی سڑکوں پر پھرایا گیا۔ تاکہ اس سزا سے دوسروں کو عبرت ہو۔ تاجر عموماً غلہ بھاری قیمتوں پر بیچتے تھے۔ ناظم نے انہیں حکم دیا کہ شرح کم کر دیں اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ جب گورنر سوار ہو کر باہر آیا۔ تو لوگوں نے قیمتوں کے اضافے کی شکایت کی۔ اس نے فوراً تاجر برادری کے سردار کو بلایا۔ اور اس کا سر قلم کر دیا۔ اس کا گہرا اثر ہوا اور نرخ فوراً عام سطح پر چلے گئے۔

جمیل الدین نے سکھوں کے خلاف بھی موثر کاروائیاں کیں۔ وہ شکار کے لیے نکلتا۔ تو دس پندرہ ہزار سکھ اس پر جا پڑتے۔ وہ صرف ایک ہزار سپاہیوں کے ساتھ ہوتا۔ تاہم اس چھوٹی سی تعداد سے وہ انھیں بھگا دیتا[50]

خواجہ عبداللہ خاں

خواجہ عبداللہ خاں، جو عماد الملک کے دستوں کی آمد پر لاہور سے جموں کی طرف بھاگ گیا تھا، قندھار پہنچ گیا۔ اور ابدالی سے ملاقات کی۔ اسے کہا کہ غازی الدین خاں وزیر ہندوستان سرہند پہنچا،

---

[50] طہماس نامہ ، ص ۳۸

وہاں سے اس نے ایک بھاری فوج لاہور بھیجی۔ آپ نے مغلانی بیگم کو اپنی بیٹی کہا ہے۔ وہ اسے دہلی لے گئے ہیں۔ یہ افغانوں کی توہین ہے۔ اگر خواجہ مرزا خاں اور دیگر مغل سردار جو آپ نے پکڑ رکھے ہیں۔ رہا کر دیئے جائیں اور انھیں میرے ساتھ شامل ہونے کی اجازت دی جائے۔ اور اگر آپ کی مقرر کردہ ایک فوج میرے ساتھ جائے۔ تو میں لاہور پر قبضہ کر سکتا ہوں۔ یہ صوبہ آپ کی مملکت میں تھا۔ یہ مناسب نہیں ہے۔ کہ ہندوستان کے دستے لاہور پر قبضہ کریں[51]

چنانچہ ابدالی نے خواجہ مرزا خاں اور دیگر مغل سرداروں کو رہا کر دیا۔ اور انہیں خواجہ عبداللہ خاں کی خدمت میں مقرر کر دیا۔ اپنا ایک جرنیل عبدالصمد خاں[52] چند ہزار سوار و پیادہ فوج کے ساتھ عبداللہ خاں کے ہمراہ کیا۔ یہ دستے لاہور کی طرف روانہ ہوئے۔

آدینہ بیگ نے سید جمیل الدین سے طے کر رکھا تھا۔ کہ ہنگامی صورت حال کے دوران وہ اسے دس پندرہ ہزار سپاہی فراہم کرے گا۔ افغان دستوں کی آمد کی اطلاع پا کر سید نے آدینہ بیگ سے مدد طلب کی۔ اس نے رائے دی۔ کہ افغان دستوں کی تعداد کے پیش نظر مناسب یہ ہے۔ کہ وہ دوآب کی طرف آجائے۔ اور وہاں متحد ہو کر ان کا مقابلہ کریں۔ چنانچہ سید جمیل الدین نے شہر چھوڑ دیا[53]

۴ اکتوبر ۱۷۵۶ء کو افغان دستے لاہور میں داخل ہو گئے۔ خواجہ عبداللہ خاں کو ناظم بنایا گیا۔ خواجہ مرزا خاں اس کا نائب مقرر ہوا۔ ایک بار پھر شہر میں وسیع پیمانے پر لوٹ مار مچائی گئی[54]

---

[51] طہماس نامہ ، ص ۳۹

[52] گنڈا سنگھ نے اس افغان سردار کا نام جنگ باز خان لکھا ہے۔

(احمد شاہ درانی ، ص ۱۵۰)

[53] طہماس نامہ ، ص ۳۹

[54] گپتا ، لیٹر مغل ہسٹری آف دی پنجاب ، ص ۱۳۱

سکھ

سکھوں نے میر معین کی وفات کے بعد پیدا ہونے والے حالات سے خاصا فایدہ اٹھایا ۔ گپتا لکھتا ہے۔ کہ ان کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ ان کے دستے پنجاب کے علاقوں پر عام یلغاریں کرتے پھر رہے تھے۔ مویشیوں کے گلے ہانک لے جاتے، زمینوں کو اجاڑتے، گاؤں لوٹتے، اور بے پناہ مال وغنیمت حاصل کرتے۔ انھوں نے رام راونی کا قلعہ دوبارہ بنایا۔ اسے مستحکم کیا۔ اور رام گڑھ کا نام دیا[1]

راکھی سسٹم

ڈاکٹر ہری رام گپتا کی تحقیق کے مطابق سکھوں نے اس دور میں ایک مربوط نظام کی بنیاد رکھی تھی۔ جسے انھوں نے راکھی کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ طوائف الملوکی کے اس دور میں پنجاب کی آبادی محصلوں کی تاروتاختی، سکھوں کی غارت گری، اور سرکاری دستوں کی یلغاروں کے نتیجے میں تباہ و برباد ہو چکی تھی۔ تجارت ٹھپ ہو چکی تھی۔ کیونکہ سڑکیں اور راستے بالکل غیر محفوظ تھے ۔ سکھوں کا خوف ساکنانِ ملک اور حکام حکومت کے دلوں میں موجود تھا۔ اہالیان گاؤں نے خود کو دل خالصہ کے تحفظ میں دے دینا مناسب سمجھا۔ سال میں دو بار مئی، اکتوبر (ہاڑی، ساونی) میں پیداوار کا ⅕ سکھوں کو ادا کرتے تھے۔ اس کے جواب میں سکھ انہیں کامل تحفظ فراہم کرتے جانی ومالی تحفظ کی ضمانت دی جاتی۔ اسے راکھی یا جمعداری کہتے تھے۔ تھوڑے ہی عرصے میں پانچ دوآبوں میں سے چار دوآبے سکھوں کے تحفظ میں آگئے ۔ امرت سر میں ایک ریزرو فوج رکھی جاتی تھی۔ کروڑا سنگھ اور دیپ سنگھ کے دستے ستلج کے جنوبی کنارے کی طرف گئے۔ سنگھ پوریئے اور راہلو والئے ستلج اور بیاس کے کناروں پر رہے ۔

---

[1] ہسٹری آف دی سکھز ، ص ۹۰

جے سنگھ کا ہنیا اور جسا سنگھ رام گڑھیا، اٹکی کے زرخیز علاقوں کی طرف امرت سر کے شمال میں چلے گئے۔ نکئی لاہور کے جنوب میں تھے۔ چڑھت سنگھ سکرچکیہ اور ہری سنگھ بھنگی جن کے پاس مضبوط ترین دستے تھے انھوں نے خود کو رچنا اور بِیج دوآبوں میں مستحکم کیا۔ نشانوالیئے اور ڈالیوالیئے امرت سر کے محافظ رہے اور ہنگامی صورت حال میں محفوظ دستوں کا کام دیتے رہے۔ ان سرداروں نے چھوٹے چھوٹے قلعے بنا رکھے تھے۔

This step occured tor the Sikhs strong econo-mic position for the time being and created for the Sikh chiefs principalities, which they were soon to rule over as absolute master. [1]

سکھوں کے علاوہ پنجاب میں کئی دیگر طاقتیں سر اٹھا رہی تھیں۔ مضبوط مقامی زمینداروں نے اپنے دستے اکٹھے کر کے آزادانہ رویہ اختیار کر لیا تھا۔ سندھ ساگر دوآب میں گکھڑ اور ٹوانے، بِیج دوآب میں وڑائچ اور مقرب خاں، رچنا دوآب میں چٹھے اور باجوہ زمیندار، پرگنہ بٹالہ میں رندھاوے، قصور میں افغان، کپورتھلہ میں راجپوت، جالندھر دوآب میں افغان[2]

یہ سب عناصر تیزی سے زور پکڑ رہے تھے۔ طوائف الملوکی کے اس زمانے میں انتشار کی قوتیں کھل کھیلیں۔ پورے صوبے میں ایک سرے سے دوسرے تک لاقانونیت اور افراتفری کا دور دورہ ہو گیا۔ عوام کے مصائب اور مشکلات میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ تاریخ پنجاب کا تاریک دور تھا۔

---

[1] گپتا ، ہسٹری آف دی سکھز ، ص ۹۳ - ۹۵

[2] گپتا ، ہسٹری آف دی سکھز ، ص ۸۹ - ۹۰

باب : ۱۱

احمد شاہ ابدالی کا چوتھا حملہ اور افغان حکومت کا قیام

نومبر ۱۷۵۶ء ——— اپریل ۱۷۵۷ء

احمد شاہ ابدالی کو عماد الملک کی کارگزاریوں کی اطلاعات مسلسل مل رہی تھیں۔ اس کے لیے افغان مملکت میں شامل صوبہ پنجاب کے بارے میں عماد الملک کا طرز عمل ناقابل برداشت تھا۔ مغلانی بیگم نے برابر اس سے رابطہ قائم کر رکھا تھا۔ تازہ ترین صورت حال کے بارے میں لکھتے ہوئے بیگم نے اسے تحریر کیا کہ

"میں میر مومن خاں، آدینہ بیگ خاں اور سید جمیل الدین خاں کی غداریوں کی وجہ سے تباہ ہو چکی ہوں۔ اگر تم اس بار ہندوستان پر حملہ کرو۔ تو بغیر کسی دشواری کے کروڑوں روپے تمہارے ہاتھ آسکتے ہیں[1]۔"

ابدالی نے گو ماضی میں پنجاب کی طرف فوجی کمک روانہ کرنے میں ہمیشہ مستعدی سے کام لیا۔ حال ہی میں اس نے خواجہ عبداللہ خاں کی مدد کے لئے عبدالصمد خان کو روانہ کیا تھا۔ تاہم اب وہ سنجیدگی سے محسوس کر رہا تھا۔ کہ اس کا بذات خود پنجاب کی طرف جانا ناگزیر ہے۔

دربار دہلی سے بھی اس بار ابدالی کو ہندوستان آنے کی دعوت موصول ہوئی۔ عماد الملک اور دربار شاہی ایک دوسرے سے نبرد آزما تھے۔ حرم شاہی خاص طور پر عماد الملک کو ہٹانے میں جب

---

[1] گپتا، لیٹر مغل ہسٹری آف دی پنجاب، ص ۱۳۲

ناکام ہو گیا۔ تو انھوں نے نجیب الدولہ سے مدد چاہی۔ باہمی بات چیت کے بعد طے پایا۔ کہ ابدالی کو دعوت دی جائے۔ چنانچہ نجیب الدولہ نے اپنے بھائی سلطان خان کو شاہ کے پاس بھیجا۔ اور اسے ایک بھاری فوج کے ساتھ ہندوستان آنے کی دعوت دی[1]۔

ابدالی قندھار سے روانہ ہو کر نومبر ۱۷۵۶ء میں پشاور پہنچ گیا۔ پشاور سے اس نے جہان خان کی زیر قیادت ایک ہراول دستہ بھیجا۔ تاکہ آدینہ بیگ کا فوری تعاقب کیا جائے۔ جہاں خاں نے دریائے سندھ عبور کر کے حسن ابدال کے قریب ڈیرہ جمایا۔ اور اپنے سپاہی گجرات کی طرف بھیجے۔ تاکہ افغان فوجوں کے لیے اس راستے سے گزرتے وقت سامان رسد، غذا اور چارہ وغیرہ کا انتظام کریں۔ جہاں خاں نے ایمن آباد پر چڑھائی کی۔ فوجدار فرار ہو گیا۔ اور شہر کو جی بھر کر لوٹا گیا۔ اس کے بعد اس نے بٹالہ کا رخ کیا۔ وہاں قبضہ کرنے کے بعد ایک دستہ آدینہ نگر کی طرف روانہ کیا۔ تاکہ آدینہ بیگ کو پکڑا جا سکے[2]۔

احمد شاہ ابدالی ۱۵ر نومبر کو پشاور سے روانہ ہوا۔ ۲۶ر نومبر کو دریائے سندھ عبور کیا۔ اور ۲۰ر دسمبر کو لاہور پہنچا۔ آدینہ بیگ اس وقت امرتسر سے ۲۲ میل جنوب مشرق بیاس کے کنارے جلال آباد کے مقام پر موجود تھا۔ جہاں خان نے ۱۲ر دسمبر تک بٹالہ اور آدینہ نگر تک یلغار کر لی تھی۔ آدینہ بیگ خاں اور سید جمیل الدین اپنے دستوں کے ہمراہ خاموشی سے ہانسی اور حصار کے بے آب و گیاہ صحراؤں کی طرف چلے گئے۔ جہاں خاں نے جالندھر دوآب پر قبضہ کرنے کے بعد اسے خوب غارت کیا[3]۔

ابدالی بارہ روز تک لاہور میں مقیم رہا۔ مقامی سرداروں سے اطاعتیں لینے کے بعد اس نے دہلی کا رخ کیا۔ لاہور کی حکومت پر خواجہ مرزا کو فائز کیا۔ ہری رام گپتا، ابدالی کے سابقہ حملوں کے ساتھ موازنہ

---

[1] (۱) گنڈا سنگھ، احمد شاہ درانی، ص ۱۵۰-۱۵۱
(۲) گپتا، لیٹر مغل ہسٹری آف دی پنجاب، ص ۱۳۱-۱۳۲

[2] گنڈا سنگھ، احمد شاہ درانی، ص ۱۵۱

[3] (۱) فقیر الدین احمد، عبرت نامہ، الیٹ اینڈ ڈوسن، جلد ۸، ص ۱۴۱ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۴ پر)

کرتے ہوئے لکھتا ہے ۔

In the course of all his previous incursions the Durrani had experienced active opposition from the Punjab viceroy, and the court of Delhi also had made some efforts, or at least had displayed some energy or anxiety in checking his progress. On this occasion, however, the empire had been reduced to such a condition of utter wreck and ruin that no one tried to impede his march and not a single Indian soldier came forward to oppose him till the invader found himself in the Imperial Capital, where every body lay at his mercy. [۵]

لاہور سے سرہند تک تمام علاقہ بری طرح تباہ و برباد کیا گیا ۔ کوئی گاؤں لوٹ مار سے محفوظ نہ رہ سکا ۔ دہلی کی طرف روانہ ہونے سے پہلے ابدالی نے خواجہ مرزا کو لاہور کا ناظم مقرر کرنے کے علاوہ خواجہ عبداللہ کو جالندھر دوآب کا فوجدار مقرر کیا ۔ ستلج اور راوی کے درمیان کا پہاڑی علاقہ راجہ گھمنڈ چند آف کانگڑہ کو دیا ۔ بست جالندھر جموں اور کشمیر کا علاقہ مغلانی بیگم کو دے دیا ۔ بیگم نے آدینہ بیگ خاں کو جو اُن

بقیہ حاشیہ ص ۱۶۳ (۲) " آدینہ بیگ خاں تاب مقاومت نیاوردہ بصحرای ہانسی وحصار کہ بی آب محض وجائی دشوار گزار لیست گریختہ پناہ برد ۔" سیر المتاخرین ، ص ۸۹۸

(۳) افغانوں کی طرف سے آدینہ بیگ کے تعاقب اور آدینہ بیگ کے فرار کا ذکر وارث شاہ کے ہاں ملتا ہے ۔

[۴] دینا بیگ دے مگر جو پئے غلزئی ڈیرہ اُلٹ کے چا کنگال کیتا ۔ (محمد اسلم ، سرمایہ عمر (مجموعہ مقالات) ص ۳-۱ مطبوعہ لاہور ۱۹۷۶ء

[۵] ہسٹری آف دی سکھز ، ص ۹۶ ۔ نیز لیٹر مغل ہسٹری دی پنجاب ، ص ۱۳۳

دلوں پہاڑیوں میں مقیم تھا ۔ دوآبہ کا گورنر مقرر کیا ۔ راجہ رنجیت دیو کو جموں پر بحال رکھا ۔ اور اپنے ایک عزیز خواجہ ابراہیم خان کو کشمیر بھیجا ۔[۱]

احمد شاہ ابدالی دہلی میں

طہماس بیگ لکھتا ہے کہ احمد شاہ ابدالی کی آمد کی خبر پہنچتے ہی شہر میں زبردست افراتفری پھیل گئی ۔ عماد الملک کے ساتھیوں نے اسے مطعون کیا ۔ کہ یہ سارا کیا دھرا تمہارا ہے ۔ تم ہی نے دستے لاہور بھیجے ، مغلانی بیگم کو لائے ۔ اب مناسب یہ ہے کہ بیگم کے ساتھ کوئی معاہدہ کیا جائے ۔ اور اسے احمد شاہ ابدالی کے پاس بھیجا جائے ۔ تاکہ وہ ابدالی کو واپس اپنے ملک جانے پر آمادہ کر سکے ۔[۲] عماد الملک نے ایسا ہی کیا ۔ بیگم آمادہ ہوگئی ۔ اور اپنے چار سو سپاہیوں کے ہمراہ دہلی سے روانہ ہوگئی ۔ شام کو سونی پت پہنچ گئی ۔ جہاں سے اس نے احمد شاہ ابدالی ، شاہ ولی خاں اور جہان خاں کو خطوط لکھے اور اپنے ملازم کے ہاں ان کے پاس روانہ کئے ۔ اگلے روز خود بھی روانہ ہوئی اور ابدالی کے پڑاؤ میں جا پہنچی ۔ ابدالی نہایت عزت کے ساتھ اسے پیش آیا ۔ تاہم اس کے جواب میں ابدالی نے کہا ۔ کہ اگر تم لاہور آجاتیں ۔ اور مجھے واپسی کے لئے کہتیں ۔ تو مجھے واپس چلے جانے میں کوئی تامل نہ ہوتا ۔ اب جب کہ میں دہلی سے صرف چالیس کوس دور ہوں ۔ یہ مناسب نہیں سمجھتا ۔ کہ بادشاہ سے ملے ۔ اور دہلی میں داخل ہوئے بغیر واپس چلا جاؤں ۔ تاہم بیگم کے کہنے پر اس نے عماد الملک کے نام تسلی کے خطوط لکھے ۔

احمد شاہ ابدالی ۲۸ جنوری ۱۷۵۷ء کو دہلی پہنچا ۔ دہلی میں بے پناہ لوٹ مار مچائی گئی ۔ امراء سے بھاری رقومات وصول کی گئیں ۔ بقول سیر المتاخرین ۔

[۱] گنڈا سنگھ ، احمد شاہ درانی ، ص ۱۵۲ ، ۱۸۶

[۲] عماد الملک نے بیگم کے توسط سے اپنی حرکت کی معافی مانگی (فقیر خیرالدین محمد ، عبرت نامہ ، الیٹ ڈاسن جلد ہشتم ، ص ۲۴۱

"دست بتاراج اموال و ناموس سکنۂ شہر دراز کرد۔ و دقیقہ از نہب و غارت مہمل نگذاشت، اہل غیرت خود را بسم و سلاح، ہلاک کردند[1]"

حضرت بیگم دختر محمد شاہ کو اپنے عقد میں لیا۔ اور عالمگیر ثانی کی بیٹی کا نکاح اپنے لڑکے تیمور شاہ سے کیا۔ متھرا اور آگرہ میں جہان خان کے زیر قیادت بے پناہ قتل عام اور لوٹ مار ہوئی۔

---

[1] احمد شاہ درانی نے بواسطہ سردار جہاں خاں کے انتظام الدولہ خان خاناں پسر قمر الدین خان وزیر سے چالیس پچاس لاکھ روپیہ طلب کیا۔ اور فرمایا کہ اگر اس قدر روپیہ مجھ کو دے تو میں عہدۂ وزارت اور مدار المہامی ہندوستان کی اس کو عنایت کروں۔ انتظام الدولہ مذکور نے باوجود طلب مکرر بسبب خِسّت اور بخل کے دینا روپیہ کا قبول نہ کیا۔ تب سردار ممدوح کہ واسطہ اور مربی انتظام الدولہ کا تھا۔ اس کے انکار سے ناخوش اور ناراض ہوا۔ اور محرم خاں خواجہ سرا نے فرمایا۔ کہ اس شخص کا مال و اسباب تلاش کر کے اس کے سب مکانات کھدوا ڈالے۔ چنانچہ بعد از تفحص اور کھود نے مکانات انتظام الدولہ کے ایک مکان میں ڈو کروڑ روپیہ کی اشرفیاں ایک حوض میں نکلیں۔ اور قریب ایک کروڑ روپیہ کے اور اسباب مثل جواہرات اور ظروف طلائی و نقرئی بھی ہاتھ آیا۔ یہ سب خزانہ شاہی میں داخل ہوا۔ اس کے بعد اصلاح عالمگیر ثانی جو کی مہرہ سب امیروں اور نابروں کے دروازے پر بٹھایا گیا۔ کہ ان سب سے روپیہ تحصیل کر کے داخل خزانہ شاہی کریں۔ مغلانی بیگم زوجہ میر منو کہ سب امرائے شاہ جہان آباد کے حال سے بخوبی واقف تھی۔ اس نے ہر شخص کا حال سردار جہاں خاں سے مفصل بیان کیا۔ اور سب اہل بیت کا گھر لٹوایا۔ خصوصاً قمر الدین خاں کا مال و اسباب جزو کل ضبط کرایا۔ اور شولہ پوری بیگم زوجہ قمر الدین خاں مرحوم خوشدامن اپنی کو قید کرا کے کمال جبر و تکلیف سے روپیہ اور جواہرات وغیرہ حاصل کیا۔ الغرض بہت کچھ مال و اسباب ارباب دولت شاہ جہان آباد کا اس عورت نے شاہ درانی کو دلوایا۔ اور تمام فوج درانیہ دولت و زر سے مالا مال ہو گئی۔

مفتی عبدالکریم، واقعات درانی، اردو ترجمہ، ص ۲۴-۲۵

پنجاب کی صورت حال

صوبائی نظم و نسق میں پہلے ہی کوئی استحکام نہ تھا۔ ابدالی کے تازہ ترین حملے کے نتیجے میں حکومت کا رہا سہا انتظام معطل اور امن و امان ختم ہو چکا تھا۔ ہر طرف زمینداروں نے علم بغاوت بلند کر رکھا تھا ذرائع مواصلات منقطع تھے۔ چھوٹے چھوٹے سرداروں نے بھی اس افراتفری سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور خوب ہاتھ رنگے۔ کنج پورہ کے نجابت خاں نے اپنے افغان دستوں کو ابدالی کی فوج کا لباس پہنا کر لوٹ مار مچا رکھی تھی۔ تقریباً تمام لوگ گھروں کو چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں کا رخ کر چکے تھے۔

سکھوں نے اس موقع سے حسب معمول فائدہ اٹھایا۔ اور پورے علاقے میں لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ آدینہ بیگ کے فرار ہو جانے کی وجہ سے جالندھر دوآب بالکل لاوارث ہو چکا تھا۔ یہ علاقہ ان کی غارت گری کا خاص ہدف بنا۔ گپتا کے الفاظ میں

"سکھوں نے پورے دوآب میں لوٹ مار اور غارت گری مچا دی۔ اور اپنے مخالفوں سے انتہائی بے رحمانہ سلوک کیا۔[1]"

"جب ابدالی نے دہلی سے لاہور کی طرف واپسی کا سفر اختیار کیا۔ تو سکھوں نے اس کے لشکر پر کئی بار حملے کئے۔ اور اس کے مال غنیمت سے بہت کچھ لوٹ لیا[2]"

لاہور پہنچ کر ابدالی نے انتظامی امور طے کئے۔ سرہند، دوآبہ بست جالندھر، لاہور، کشمیر، ٹھٹھہ اور ملتان کے علاقے پنجاب میں شامل کر کے تیمور شاہ کو ناظم مقرر کیا۔ اور جہان خاں کو اس کا نائب بنایا۔ ہشت نگر کے محمد زئی سردار، عبدالصمد خان کو سرہند پر، سرفراز خاں کو دوآبہ بست جالندھر پر اور بلند خاں سدوزئی کو ملتان اور کشمیر پر مقرر کیا۔ اس سے پہلے دوآبہ بست جالندھر مغلانی بیگم

---

[1] ہسٹری آف دی سکھز، ص ۹۹-۱۰۰

[2] اگنڈا سنگھ، احمد شاہ درانی، ص ۱۸۷ - (۲) گپتا، ہسٹری آف دی سکھز، ص ۱۰۰

(۳) نارنگ، ٹرانسفارمیشن آف سکھزم، ص ۱۴۵

کو عطیۃً دیا گیا تھا۔ اسے منسوخ کر دیا گیا۔ بیگم کے لئے نئی صورت حال خوش گوار نہ تھی۔ اسے اپنے سارے خواب ٹوٹتے دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے ابدالی سے اصرار کیا۔ کہ جالندھر دوآب اسی کے پاس رہنا چاہئے۔ بیگم جہلم تک ابدالی کے ساتھ گئی۔ اور سابقہ وعدہ پورا کرنے کا مطالبہ کرتی رہی اور ابدالی اپنے بیٹے کے تحت پنجاب میں ایک مضبوط حکومت قائم کرنے کا خیال رکھتا تھا۔ جالندھر دوآب مغلانی بیگم کو دے دیتے سے لاہور اور سرہند کا رابطہ منقطع ہو جاتا۔ نیز شمالی پہاڑی علاقے جموں کشمیر سے بھی تعلق قائم نہ رہتا۔ چنانچہ ابدالی نے اسے کہا کہ اب تمہارا بھائی تیمور شاہ حکمران ہے۔ تم لاہور میں رہو۔ اور حکومت سے سالانہ تیس ہزار روپیہ وظیفہ لیتی رہو۔ لیکن بیگم نے یہ پیشکش ٹھکرا دی۔ شاہ نے کوشش کی کہ شاہ ولی خاں اور جہاں خاں اسے اس امر پہ آمادہ کریں۔ تاہم بیگم مصر رہی۔ اور مایوس لوٹی۔ اس کے آخری ایام تنگ دستی اور غربت کے عالم میں گزرے[1] سنہا نے لکھا ہے۔

Thus the Begum found to her great mortification that the dishonourable part that she had played only brought shame and ruin on so many noble families. [2]

ابدالی نے لاہور روانہ ہونے سے پہلے سکھوں کے خلاف ایک تادیبی کارروائی ضروری سمجھی چنانچہ اس نے ان کے خلاف مہم امرت سر کی طرف بھیجی۔ کئی سکھ مارے گئے۔ شہر تباہ و برباد کر دیا گیا۔ مقدس عمارات زمین بوس کر دی گئیں۔ تالاب، مٹی سے بھر دیا گیا۔ سکھ یہ علاقہ چھوڑ کر سانڈل بار اور جموں کی پہاڑیوں کی طرف چلے گئے۔ جہاں ان کا تعاقب آسان نہ تھا۔ ابدالی سکھوں کے خلاف مزید کارروائیاں کرنا چاہتا تھا۔ مگر موسم گرما کے آغاز اور افغانستان کے داخلی حالات نے اسے واپس جانے پر مجبور کر دیا۔[3]

---

[1] گنڈا سنگھ، احمد شاہ درانی، ص ۱۸۷

[2] رائز آف دی سکھ پاور، ص ۴۱

[3] (۱) گپتا، ہسٹری آف دی سکھز، ص ۱۰۰۔۱۰۱، (۲) گنڈا سنگھ، احمد شاہ درانی، ص ۱۸۸

چنانچہ اپریل ۱۷۵۷ء میں اس نے قندھار کی راہ لی۔

ابدالی نے پہلی بار پنجاب کو براہ راست اپنے دائرہ اختیار میں رکھنے کی ضرورت محسوس کی۔ اس کے چلے جانے کے بعد اب پنجاب کی حکومت آئینی طور پر تیمور شاہ اور عملی طور پر اس کے نائب سردار جہاں خاں کے ہاتھوں میں تھی[1] اس حکومت کے سامنے مسائل کا ایک انبار تھا۔ سب سے پہلا مرحلہ امن و امان کی بحالی تھا۔ ہر طرف اضطراب اور افراتفری کا دور دورہ تھا۔ آدینہ بیگ، ابدالی کی واپسی کے ساتھ ہی جالندھر دوآب کی طرف لوٹ آیا۔ اب وہ اپنی منتشر فوج کو جمع کرنے اور سکھوں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جہان خاں آدینہ کی اہمیت سے بخوبی آگاہ تھا۔ اس نے تیمور شاہ کی طرف سے اسے لکھا۔ کہ

> "یہ صوبہ ہمارے نام ہے۔ تمہیں فوراً ہمارے پاس حاضر ہو جانا چاہئے۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا۔ تو پورا دوآب تباہ و برباد کر دیا جائے گا اور تم سے پہاڑیوں میں بھی اگر نمٹا جائے گا۔"[2]

آدینہ بیگ کی طرف سے کوئی جواب نہ ملنے کی صورت میں جہان خاں نے دوآب کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ متعدد دیہات لوٹ مار کی زد میں آئے۔ آدینہ بیگ نے خطرہ کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے جہان خاں کو لکھا۔ کہ وہ اس صورت میں دوآبہ کا انتظام سنبھالنے کے لئے تیار ہے۔ بشرطیکہ اسے لاہور دربار میں حاضری سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ آدینہ بیگ کی سیاسی اہمیت[3]، انتظامی اہلیت، اور مالیاتی

---

[1] اسی سیاسی تبدیلی پر وارث شاہ نے اپنی "ہیر" میں لکھا ہے۔ "حکم نور دا ہور راج ہو گیا اج ملی پنجاب قندھار یاں نوں" (بحوالہ محمد اسلم، سرمایہ عمر، ص ۱۰۳۔ لاہور ۱۹۷۶ء)

[2] طہماس نامہ، ص ۵۱

[3] آدینہ بیگ کے پاس دس ہزار کے لگ بھگ ذاتی فوج موجود تھی (سنہا، رائز آف دی سکھ پاور، ص ۴۳) مفتی علی الدین نے لکھا ہے۔ "آدینہ بیگ خاں از بس زیرک و ہشیار بود،" (بقیہ حاشیہ ص ۱۷۰ پر)

جہارت کے پیشِ نظر اس کی شرط منظور کر لی گئی[1] ۔ اس کے وکیل دلا رام نے تیمور شاہ سے ملاقات کی ۔ طے پایا کہ آدینہ ۲۶ لاکھ روپیہ ادا کرے گا ۔ اس طرح آدینہ بیگ کو ہموار کر لیا گیا ۔ مفاہمت نہ ہونے کی صورت میں وہ فوری طور پر ایک خطرناک حریف ثابت ہو سکتا تھا ۔ اگرچہ بہت جلد یہ مفاہمت ختم ہو گئی ۔ تاہم افغان حکومت کے ابتدائی ایام میں اس کی اطاعت سے ایک انتہائی اہم خطے میں سازگار فضا پیدا ہو گئی طہماس بیگ خان لکھتا ہے ۔ کہ رفتہ رفتہ صوبے میں امن وامان اور عدلیہ بحال ہونے لگی تیمور شاہ کے پاس دس سے پندرہ ہزار افغان سپاہی تھے ۔ اس کے علاوہ ہندوستانی سپاہیوں پر مشتمل ایک بڑی فوج تیار کی گئی[2] جادو ناتھ سرکار نے لکھا ہے ۔

Justice was done in the Capital and the district, and the roads became safe for traffic once more.[3]

سکھ

سکھوں کی جدوجہد ایک طویل سفر سے گزرنے کے بعد اب فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو رہی تھی ۔ ابدالی نے اگرچہ واپسی سے پہلے سکھوں کے خلاف ایک مہم بھیجی ۔ تاہم وہ ان کے خلاف کوئی ٹھوس کارروائی نہ کر سکا ۔ اس نے جاتے ہوئے جہان خاں کو ہدایت کر دی ۔ کہ سکھوں کو پوری طرح کچل دے ۔ جہان خاں نے جلد ہی ان کے خلاف کارروائیوں کا آغاز کر دیا ۔ ہر جگہ سکھوں کا تعاقب کیا گیا ۔ حتیٰ کہ انھیں دامانِ ہمالیہ اور مالوہ کے صحراؤں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا گیا ۔

بقیہ حاشیہ ص ۱۶۹ بنا علیہ ہر کارہ ہای خبر رساں نزد ہر امیر و وزیر و راجہ و سردار تعیین میداشت ، دریں صورت مطلع از فریب ہر یک بودہ بدام فریب احدی نمی آید (عبرت نامہ جلد اول ، ص ۲۱۸)

[1] گپتا ، لیٹر مغل ہسٹری آف دی پنجاب ، ص ۸۸

[2] طہماس نامہ ، ص ۵۲

[3] فال آف دی مغل ایمپائر ، جلد دوم ص ۶۷

ایک سکھ سردار دیپ سنگھ نے پانچ ہزار سکھ جمع کر کے امرت سر کا رخ کیا[1] ۔ طہماس بیگ نے لکھا ہے ۔ کہ نومبر ۱۷۵۷ء ایک روز خبر ملی ۔ کہ سکھوں کی بہت بڑی تعداد چک گورو (امرتسر) میں جمع ہے ۔ اور آس پاس کے علاقے میں گڑبڑ پیدا کر رہے ہیں ۔ اس علاقے میں حاجی عطائی خاں کے زیر قیادت مخصوص دستے بحالیٔ امن وامان کے لئے مامور تھے ۔ جہان خاں نے عطائی خان کو اس گڑبڑ کے متعلق خط لکھا ۔ اسے تحریر کیا ایک مقررہ دن وہ اچانک پیش قدمی کر کے امرت سر پہنچ جائے ۔ وہ خود بھی مقررہ وقت پر وہاں پہنچ جائے گا اور دونوں فوجیں متحد ہو کر اچانک سکھوں کو جا لیں گی ۔

لاہور میں یہ حکم مشتہر کروایا گیا ۔ کہ ہر اس شخص کو جس کے پاس گھوڑا ہے ، وہ سرکاری ملازم ہے یا نہیں ۔ وزیر کے ساتھ اس مہم میں شامل ہونا پڑے گا ۔ دو ہزار گھڑ سواروں کو لے کر جہان خاں لاہور سے روانہ ہوا ۔ اگلے روز امرتسر سے پانچ میل ادھر موضع گوکر وال پہنچے ۔ یہیں مقررہ وقت پر عطائی خاں کو پہنچنا تھا ۔ مگر باوجود سخت احکام کے وہ ابھی تک نہ پہنچا تھا ۔ سکھوں کو ان کی آمد کی خبر ہو گئی اور انھوں نے چاروں طرف سے حملہ کر دیا ۔ زوردار لڑائی چھڑ گئی ۔ سکھوں نے محاصرہ کو تنگ کرنا شروع کر دیا ۔ ان کا دباؤ اس قدر بڑھا کہ بہت سے لوگ مایوس ہو گئے اور بھاگنے کی فکر کرنے لگے ۔ جہان خاں نے اس موقع پر پامردی اور مستعدی کا مظاہرہ کیا ۔ بھاگنے والوں کو اس نے تلوار سے کچوکے دیئے ۔ اور بہت ذلیل کیا ۔ اس کے علاوہ سکھوں کا گھیرا اتنا مکمل اور مضبوط تھا ۔ کہ اس میں سے فرار ہونا ناممکن تھا ۔ چنانچہ اب جہان خاں کی مختصر سی جمعیت نے دل وجان سے لڑنا شروع کر دیا ۔ تاہم ان کے وسائل قریب الختم تھے ۔ عین اس وقت حاجی عطائی خان اپنے تازہ دم مضبوط دستے لے کر پہنچ گیا ۔ بے شمار سکھ تلواروں اور توپوں کی نذر ہو گئے ۔ انھیں بھرپور شکست ہوئی ۔ چک گرو تک ان کا پیچھا کیا گیا ۔ یہیں لاہور کے ممتاز امیر مرزا نعمت اللہ نے انتقال کیا[2] ۔

---

[1] گپتا ، ہسٹری آف دی سکھز ، ص ۱۰۵

[2] طہماس نامہ ، ص ۶۱ - ۶۲

دیپ سنگھ اور اس کے پانچ جتھہ دار بہت سے دیگر سکھوں کے ہمراہ مارے گئے۔[1] اس کے بعد سکھ افغان حکومت سے مسلسل نبرد آزما رہے۔ تاہم جب آدینہ بیگ لاہور کی افغان حکومت کے خلاف خم ٹھونک کر میدان عمل میں آیا۔ تو سکھوں نے اس سے تعاون کیا۔ اور اسی کی بدولت آدینہ بیگ بہت جلد حکومت کے لئے زبردست خطرہ بن گیا۔

لاہور میں آدینہ بیگ کا وکیل دلارام دربار میں اس کی نمایندگی کرتا تھا۔ اسی کے توسط سے واجبات کی ادائیگی قرار پائی تھی۔ دربار میں آدینہ بیگ کے چند حاسدوں نے تیمور شاہ کو اس کے خلاف بھڑکایا۔

"عرض گوئی بحضور شاہزادہ عرض نمود کہ آدینہ بیگ خاں مال لکھہا روپیہ دارد و از احضار دربار شاہی احتراز کلی دارد۔ اگر مشار الیہ یاد حضور فرمایند۔ البتہ حاضر نخواہد شد۔ بدیں تقصیر او را محبوس نمودہ از بے شمار بگیرند و نیز انتظام ملک خاطر خواہ خواہد شد[2]"

چنانچہ تیمور شاہ نے جہان خاں سے کہا کہ آدینہ بیگ کو لاہور طلب کیا جائے۔

جہان خاں نے آدینہ بیگ کو لکھا۔ کہ وہ لاہور آئے۔ اس سے سکھوں کے خلاف اقدامات کے ضمن میں مشورہ مطلوب ہے۔ آدینہ بیگ افغان حکام کے اصلی عزائم بھانپ چکا تھا۔ اس نے جواباً لکھا۔ کہ اس علاقے میں انتظامی مصروفیات کی وجہ سے اس کا لاہور آنا ناممکن ہے۔ اس نے اپنے علاقے کے معزز افراد شہاب خاں بگو والیہ، چوہدری صاحب خاں نوشہریا، دھرم داس زنجیا، چوہدری جودھا ناگری اور ابراہیم کپور تھلیہ کو قیمتی تحائف کے ساتھ لاہور روانہ کیا اور " مستدعی، عفو تقصیرات عدم احضار گردید۔[3]" افغان حکام اس سے مطمئن نہ ہوئے اور انھوں نے آدینہ بیگ کے خلاف فوجی کارروائی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ اقدام درحقیقت افغان حکومت کے زوال کا نقطۂ آغاز اور آدینہ بیگ کے سیاسی کردار کا نقطۂ عروج ثابت ہوا۔

---

[1] گپتا، ہسٹری آف دی سکھز، ص ۱۰۷۔ اس لڑائی کے بعد سے سکھ دیپ سنگھ کے جتھے کو شہیدی جتھہ کہنے لگے۔

[2] (۱) مفتی علی الدین، عبرت نامہ، ص ۲۱۹ - (۲) گنڈا سنگھ، احمد شاہ درانی، ص ۱۹۳-۱۹۴

[3] احوال آدینہ بیگ خان، ورق ۵۴ ب

باب ١٢

آدینہ بیگ خان

دسمبر ۱۷۵۷ء ——— ستمبر ۱۷۵۸ء

آدینہ بیگ نے لاہور حاضر ہونے سے جو انکار کیا تھا۔ اسے اس کے نتائج و عواقب کا بخوبی احساس تھا۔ آدینہ کے ہرکاروں نے اسے اطلاع دی۔ کہ بہت جلد اس کے خلاف فوجی کارروائیاں متوقع ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی فوجوں کے ساتھ بالائی پہاڑی علاقے کی طرف چلا گیا۔

اس دوران سکھوں کے ساتھ افغان حکومت کا براہ راست تصادم شدت اختیار کر چکا تھا۔ دسمبر ۱۷۵۷ء میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کے بعد سکھ ہر طرف اٹھ کھڑے ہوئے اور ملکی امن و امان کو غارت کر کے رکھ دیا۔ دو افغان سپاہی سرہند سے آ رہے تھے۔ اتفاقاً قلعہ کرت پور کے علاقے میں مارے گئے۔ اس علاقے کا چودھری ایک ممتاز سکھ سردار سوڈھی بدھاگ سنگھ تھا۔ جہان خاں کے فرستادہ افراد نے اسے بے حد پریشان کیا۔ حتیٰ کہ وہ بھاگ گیا۔ اور اس کے بعد اس علاقے کے سکھوں نے عام باغیانہ روش اختیار کر لی[1] وہ شوالک کی پہاڑیوں میں ہوشیارپور کے شمال کی طرف چلے گئے۔ اور ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت آدینہ بیگ کے ساتھ شامل ہو گئے۔

عین اس موقع پر خواجہ مرزا خاں، جہان خاں کا ساتھ چھوڑ کر آدینہ بیگ سے آملا۔ افغان وزیر سے مرزا خاں کا نباہ اس لئے ممکن نہ ہو سکا۔ کہ وہ اسے برسرِ عام سکھوں کے ساتھ ساز باز کا الزام دیتا

---

[1] طہماس نامہ، ص ۶۲-۶۳

تھا۔جہان خاں ذاتی عداوت کی وجہ سے بھی اسے سرعام ذلیل کیا کرتا تھا۔مرزا خان کی شمولیت آدینہ بیگ کے لیے نہایت خوش آئندہ ثابت ہوئی۔

آدینہ بیگ کے خلاف افغان حکام کی فوجی کاروائیاں

جہان خاں پہلے ہی آدینہ بیگ کے خلاف فوجی کاروائی کا فیصلہ کر چکا تھا۔مرزا خاں کے فرار اور آدینہ بیگ کے ساتھ شمولیت نے اس فیصلے کو تقویت بخشی۔ملتان کے حاکم مراد خاں کو دس ہزار سپاہ کے ہمراہ لاہور طلب کر لیا گیا۔سرفراز خاں کو دوآبہ کا فوجدار اور بلند خاں کو اس کا نائب مقرر کیا۔یہ دونوں مراد خاں کے زیر کمان ایک بھاری فوج لے کر روانہ ہوئے۔آدینہ بیگ نے دوسری طرف صادق بیگ خاں نائب گورنر سرہند اور راجہ بھوپ سنگھ کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔سوڈی بدھاگ سنگھ اور جسا سنگھ اہلووالیہ بھاری رقوم کی ادائیگی کے وعدے اور مال غنیمت کے حصول کی خاطر اس کے ساتھ آ گئے۔اور بھاری سکھ جمعیت اس کے ہمراہ ہو گئی۔

مراد خاں نے اپنے دستوں کے ہمراہ دریائے بیاس عبور کر کے جنوب مشرق کا رخ کیا۔کیونکہ اسے خبر ملی تھی۔کہ آدینہ بیگ ہوشیار پور کے علاقے میں ستلج کے کنارے موجود ہے۔آدینہ بیگ پچیس ہزار سواروں کے ہمراہ پہاڑیوں سے اترا۔دونوں فوجیں ضلع ہوشیار پور میں ماہل پور کے مقام پر ایک دوسری سے نبرد آزما ہوئیں۔سکھوں کے لیے آدینہ کے مسلح دستوں اور افغان فوج میں امتیاز مشکل تھا۔چنانچہ طے پایا۔کہ آدینہ بیگ کے دستے اپنے سر پر گھاس کے گچھے باندھیں گے۔افغان دستے ہلکے توپ خانے سے مسلح ہونے کے باوجود آدینہ بیگ کے دستوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔اور بری طرح شکست کھائی۔ساز و سامان حرب سکھوں کے ہاتھ آیا۔بلند خاں مارا گیا۔اور مراد خاں لاہور بھاگ گیا۔فتح کے بعد سکھ پورے دوآبہ پر پل پڑے۔جالندھر شہر کے حاکم سعادت خاں آفریدی کو بھی شکست ہوئی۔سکھوں نے شہر پر قبضہ کر لیا۔اور لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔آدینہ بیگ نے سکھوں کو روکنے کی کوشش نہ کی۔ہری رام گپتا کے الفاظ میں۔

Here they gave loose rein to their passion of revenge, indulging in the general plunder and massacre of their enemies. Children were put to the sword, women were dragged out and forcibly converted to Sikhism. Many of them carried off Muslim women of Jallandhar as wives. The mosques of the town were defiled by pig's blood. [1]

آخر کار آدینہ بیگ آیا اور اس علاقے کو سکھوں کی غارت گری سے نجات دلائی ، انھیں سوالاکھ روپیہ ادا کیا۔وہی جالندھر دوآب جس میں آدینہ بیگ کے نظم و نسق کے بارے میں طہماس بیگ خاں نے لکھا ہے کہ

> "دوآب میں آدینہ بیگ کا نظم و نسق اتنا شاندار تھا۔کہ اس کے عہد میں ایک شکایت بھی سننے میں نہیں آئی تھی۔اس کی حدود میں شاہراہیں ڈاکہ زنی سے کلیتاً محفوظ تھیں [2]"

گردشِ دوران کے ہاتھوں یہ خطہ اسی کے ایما سے پامال ہوا۔

جہان خاں کو اس شکست سے بہت تشویش ہوئی۔خواجہ عابد خاں کی زیر قیادت ایک اور مہم بھیجی گئی۔سکھوں سے اس کا ٹکراؤ ہوا۔اور شکست ہوئی۔اس کے بعد تو بقول طہماس بیگ یہ معمول بن گیا۔کہ افغان فوجیں جہاں بھی گئیں۔ناکام رہیں۔اور بری طرح پٹیں۔آدینہ بیگ اپنے صدر مقام میں پہنچ گیا۔اور سکھوں نے اپنی کاروائیوں کا سلسلہ لاہور کے گرد و نواح تک دراز کر دیا۔ہر روز ہزاروں سکھ لاہور اور اس کے گرد و نواح پر جا پڑتے۔کوئی ان کا مقابلہ کرنے کے لیے شہر سے باہر نکلنے کی جرأت نہ کرتا۔شام ہوتے ہی شہر کے دروازے بند کر دئے جاتے [3]

جہان خاں نے آدینہ بیگ سے نمٹنے کے لئے ایک بھاری فوج کے ہمراہ خود لاہور سے کوچ کیا

---

[1] گپتا سٹڈیز ص ۹۰ ، گنڈا سنگھ ، احمد شاہ درانی ص ۱۹۶ - ۱۹۷

[2] طہماس نامہ ص ۶۴ [3] ایضاً ص ۶۲

آدینہ بیگ کھلی جنگ کے لیے تیار نہ تھا۔ کیونکہ گزشتہ جنگ کے بعد اس کے دستے کمزور ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ اس کے حلیف سکھ دوآبہ کی لوٹ مار میں مصروف تھے۔ اور منتشر ہو چکے۔ اس کے علاوہ ابھی اس نے شہزادے اور اس کے وزیر سے مفاہمت کے امکانات کو مسترد نہیں کیا تھا چنانچہ وہ اپنی پرانی پناہ گاہ کھلی بلوان کی پہاڑیوں میں چلا گیا۔ جہاں تک بآسانی رسائی ممکن نہ تھی۔ جہاں خاں نے سرفراز خاں کو جالندھر دوآب کا نگران مقرر کیا۔ اور خود لاہور لوٹ آیا۔ لیکن سرفراز خاں صورت حال کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ سکھوں کی شورشیں جاری رہیں۔ اب تک آدینہ بیگ کو سکھوں کا بے پناہ تعاون حاصل رہا تھا۔ اس کی فوجی کامیابیوں کا دار و مدار بہت حد تک سکھوں پر تھا۔ تاہم اس کے سیاسی اور شاطر ذہن نے بہت جلد محسوس کر لیا۔ کہ اس کا اور سکھوں کا راستہ الگ الگ ہے۔ ہندوؤں اور سکھوں پر ایک محدود مدت کے لئے تو بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ مگر مستقلاً وہ اس کے لیے قابل اعتماد ثابت نہیں ہو سکتے۔ سکھوں کے پیش نظر اپنا نصب العین یعنی سکھ حکومت کا قیام تھا۔ اور اب ان کی طویل کشمکش ایک فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکی تھی ——— آدینہ بیگ کی ساری سیاسی جد و جہد پنجاب پر قبضہ کرنے کے گرد گھوم رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ حالات کا دھارا اسی رفتار سے بہتا رہا۔ تو اس کا سکھوں سے تصادم ناگزیر ہے چنانچہ اس کے سیاسی ذہن نے ایک ایسی ترکیب سوچی جس کے رد عمل ہونے سے پنجاب کے سیاسی افق پر ایک نئی طاقت جلوہ گر ہو گئی۔ یہ تھے مرہٹے۔

مرہٹے

ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں مرہٹوں کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ دکن سے تعلق رکھنے والی یہ جنگجو قوم تاریخ کے ہر دور میں برسرپیکار رہی ہے۔ مغلوں کے ساتھ ان کی کشمکش کا آغاز گو ابتدا سے ہی ہو گیا تھا۔ تاہم مغل حکمرانوں کی مصلحت آمیز پالیسیوں کی وجہ سے بات بگڑ نہ سکی۔ اورنگ زیب کے زمانے میں آ کر مرہٹوں کی سیاسی اور فوجی حیثیت نے نیا انداز اختیار کیا۔

اورنگ زیب نے اپنی زندگی کے آخری بیس سال دکن میں مرہٹوں سے جنگ کرنے میں صرف

کئے تھے۔ ۲۵ دسمبر ۱۶۸۱ء کو وہ برہان پور پہنچا تھا۔ اس کے بعد آخری لمحات (۳ مارچ ۱۷۰۷ء) تک وہ مرہٹوں سے نبرد آزما رہا۔ جغرافیائی حالات کی بنا پر مرہٹوں کا مکمل خاتمہ ناممکن ہو گیا تھا۔ لیکن تمام مشکلات کے باوجود اس نے مرہٹوں کے ایک مرکز اور اجتماعی قوت کا خاتمہ کر دیا۔ یہ صحیح ہے۔ کہ ان کی اجتماعی طاقت کے منتشر ہونے کے بعد عالمگیر کو بجائے ایک جگہ کے مختلف مقامات پر ان کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اور اس طرح اس کا کام اور زیادہ مشکل ہو گیا۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ چند سال اورنگ زیب کے جانشین پوری طرح جد و جہد کرتے۔ تو مرہٹوں کی سیاسی طاقت کا خاتمہ ہو جاتا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد مرہٹوں کی طاقت میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔ دکن اور گجرات کی صوبہ داری پر امراء آپس میں جھگڑتے تھے۔ اور مرہٹوں کی طاقت میں اضافہ ہوتا تھا[۱]

جب مرہٹوں کا طوفان شمال کی جانب اُمڈتا تھا۔ تو اس کا مقابلہ کرنے کی بجائے حکومت کی طرف سے مرہٹوں کو مراعات دے دی جاتی تھیں۔ تاکہ وقتی طور پر یہ طوفان رک جائے۔ ان مراعات نے مرہٹوں کی ہمت بڑھا دی۔ جب فرخ سیر اور سید برادران میں کشمکش ہو رہی تھی۔ تو سید حسین علی خاں نے دکن میں مرہٹوں کو اپنا ساتھی اور مددگار بنانے کی نیت سے بالاجی وشواناتھ کو تمام دکن سے چوتھ اور سردیش مکھی وصول کرنے کا حق دے دیا۔ بادشاہ نے اس حق کو تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ تو حسین علی خاں فروری ۱۷۱۹ء میں مرہٹوں کی فوج کے ساتھ دہلی پر حملہ آور ہوا۔ یہ واقعہ اس ماحول میں جو عالمگیر کی وفات کے بعد پیدا ہو گیا تھا۔ کچھ غیر معمولی نہ تھا۔ لیکن جس دن حسین علی خاں مرہٹوں کو اپنا مددگار بنا کر مغلوں کے دار السلطنت میں لایا تھا۔ اس دن درحقیقت مغلیہ سلطنت کے اقتدار پر ایک ضرب کاری لگی۔

مرہٹوں کا اس وقت دہلی میں آنا ان کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ تھا۔ وہ اس وقت ملازمین کی حیثیت سے نہیں بلکہ مددگار کی حیثیت سے آئے تھے۔ بالاجی وشواناتھ کے بعد اس کے بیٹے باجی راؤ (۱۷۲۰ء ——— ۱۷۴۰ء) نے مالوہ اور گجرات سے خراج وصول کیا اور بندھیل کھنڈ پر قبضہ کر لیا۔ ۱۷۳۲-۳۳ء میں

---

[۱] سرکار، فال آف دی مغل ایمپائر، اول، ص ۶۷

سکھ خاص طور پر سرہند کی سرزمین سے ازلی بغض رکھتے تھے ۔ چنانچہ انھوں نے آدینہ بیگ سے وعدہ لے لیا ۔ کہ سکھ شہر لوٹنے کے لیے سب سے پہلے اندر داخل ہونے کے مجاز ہوں گے ۔ عبدالصمد خاں محمد زئی فوجدار سرہند نے دفاعی تیاریاں شروع کر دی تھیں ۔ مرہٹہ لشکر نے محاصرہ کر لیا ۔ افغان حکام قلعہ بند ہو گئے ۔ چند روز سے زیادہ مدافعت نہ کر سکے ۔ ۲۱ مارچ ۱۷۵۸ء کو سرہند فتح ہو گیا ۔ عبدالصمد خاں اور جنگ باز خاں گرفتار ہو گئے ۔ قبضہ ہوتے ہی لوٹ مار شروع ہو گئی ۔ گپتا نے تاریخ عالم گیر ثانی کے حوالے سے لکھا ہے ۔

The Marathas and the Sikhs knew nothing but plundering, they thoroughly looted the inhabitants of S rhind high and low, that none either male or female had a cloth on his or her person left, they pulled down the houses and carried off the timber.[1]

سکھ سب سے پہلے شہر میں داخل ہوئے اور لوٹ مار کی ۔ اس کے بعد مرہٹے غارت گری میں شامل ہو گئے ۔ تیسرے دن آس پاس کے دیہات کے لوگ بھی ساتھ آ ملے اور جو کچھ ہاتھ آیا لے گئے حتیٰ کہ امراء کی حویلیاں اور عام مکانات زمین بوس کر دئے گئے ۔ اور لوگ لکڑیاں تک اٹھا کر لے گئے ۔ مرہٹے سکھوں سے حسد کرتے تھے جنھوں نے سرہند کی لوٹ مار میں زیادہ حصہ لیا تھا ۔ دونوں طاقتوں میں ایک جھڑپ بھی ہوئی تاہم بات بڑھنے نہ پائی ۔ اور جلد ہی صلح ہو گئی ، اس موقع پر یہ طے پایا ۔ کہ دونوں کے تصادم کے خدشے سے بچنے کے لیے سکھ جن کی تعداد پندرہ ہزار تھی ۔ لاہور کی طرف پیش قدمی کے وقت مرہٹوں سے دو منزل آگے رہیں گے ۔[2]

---

[1] (۱) ہسٹری آف دی سکھز ، ص ۱۱۵

(۲) لیٹر مغل ہسٹری آف دی پنجاب

[2] گنڈا سنگھ ، احمد شاہ درانی ، ص ۱ ــ ۲۰۰

مرہٹوں کے محاصرۂ سرہند کی خبریں جہان خاں کو پہنچ چکی تھیں ۔ وہ فوراً فوج لے کر لاہور سے نکلا ۔ سقوطِ سرہند کی خبر سنتے اور یہ اطلاع ملنے پر کہ مرہٹہ فوج تیزی سے لاہور کی سمت آ رہی ہے ، جہان خاں نے جلدی سے لاہور واپسی اختیار کی ۔

افغانوں کے لیے اب پنجاب کی سرزمین تنگ ہوتی جا رہی تھی ۔ آدینہ بیگ ، مرہٹوں اور سکھوں کی بھاری جمعیت کے ہمراہ فتح و نصرت کے نقارے بجاتا ، تیزی سے لاہور کی طرف آ رہا تھا ۔ افغانوں کے پاس مختصر سی جمعیت تھی ، بھاری توپ خانے کا فقدان تھا ۔ جس کی مدد سے قلعہ بند ہو کر محاصرین کو دور رکھا جا سکتا ۔ احمد شاہ ابدالی کی طرف سے فوری امداد متوقع نہ تھی ۔ دوست کم تھے اور دشمن زیادہ ۔

چنانچہ ۷ ؍ اپریل کو جہان خاں نے بڑی سوچ بچار کے بعد یہ دانش مندانہ فیصلہ کیا کہ لاہور چھوڑ دیا جائے ، اور افغانستان کی راہ لی جائے ۔ راوی کے اس پار شاہدرہ میں اپنا کیمپ بنایا ، تیمور شاہ کی والدہ اور دیگر خواتین کو وہاں پہنچا دیا ۔ دیگر افغان سرداروں اور فوجوں نے اپنا مال و اسباب وہاں منتقل کر لیا ۔ جو سامان نہ لے جا سکے ، اسے نذر آتش کر دیا ۔ جوں جوں آدینہ بیگ کے نزدیک آنے کی خبریں آتیں ۔ افراتفری اور اضطراب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا ۔ صاحبانِ تخت و تاج کی کیفیت یہ تھی ۔ تو ظاہر ہے عام شہریوں کا حال کیا ہوتا ۔ ہری رام گپتا لکھتا ہے ۔

On this day the masterless city was in a state of utter confusion and terror, and robbers and marauders of the town and its neighbourhood were busy in the pludering people of their money and property.[1]

۱۸ ؍ اپریل کو صبح خبر آ گئی کہ آدینہ بیگ اور مرہٹہ سردار ماناجی نے بیاس عبور کر لیا ہے اور لاہور سے ۱۲ میل کے فاصلے پر پہنچ چکے ہیں ۔ اسی روز دوپہر کو تیمور شاہ نے دار الحکومت چھوڑ دیا ، جہان خاں اور دیگر افغان بھی اس کے ہمراہ تھے ۔

---

[1] ہسٹری آف دی سکھز ، ص ۱۱۶

اس رات طہماس بیگ شہر کا عمومی نگراں رہا۔ لکھتا ہے۔

"میں نے شہر کے دروازے بند کروادیئے۔ ساری رات میں پورے شہر میں گشت کرتا رہا۔
اگلے روز (۲۰ اپریل ۱۷۵۸ء) صبح نو بجے پانچ مرہٹہ گھڑ سوار اور خواجہ مرزا خان کے
ایک سو گھڑ سوار بہ قیادت عاشور علی خاں، دہلی دروازے کے سامنے نمودار ہوئے۔ میں
عاشور علی خاں کو جانتا تھا۔ میں نے فوراً دروازے کھلوا دئے اور شہر ان کے حوالے کردیا۔[1]

اگلے روز (۲۱ اپریل ۱۷۵۸ء) خواجہ مرزا خاں ایک ہزار مغل اور دس ہزار مرہٹوں کی معیت میں راوی کے کنارے پہنچا۔ تیمور شاہ اسی صبح وہاں سے کوچ کرچکا تھا۔ اس نے احتیاطاً میر حضرت خاں کو چند ہزار سپاہیوں کے ہمراہ یہاں رہنے دیا تھا۔ مرزا خاں نے دریا عبور کیا اور میر حضرت خاں پر جا پڑا۔ میر نے حتی الامکان لڑائی کو طول دینے کی کوشش کی۔ لیکن اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ حتیٰ کہ گرفتار ہوگیا۔ جب یہ خبر تیمور شاہ اور جہاں خاں تک پہنچی تو وہ سخت خوفزدہ ہوئے۔ انھوں نے جلدی جلدی وزیر آباد کے قریب سے دریائے چناب عبور کیا۔ خواجہ مرزا نے اپنے سپاہیوں اور بیس ہزار مرہٹوں کے ہمراہ راوی پار کیا اور افغانوں کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ چند دنوں میں اس کی فوج نے افغان کیمپ لوٹ لیا۔ بے پناہ مال غنیمت ہاتھ آیا۔

---

[1] طہماس نامہ، ص ۷۰ — چند مورخین نے لکھا ہے کہ اکیلے سکھوں نے تیمور شاہ اور جہان خاں کو نکالا، لاہور پر قبضہ کرلیا اور جسا سنگھ کلال نے حکومت سنبھال لی۔ اس نے سکہ بھی جاری کیا۔

(۲) مالکم، سکیچ آف دی سکھز، ص ۹۴-۹۵

(۳) لطیف، ہسٹری آف دی پنجاب، ص ۲۴۱

(۴) نارنگ، ٹرانسفارمیشن آف سکھز، ص ۱۴۸ — تاہم یہ بیان درست نہیں ہے۔ طہماس بیگ کی روایت شک و شبہ سے بالا ہے۔ اس کے علاوہ مرہٹہ ریکارڈز سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے (دیکھئے (۱) گپتا، ہسٹری آف دی سکھز، ص ۱۲۰، (۲) گنڈا سنگھ، احمد شاہ درانی، ص ۲۰۶)

مرہٹے چناب سے پار تعاقب جاری نہ رکھ سکے۔ کیونکہ دریا گہرا اور سرد تھا۔ اس مہم میں سکھوں کی طرف سے جو ممتاز سردار شامل تھے۔ ان میں چڑھت سنگھ سکر چکیہ، تارا سنگھ گھیبہ، جسا سنگھ اہلوالیہ، جسا سنگھ رام گڑھیہ، ہری سنگھ، لہنا سنگھ، گوجر سنگھ، اور جھنڈا سنگھ بھنگی شامل تھے۔[1]

آدینہ بیگ نے شالامار باغ میں ایک لاکھ روپیہ کی لاگت سے شاندار چبوترہ بنوایا۔ جہاں رگھوناتھ جلوہ افروز ہوا۔[2] باغ کے چشمے عرق گلاب سے رواں کئے گئے۔ سارے شہر میں چراغاں کیا گیا۔ رگھوناتھ پنجاب میں مستقلاً رہنے کا کوئی ارادہ نہ رکھتا تھا۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔

یہ علاقہ ان کے گھروں سے بہت دور تھا۔

رسل و رسائل کی سہولیات کا فقدان تھا

وہ ایک مخالف اور حریف آبادی کے درمیان زیادہ عرصہ تک محفوظ نہ رہ سکتے تھے۔

یہاں کی آب و ہوا ان کے لیے ناسازگار تھی۔

سرحدی صوبہ ہونے کی وجہ سے اور افغانوں سے براہ راست تصادم کے بعد اب ابدالی کی طرف سے جوابی کارروائی کا خدشہ ہر وقت موجود رہتا

دکن کی سیاسی صورت حال ان کی وہاں موجودگی کی متقاضی تھی

چنانچہ مرہٹوں نے پنجاب آدینہ بیگ کو سونپنے کا فیصلہ کیا۔ رگھوناتھ نے آدینہ بیگ کو نواب کا خطاب دیا۔ اور ۷۵ لاکھ کے عوض صوبہ پنجاب اس کے نام کردیا اور خود دہلی کی راہ لی۔[3] بیس بائیس سال قبل آدینہ بیگ نے جس سیاسی سفر کا آغاز کیا تھا۔ آج وہ منزل مراد سے ہم کنار ہوگیا۔

---

[1] گنڈا سنگھ، احمد شاہ درانی، ص ۲۰۶

[2] آدینہ بیگ خاں لکھ روپیہ بستہ راگھوجی مرہٹہ را بران نشانیدہ بتصدیق داد و فوارہ ہای پُر از گلاب کنانیدہ جاری کنانید۔
(علی الدین، عبرت نامہ، ص ۲۱)

[3] (۱) گپتا، لیٹر مغل ہسٹری آف دی پنجاب، ص ۹۱، (۲) باقر، آدینہ بیگ خاں، ص ۲۱

آدینہ بیگ خاں ——— بہ حیثیت ناظم پنجاب

اپریل ۱۷۵۸ء ——— ۱۵ ستمبر ۱۷۵۸ء

آدینہ بیگ نے خود لاہور میں قیام نہ کیا۔ خواجہ مرزا خاں کو جو اب اس کا داماد بھی تھا، لاہور کی حکومت سونپی اس کے بھائی خواجہ سعید خاں کو اس کا نائب مقرر کیا۔ اپنے پرانے ساتھی صادق بیگ خاں کو سرہند کی حکومت دی اور خود بٹالہ چلا گیا۔ اور اسے اپنا صدر مقام قرار دیا۔

آدینہ بیگ کے سامنے سب سے بڑا مرحلہ صوبے میں امن و امان کی صورت حال کو معمول پر لانا تھا۔ وہ ایک بے مثل منتظم مشہور تھا۔ اس نے فوراً صوبے کی حالت بہتر بنانے کے لیئے وسیع پیمانے پر کارروائیاں شروع کر دیں۔ ہری رام گپتا نے لکھا ہے۔

"آدینہ بیگ کڑے نظم و ضبط اور حُسنِ انتظام کے لیے خاصا معروف تھا۔ چنانچہ آفت رسیدہ عوام نے سُکھ کا سانس لیا۔ اُس نے تیس ؟ چالیس ؟ یوم میں امورِ مملکت کو استوار کرنے کے بعد شورش پسند عناصر کی طرف اپنی توجہ مرکوز کر دی [1] "

آدینہ بیگ نے نظم و نسق کی بحالی پر پوری کامل توجہ دی، وہ اس کی فوری ضرورت بھی تھی۔ کیونکہ اگر صوبے میں حالات پر امن اور معمول پر نہ ہوتے تو وہ ۷۵ لاکھ روپیہ کہاں سے آتا، جو اسے مرہٹوں کو ادا کرنا تھا ؟ جن دنوں وہ جالندھر دوآب کا فوجدار تھا۔ اس نے اس پُر شور اور اضطراب زدہ خطے میں بہترین انتظامی ڈھانچہ تشکیل دیا تھا۔ طہماس بیگ نے لکھا ہے۔

"آدینہ بیگ خاں فوجدار دوآبہ از وقت عبدالصمد خان پدر خاں بہادر کہ بصفت عدالت بود محالات دوآبہ را از قدیم بطریق استمراریعہ تعہد بر ذمہ خود میداشت و پیوستہ صوبہ دار از حسن سلوک و نیکو خدمتی، وادای از سال بہ سال از خود راضی میساخت و در تمامی ملک دوآبہ آنچناں طرح نظم

---

[1] ہیٹر مغل ہسٹری آف دی پنجاب ۔ ص ۹۱

و نسق انداختہ بود کہ احدی در اصل او نالشی و مستغاثی بریمی آمد و نشانی از قطاع الطریقاں در سرحد او ظاہر نمی گشت، و دیگر از اوصاف فراست و فہمید او تا کجی بنگارد کہ در امور عدالت کسی نظیر و عدیل او نبود [1] "

سکھ اور آدینہ بیگ

اب تک سکھ اس کے حلیف رہے تھے۔ آدینہ بیگ کا سارا سیاسی کردار سکھوں کے تعاون اور امداد سے عبارت ہے۔ تاہم جب اس نے ملک میں امن و امان کی بحالی کا کام شروع کیا۔ تو سکھوں کی لاقانونیت اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوئی۔ آدینہ بیگ کی خواہش تھی۔ کہ ملک میں زراعت و تجارت معمول کے مطابق شروع ہو جائے۔ اس نے سکھوں کو کئی بار اپنی غیر قانونی سرگرمیاں ختم کرنے کو کہا لیکن انھوں نے انکار کر دیا، اس پر آدینہ نے سکھوں کو طاقت کے بل پر مطیع کرنے کا عزم کیا۔

آدینہ کے پاس دس ہزار سوار و پیادہ پر مشتمل باقاعدہ سپاہ موجود تھی۔ سکھوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اس نے بھاری تعداد میں اضافی بھرتی کی۔ تمام اہم سرداروں اور زمینداروں کو اپنے ساتھ ملایا۔ اور انھیں کہا کہ فوجی جمعیت فراہم کریں۔ چنانچہ منظم انداز میں پنجاب کے حسب ذیل سردار زمیندار اور قبائل اس کے شانہ بہ شانہ سکھوں کے خلاف نکلے۔

سندھ ساگر سے ——— گکھڑ، جنجوعے، اور گھیبے زمیندار

چج دوآب سے ——— چودھری رحمت خاں وڑائچ

جموں سے ——— رنجیت دیو

دوآبہ رچنا سے ——— چوہدری پیر محمد چٹھہ، عزت بخش، مراد تحسین بھٹی، اور دیگر سردار

باری دوآب سے ——— راجہ گھمنڈ چند، ندھاں سنگھ رندھاوا، مرزا محمد انور قادیان، افاغنۂ قصور

---

[1] طہماس نامہ، ورق ۱۶۷ (مخطوطہ برٹش میوزیم)، منقول از گپتا، ہیٹر مغل ہسٹری آف دی پنجاب، ص ۱۹۴

اوردیپالپور

جالندھر دوآب سے ۔ افغانانِ جالندھر اور الواپور، رائے ابراہیم کپورتھلہ ، روسائے بنگالہ ، دسوھہ فردن بلاء ، اور پھگواڑہ اور راجپوتانِ راہوں[1]

ان تمام سے عہد لیا گیا ۔ کہ وہ سکھوں کے خلاف بھرپور کاروائی کریں گے ۔

دیوان ہیرامل اور جنڈیالہ کا گورو عاقل سب سے پہلے ان کے خلاف بھیجے گئے ۔ قادیان کے نزدیک زبردست جنگ ہوئی ۔ دیوان ہیرامل مارا گیا اور اس کے دستے بھاگ گئے ۔ بھاری مالِ غنیمت سکھوں کے ہاتھ آیا ۔ آدینہ بیگ اس خبر سے بہت برہم ہوا اور سکھوں کے خلاف کاروائی میں شدت پیدا کرنے کی ضرورت محسوس کی ۔ مانجھ کے جنگلات سکھوں کی بہترین پناہ گاہ تھے ۔ چنانچہ انہیں نیست و نابود کر دیا گیا ۔ آدینہ بیگ نے حکم دیا کہ سکھوں کا کوئی پرگنہ اور گاؤں سالم نہ رہنے دیا جائے ۔ میر عزیز بخشی کو ایک ہزار لکڑہارے فراہم کئے گئے ۔ ان کی مدد سے جنگلوں کا صفایا کر دیا گیا ۔ ان اقدامات کے نتیجے میں سکھوں میں افراتفری پھیل گئی ۔ کچھ فرار ہو گئے ، کچھ چھپ گئے ۔ نند سنگھ سنگھانیا کے زیرِ قیادت ایک دستے نے رام راونی میں پناہ لی ۔ جے سنگھ کاہنیا اور امر سنگھ کنگرہ بھی وہیں تھے ، انھوں نے کچھ دفاعی اقدامات کئے ۔

میر عزیز کو خبر ہوئی تو اُس نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا ۔ سکھ بہادری سے لڑے تاہم میر عزیز قلعہ کی دیوار میں شگاف ڈالنے میں کامیاب ہو گیا ۔ بہت سے سکھ مارے گئے اور متعدد گرفتار کر لئے گئے ۔ اب سکھوں نے مالوہ کا رخ کیا ۔ سرہند کا گورنر صادق بیگ پہلے ہی مستعد تھا ۔ سنگھولن نامی ایک مقام پر سکھوں سے لڑائی ہوئی ۔ جس میں سکھوں کو شکست ہوئی[2]

سکھوں پر ایک بار پھر عرصۂ حیات تنگ ہو رہا تھا ۔ آدینہ بیگ صرف پانچ ماہ حکومت کر پایا تھا کہ ۱۵ ستمبر ۱۷۵۸ء (۱۱ محرم ۱۱۷۲ھ) کو بٹالہ میں اچانک اس کا انتقال ہو گیا ۔

---

[1] گپتا ، لیٹر مغل ہسٹری آف دی پنجاب ، ص ۱۰۰

[2] گپتا ، ہسٹری آف دی سکھز ، ص ۲۵-۱۲۴

آدینہ بیگ نے اپنے مختصر دورِ عروج میں انتظامِ ملکی کے سلسلے میں بڑی مہارت کا ثبوت دیا ۔ ایسے زمانے میں جب کہ پنجاب میں امن و امان مفقود ہو چکا تھا ۔ آدینہ بیگ کا حیلہ و تدبر ، طاقت و ہمت اور بصیرت و دانش سے دوآبہ بست جالندھر میں امن و امان کو بحال کرنا بہت بڑا کارنامہ ہے ۔ یہ دوسری بات ہے ۔ کہ اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی لامرکزی عناصر چاروں طرف سے ہجوم کر آئے ۔ اور اس کے بسائے ہوئے شہر (دینا نگر) کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی ۔ آدینہ بیگ نے بڑی ہمت سے حالات کا مقابلہ کیا اور اس زوال کو اپنی زندگی تک روکنے میں کامیاب رہا جس کا نشانہ اس کی زندگی ہی میں سلطنت دہلی کے مختلف حصے ہو چکے تھے[1]

آدینہ بیگ کے پاس ایک عمدہ اور بڑی فوج تھی ۔ اس نے اپنی ابتدائی سیاسی زندگی ہی سے فوج میں گہری دلچسپی لی ۔ اس کے ایامِ نظامت میں اس کے پاس جو سپاہ تھی ۔

اس کی تفصیل درج ذیل ہے ۔

رسالہ	۵۰۰۰
پیادہ	۹۰۰۰
ماتحت سواروں کی فوج	۱۰۰۰
ہرکارے پیغام رساں	۳۹۵
گھاس کاٹنے والے	۵۰۰۰
خدام	۵۰۰۰

حکومت کی مجموعی آمدنی اخراجات سے بہت کم تھی ۔ تحائف اور پیش کشوں کے علاوہ صوبے کی کل آمدنی ۲۴ لاکھ روپے تھی ۔ آدینہ کی وفات پر مرہٹہ سردار ساباجی نامی جنکوراؤ نے لاہور کا حاکم مقرر کیا ۔ جالندھر دوآب پر آدینہ کی بیوہ کو فائز کیا[2] آدینہ بیگ کی وفات سے پنجاب میں مغل حکومت کا خاتمہ ہو گیا ۔ آدینہ بیگ پنجاب کے

---

[1] اردو دائرہ معارف اسلامیہ ، مقالہ ، آدینہ بیگ ، جلد اول ، ص ۴۳

[2] (۱) گپتا ، سٹڈیز ، ص ۱۰۶ (۲) باقر ، آدینہ بیگ خاں ، ص ۲۷

دورِ زوال کے اہم ترین ناظمین میں سے تھا۔ اگر پنجاب کو اس گئے گزرے اور انتشار زدہ زمانے میں زکریا خان، معین الملک اور آدینہ بیگ کی قیادت نصیب نہ ہوتی۔ تو انتشار اور زوال کی رفتار کہیں زیادہ تیز ہوتی۔

آدینہ بیگ کا سیاسی کردار مجموعی طور پر کسی خوش گوار تاثر کا حامل نہیں ہے۔ اس کی پوری جدوجہد حصولِ اقتدار کے گرد گھومتی ہے۔ وہ ایک انتہائی شاطر سیاسی مدبر تھا۔ اگر وہ وسیع تر ملکی اور قومی مفاد کو اپنی ذاتی خواہشات پر ترجیح دیتا تو تاریخ پنجاب کے محبوب کرداروں کی صف میں جگہ پاتا۔

باب ۱۳

صوبائی نظم و نسق

اکبر کے عہد میں جو انتظامی ڈھانچہ تشکیل ہوا۔ اورنگ زیب عالم گیر کی وفات تک پوری طرح روبہ عمل رہا۔ تاہم اس کی طنابیں ڈھیلی پڑنا شروع ہو گئی تھیں، اورنگ زیب کے بعد سیاسی زوال کا آغاز ہوا۔ تو ملک کے انتظامی ڈھانچے کا شیرازہ بکھرنا شروع ہوا۔ اور روز بروز اس عمل میں شدت پیدا ہوتی گئی۔

پنجاب کے زیر بحث دور (۱۷۵۹ء ۔ ۱۷۱۳ء) میں اگرچہ انتشار اور تخریب کی قوتیں سب سے زیادہ سرگرم عمل رہیں۔ جس کے نتیجے میں یہ پہلا اہم صوبہ تھا۔ جو غیر مسلموں کے تسلط میں گیا۔ تاہم زکریا خان کی وفات تک پنجاب کا نظم و نسق مغلوں کے روایتی انتظامی خطوط پر قائم رہا۔ اس کے بعد معین الملک اور پھر آدینہ بیگ کے مختصر عہد اقتدار میں پنجاب کو انتظامی طور پر سکون دینے کی کوششیں ہوئیں۔ مجموعی طور پر اس دور میں پنجاب کی انتظامی مشینری مغلوں کے صوبائی انتظامی اصولوں پر استوار رہی۔

سیاسی افراتفری کی وجہ سے اس عہد کا بہت سا تاریخی دستاویزی مواد ضائع ہو گیا جس کی وجہ سے اکثر مستند اور ٹھوس حقائق منظر عام پر آنے سے رہ گئے ہیں۔ تاہم اس گم گشتہ دور کی جو کڑیاں فراہم ہو سکیں۔ ان کی مدد سے انتظامی زندگی کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی۔

ناظم

صوبے کا سربراہ ناظم کہلاتا تھا۔ اسے صوبہ دار یا صوبہ کہتے تھے۔ اس کی نامزدگی بادشاہ

کی طرف سے ہوتی تھی اور وہ اس کی طرف سے حکومت کرتا تھا۔ ناظم کے بنیادی فرائض اپنے علاقے کا دفاع اور امن وامان کی بحالی ہوتے تھے[1]۔ مالیہ کی وصولی کے کامیاب انتظامات اور شاہی احکام وفرامین کو روبہ عمل لانا بھی اس کے فرائض میں شامل ہوتا تھا[2]۔ ناظم صوبہ تمام انتظامی شعبوں کو اپنی براہ راست نگرانی میں رکھتا تھا۔ ہر روز مختلف سرکاری حکام اپنی اپنی کارگزاری کی رپورٹ اسے فراہم کرتے تھے۔

انتظامی امور میں ناظم کی معاونت کے لیئے بسا اوقات نائب ناظم کا تقرر بھی کیا جاتا۔ مشہور نائب ناظمین میں سے عبدالصمد خاں کا نائب عارف بیگ خاں، معین الملک کا نائب بھکاری خاں قابل ذکر تھے۔

طہماس بیگ نے اپنی کتاب میں معین الملک کی روزمرہ زندگی کی تفصیلات قلم بند کی ہیں۔ ان سے دیگر ناظمین کے طریق کار کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

> "معین صبح سویرے اٹھتا تھا، نماز ادا کرتا تھا۔ نو بجے کے قریب اپنا دربار آراستہ کرتا اور بخشی کے پیش کردہ کاغذات کا مطالعہ کرتا جو فوج سے متعلق ہوتے تھے۔ اس کے بعد نواب بھکاری خاں جو معین کا نائب تھا، آتا تھا۔ ایک گھنٹہ تک دونوں صلاح، مشورہ کرتے رہتے۔ اس کے بعد ناظم دوپہر کا کھانا کھا کر آرام کرتا۔ شام کی نماز کے بعد کچھ دیر وہ امور مملکت انجام دیتا۔ اس کے بعد اس کے ملاقاتی آتے۔ ان کے بعد علمائے کرام اور دیگر صاحبانِ علم اس سے ملنے آتے اور قرآن وحدیث کا ذکر ہوتا۔ ان کے چلے جانے پر سرکاری حکام اپنے کاغذات لے کر پھر آجاتے۔ اس کے بعد پھر وہ نواب بھکاری خاں سے امور ملکی پر بات چیت کرتا"[3]

ناظم صوبائی فوج کا سپہ سالار بھی ہوتا تھا۔ اہم جہات پر فوج کی قیادت خود کرتا تھا۔ مثلاً عبدالصمد خاں

---

[1] اشتیاق حسین قریشی، ایڈمنسٹریشن آف دی مغل ایمپائر، ص ۲۲۸، کراچی ۱۹۶۶ء

[2] جادوناتھ سرکار، مغل ایڈمنسٹریشن، ص ۹۴، کلکتہ ۱۹۶۳ء

[3] طہماس نامہ، ص ۱۱

بمقابلہ بندہ بیراگی، شاہنواز خاں بمقابلہ احمد شاہ ابدالی، معین الملک بمقابلہ احمد شاہ ابدالی، معین الملک نے سکھوں کے خلاف بھی کئی جہات کی بہ نفس نفیس قیادت کی۔

ناظم کے پاس صوبائی نظم ونسق چلانے کے لئے ایک منظم سلسلہ موجود ہوتا تھا۔ مندرجہ ذیل صوبائی حکام زیادہ اہمیت کے حامل تھے۔

(الف) دیوان (ب) بخشی (ج) قاضی (د) فوجدار (م) کوتوال
(س) وقائع نویس (ش) دیگر دیہی حکام۔

یہ تمام حکام براہِ راست ناظم کے تحت ہوتے تھے۔

(الف) دیوان

مالیاتی شعبے کا نگراں دیوان کہلاتا تھا۔ ابتدائی دور میں دیوان کی حیثیت ناظم صوبہ کے رقیب اور ہم پلہ عہدے دار کی ہوتی تھی۔ صوبائی دیوان کا تقرر مرکز کی طرف کیا جاتا تھا۔ اور وہ دیوان اعلیٰ کے سامنے جوابدہ ہوتا تھا[1]۔ زوال پذیر زمانے میں دیوان کلیتاً ناظم کے ماتحت ہوتا تھا اور اس کا تقرر بھی ناظم کی صوابدید پر تھا۔ دیوان صوبے کے جملہ مالی امور کا نگراں ہوتا تھا۔ محصولات کی وصولی، اخراجات کی تقسیم اور زرعی امور تمام تر اس سے متعلق تھے۔ پرگنوں اور دیہاتوں سے مالیہ وصول کر کے وہی خزانے میں جمع کرتا اور ان کا باقاعدہ ریکارڈ رکھتا۔

زیر بحث دور میں دو صوبائی دیوان خاص طور پر مشہور ہوئے۔ دیوان لکھپت رائے اور دیوان کوڑا مل دونوں اس عہد کے عظیم ماہرین امور مالیات تھے۔ دیوان لکھپت رائے کو ایک بار ناظم زکریا خاں کے عتاب کا نشانہ بننا پڑا۔ نادر شاہ کے حملے کے نتیجے میں ملکی خزانہ خالی ہوگیا تھا۔ سپاہیوں کی تنخواہیں ادا کرنے کے لئے کچھ نہ بچا۔ ناظم نے حکم دیا کہ سپاہیوں کی تنخواہیں ادا کرنے کا فوری انتظام کیا جائے۔ لکھپت رائے ایسا نہ کرسکا چنانچہ اسے گرفتار کرلیا گیا۔ بعد ازاں اس کے بھائی جسپت رائے نے زکریا خاں سے سرکاری حکام کے حسابات کی تفتیش

---

[1] سرکار، مغل ایڈمنسٹریشن، ص ۵۳

کے احکامات حاصل کر لئے ۔ اس طرح اخراجات وصول ہوئے اور لکھپت رائے کی جان بھی چھوٹی[1]

دیوان صرف دفتری امور کا ذمہ دار نہ ہوتا تھا بلکہ بسا اوقات فوجی مہمات کی قیادت بھی کرتا تھا ۔ لکھپت رائے نے اپنے بھائی جسپت رائے فوجدار ایمن آباد کے مارے جانے کے بعد سکھوں کے خلاف بھرپور فوجی کارروائیوں کی قیادت کی ۔ دیوان کوڑا مل ایک ماہر فوجی سردار بھی تھا ۔ احمد شاہ ابدالی کے خلاف معین الملک کی طرف سے اس نے نمایاں خدمات انجام دیں حتیٰ کہ حملے کے دوران وہ لاہور کے دفاع کے لیے لڑتا ہوا مارا گیا ۔ اس سے پہلے ۱۷۴۸ء میں اس نے شاہنواز خاں کی بغاوت کو کچل دیا تھا ۔ جس کے بعد معین کی طرف سے اسے ملتان کی حکومت اور راجہ کا خطاب مرحمت ہوا ۔

(ب) بخشی

محکمہ امور فوج کا سربراہ ہوتا تھا ۔ اس کے فرائض میں فوج کی تنظیم، بھرتی، تنخواہوں کی تقسیم اور مختلف جنگی مہمات کے لیے منصوبہ بندی شامل ہوتی تھی ۔ بنیادی طور پر بخشی کا تعلق انتظامی امور سے تھا ۔ تاہم بخشی کئی مہمات میں سپہ سالار کے فرائض بھی انجام دیتے تھے ۔

مغلوں کے دور عروج میں اس عہدے کی خاص اہمیت اور مقام تھا ۔ تاہم زیر نظر دور میں یہ عہدہ کوئی زیادہ موثر نہ رہا تھا ۔ اور بخشی کے فرائض ناظم اور دیوان خود ہی انجام دیتے تھے ۔ جیسا کہ زکریا خاں کے زمانے میں خان موصوف نے لکھپت رائے دیوان کو فوجوں کی تنخواہیں ادا کرنے کا حکم دیا تھا ۔ شاہنواز خاں کا بخشی حشمت اللہ خاں اس دور کے ممتاز حکام میں سے تھا ۔ اس زمانے میں بڑے بڑے امرا نے اپنے اپنے بخشی رکھنا شروع کر دئے تھے ۔ جو ان کے ذاتی فوجی دستوں کا انتظام سنبھالتے تھے

(ج) قاضی

عدلیہ کا سربراہ قاضی کہلاتا تھا ۔ صوبائی دارالحکومت کا قاضی ، صوبے کے دیگر تمام قضاۃ اور محکمہ عدلیہ کا

---

[1] گپتا ، سٹڈیز ، ص ۶۲

سربراہ ہوتا تھا ۔ قاضی اسلامی شریعت کے مطابق عدل و انصاف کرتے تھے ۔ چھوٹے چھوٹے قصبوں اور پرگنوں میں بھی قاضی مقرر کئے جاتے تھے[1]

(د) فوجدار

صوبہ انتظامی اعتبار سے کئی اکائیوں میں منقسم تھا ۔ سب سے بڑی اکائی سرکار تھی[2] اسے ہم آج کل کی کمشنری یا ڈویژن قرار دے سکتے ہیں ۔ اس سے چھوٹی اکائی پرگنہ یا محال تھی ۔ یہ آج کل کے ضلع کے برابر تھا ۔ سرکار کے افسر اعلیٰ کو فوجدار کہتے تھے ۔ سرکار کی حد تک اس کے فرائض وہی ہوتے تھے ۔ جو صوبے کی حد تک ناظم کے ہوتے تھے ۔ انتظامی امور میں وہ ناظم کے سامنے جوابدہ ہوتا تھا ۔ اپنے علاقے میں اسے کامل خود مختاری حاصل ہوتی تھی ۔ اس کے پاس ایک مکمل انتظامی عملہ ہوتا تھا جو اس کی براہ راست نگرانی میں کام کرتا تھا ۔ اس منصب پر ناظم غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک اور اپنے قریبی معتمد افراد کو متعین کرتے تھے

عبدالصمد خاں کے چند ممتاز فوجدار یہ تھے ۔

گجرات ——— مرزا احمد خاں

ایمن آباد ——— ارادت مند خاں

اورنگ آباد پسرور ——— نور محمد خان

انبالہ ——— شیخ محمد دائم

ہیبت پور پٹی ——— سید حفیظ علی خاں

کلانور ——— سہراب خاں

بعد کے زمانے میں بحیثیت فوجدار جتنی اہمیت آدینہ بیگ خاں نے حاصل کی ۔ وہ کسی کو نصیب نہ ہوئی ۔

---

[2] شاہجہاں کے عہد میں اس کے وزیر علامی سعد اللہ خان نے ایک نیا انتظامی حلقہ چکلہ کے نام سے روشناس کرایا جو متعدد پرگنوں پر مشتمل تھا ۔ سرکار کو موقوف نہ کیا گیا ۔ لہذا چکلہ اس کی جگہ نہ لے سکا ۔

(قریشی ، ایڈمنسٹریشن آف دی مغل ایمپائر ، ص ۲۲۷)

اس نے جالندھر دوآب پر اتنی طویل فوجداری کی کہ دوآب کے ساتھ اس کا نام وابستہ ہو کر رہ گیا۔ آدینہ بیگ نے اپنے علاقے میں بے مثل انتظام قائم کیا۔ اس نے اپنی ذاتی فوج بھی بنالی تھی۔ وقت کے ساتھ وہ دربار لاہور کے اثرات سے آزاد ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ جب لاہور میں طوائف الملوکی کا دور دورہ ہوا۔ تو اس نے سکھوں اور مرہٹوں کے ساتھ سازباز کر کے لاہور پر قبضہ کر لیا۔

(ر) کوتوال

صوبائی دارالحکومت میں امن وامان کی ذمہ داری کوتوال پر تھی۔ دیگر شہروں اور قصبوں میں کوتوال نہیں تھا۔ اسے دربار سے خاص تعلق ہوتا تھا۔ شہر میں ناظم کے احکامات کی بجاآوری اور رراتوں کو شہریوں کی حفاظت کی ذمہ داری اسی پر تھی۔ اس کے پاس اپنا عملہ ہوتا تھا۔

(س) وقائع نویس

صوبے کے مختلف مقامات پر ناظم کی طرف سے ایسے افراد متعین ہوتے تھے۔ جو اسے بلاواسطہ حالات سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔ اگرچہ فوجدار اور دیگر علاقائی حکام بھی ناظم کے پاس باقاعدگی سے رپورٹیں بھیجتے رہتے تھے۔ تاہم وقائع نویس مقامی حکام سے بالا بالا حقائق کی صحیح خفیہ طور پر دربار میں ارسالی کرتے تھے[1]

ان کے علاوہ ہرکارے اور خبررساں باقاعدہ ملازم رکھے جاتے تھے۔ جو پیغام رساں کا کام انجام دیتے تھے۔ آدینہ بیگ کے پاس ۹۰۰ ہرکارے اور خبر رساں ملازم تھے[2]

(ش) دیہی حکام

پرگنہ کا سربراہ چودھری کہلاتا تھا[3] پرگنہ میں مالیہ کی وصولی کی ذمہ داری تحصیل دار پر تھی[4]۔ اس کی

---

[1] محمد عزیز احمد، دستورالعمل آف جواہر مل بیکوس (۱۷۴۶ء) انڈین ہسٹاریکل ریکارڈز کمیشن، پروسیڈنگز دسمبر ۱۹۴۲ء ص ۵۴، دہلی ۱۹۴۳ء

[2] احوال آدینہ بیگ خاں، ص ۵۶ ب

[3] مورلینڈ، دی اگریرین سسٹم آف دی مسلم انڈیا، ص ۱۹، اور ۲۷۱، کیمبرج ۱۹۲۶ء (بقیہ حاشیہ ص ۱۹۵ پر)

مدد کے لیے ایک باقاعدہ عملہ ہوتا تھا۔ پرگنہ کے دیگر حکام میں قانون گو، امین اور خزانچی اہم تھے۔

(ص) قانون گو

مورلینڈ کے خیال میں یہ پرگنہ اکاونٹنٹ ہوتا تھا[5] اس کا کام مزروعہ اراضی اور پیداوار کے گوشوارے تیار کرنا تھا[6]

(ض) امین

امین کے فرائض بھی حسابات سے متعلق تھے۔

(ط) خزانچی

ہر پرگنہ میں ایک خزانہ ہوتا تھا۔ جس کا نگران خزانہ دار ہوتا تھا۔ اسے فوطہ دار یا خازنہ دار بھی کہتے تھے۔

(ظ) مقدم

ہر دیہات کے لیے علیحدہ علیحدہ حکام ہوتے تھے۔ مالیہ کی وصولی اور اسے خزانہ میں جمع کرنے کا کام مقدم انجام دیتا تھا۔

(ع) پٹواری

دیہات کے لیے مالیہ کے حسابات اور تخمینہ وتجزیہ کی ذمہ داری پٹواری پر تھی۔ اس نظام کی قابلِ ذکر خصوصیت یہ تھی۔ کہ اس میں جوابدہی کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ جس کی وجہ سے انتظامی طور پر سرگرمی رونما رہتی۔

(بقیہ حاشیہ ص ۱۹۴) [4] ایس آر شرما، مغل گورنمنٹ اینڈ ایڈمنسٹریشن ص ۲۴۴، بمبئی ۱۹۵۱ء

[5] مورلینڈ، ص ۲۷۶

[6] اشتیاق حسین قریشی، ص ۲۳۶

ضبطی اموال امراء

مغلوں کے عہد میں امراء کی وفات کے بعد ان کے اموال ضبط کر لیئے جاتے تھے۔ زیر بحث دور میں بھی ہمیں اس روایت کی مثالیں ملتی ہیں۔ زکریا خاں کی وفات ہوئی تو شاہی کارندے دہلی سے ضبطی جائیداد کے لیے لاہور پہنچے۔ اس کی تفصیل آنندرام مخلص نے بدائع وقائع میں دی ہے[۱]۔

آدینہ بیگ کی وفات پر عماد الملک وزیر دہلی نے سید جمیل الدین خان اور عبداللہ خاں کشمیری کو پنجاب بھیجا۔ تاکہ مرحوم ناظم کی جائیداد ضبط کر کے دہلی لے آئیں[۲]۔ ضبطی اموال پر بحث کرتے ہوئے سرکار نے لکھا ہے۔

One effect of the **escheat system was to indu**-**ce** the nob'es tc live **extr**avage**n**tly and **squander their all** on women show and unproductive luxury **during their** life time, as they knew very well that they could leave nothing to their family, and the **Emperor above would profit by their abstinance.**[۳]

گزشتہ اوراق میں محض انتظامی ڈھانچے کی تفصیل بیان کرنے کی کوشش کی گئی۔ عملی طور پر اس دور میں اس ڈھانچے کا شیرازہ منتشر ہونا شروع ہو چکا تھا۔ امن و امان کی حالت حد درجہ بدتر تھی۔ سنہ ۱۷۴۲ء میں ممتاز ایرانی شاعر شیخ علی حزیں ملتان سے لاہور آئے۔ لکھتے ہیں۔

"طرق و شوارع تمامی این مملکت ہمیشہ ناامن و خطرناک است[۴]۔"

---

[۱] از ورق ۲۳۴ ب تا ۲۴۱

[۲] گپتا، ہسٹری آف دی سکھز، ص ۱۲۶

[۳] سرکار، مغل ایڈمنسٹریشن، ص ۱۵۶

[۴] تذکرۃ الاحوال، ص ۲۲۳

مفتی علی الدین رقم طراز ہیں۔

"در ایام سلطنت محمد شاہ عیش دوست بحکم الناس علی دین ملوکہم دوستی عیش مقدم داشت۔ درین صورت امر دزدی و قطاع الطریقی، دزدان و سنگھاں بقیۃ السیف دو چند گردید۔ و آتش فتنہ و فساد زیادہ از سابق مشتعل شد۔ حتی کہ دزدان از راہ گھاٹ پارچہ ہا از گازران دفیرہ می بردند و تدارک این معنی بعمل نمی آید[۱]"

سوہن لال سوری لکھتا ہے۔

"بسبب سستی و بے خبری محمد شاہ زمینداراں و قانون گویاں بر ہر پرگنہ سرکشی آغاز کردند بر رعایا بہ سبب تحصیل معاملہ جفاکاری می نمودند، اکثری از دہاقین و مزارعین پنجاب کار و بار خود گزاشتہ بہ سنگھاں ملحق می شدند[۲]"

ان سطور میں اس انتظامی ابتری کا مزید ذکر لاحاصل ہے۔ کیونکہ نادر شاہ احمد شاہ ابدالی اور سکھوں کی سرگزشت درحقیقت پنجاب کی انتظامی شکست و ریخت کی داستان ہے۔

مالیہ

مصنف تاریخ مظفری نے لکھا ہے کہ محمد شاہ کے عہد میں صوبہ لاہور میں پانچ دوآبے اور ۳۲۰ پرگنے تھے اور اس کی آمدنی نوے کروڑ، ستر لاکھ، سولہ ہزار ایک سو چھبیس (۹۰۷۰۱۶۱۲۶) دام تھی۔ ملتان میں چار سرکاریں اور اٹھانوے پرگنے تھے۔ جب کہ اس کا مالیہ چوبیس کروڑ ترپن لاکھ اٹھارہ ہزار پانچ سو پانچ (۲۴۵۳۱۸۵۰۵) دام تھا[۳]۔ حکومت مالیہ سے ۱/۳ اور کبھی کبھار ۱/۴ وضع کرتی تھی۔ عام مروجہ طریقہ بٹوئی کہلاتا تھا[۴]۔

---

[۱] عبرت نامہ (جلد اول)، ص ۱۸۱

[۲] عمدۃ التواریخ تتمہ، دفتر اول دوم، ص ۱۲، لاہور ۱۸۸۵ء

[۳] تاریخ مظفری، ورق ۷۵ ب، ۷۶ الف (مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور)

[۴] سیالکوٹ ڈسٹرکٹ گزیٹیر، ص ۱۵۱، لاہور ۱۹۲۱ء

آخری دنوں میں آکر جو حالت ہو گئی تھی۔ اس کا تجزیہ ڈاکٹر رفیق احمد نے اپنے ایک مقالے میں یوں کیا ہے

There being no revenue administration as such, what actually happened was what whoever occupied any part of the province for whatever period he made his own temporary or summary arrangements for the exaction of revenue though probably keeping in view the old Mughal practice.[1]

---

[1] رفیق احمد، جرنل آف ریسرچ، پنجاب یونیورسٹی، ص ۱۳۲، لاہور جولائی ۱۹۶۶ء

باب ۱۴

ناظمانِ پنجاب کی مذہبی پالیسی

ناظمانِ پنجاب کی سیاسی جدوجہد کا تفصیلی ذکر کرنے کے بعد ضروری سمجھا گیا کہ ان کے دینی رجحانات اور غیر مسلموں سے ان کے طرزِ عمل پر ایک نظر ڈالی جائے۔ مسلمان حکمرانوں نے برِصغیر میں ہر دور میں اسلامی رواداری کے اصولوں کو پیشِ نظر رکھا اور باستثنائے چند عام طور پر اسلام سے گہری وابستگی اختیار کئے رکھی۔ زیرِ بحث دور اگرچہ زوال پذیر زمانے کا حصہ ہے۔ تاہم چونکہ یہ مغلوں کے سنہری دور سے قریبی تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے عہدِ سابق کے اثرات اس پر چھائے ہوئے ہیں، بالخصوص اورنگ زیب عالم گیر کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

اس عظیم المرتبت فرمانروا کے نصف صدی پر محیط دورِ اقتدار نے اسلامی اقدار کو حیاتِ نو بخشی۔

عبدالصمد خان

عبدالصمد خاں، حضرت ناصر الدین، عبید اللہ احرارؒ کی اولاد میں سے تھے۔ حضرت احرارؒ سلسلۂ نقشبندیہ کے ایک مقتدر شیخ اور فارسی کے مشہور شاعر مولانا جامی کے مرشد تھے۔ عبدالصمد کے والد خواجہ عبدالکریم احرار ایک عابدِ شب زندہ دار اور زاہد دین دار تھے اور والدہ ترکستان کے مشہور بزرگ قطبِ عالم سید مخدوم اعظم کی اولاد سے تھیں۔ وہ ایک خدا رسیدہ خاتون تھیں اور بقول صاحب عماد سعادت "بہ نوعیکہ در وجاہت عدیم المثال بود ہمیں قدر عفت و عصمت ہم داشت"[1]

---

[1] غلام علی،

عبدالصمد عالم جوانی ہی میں اس درجہ صاحب علم ہو گئے تھے۔ کہ انھیں سمرقند کا شیخ الاسلام مقرر کیا گیا تھا۔
عبدالصمد انتہائی دین دار آدمی تھے۔ ان کے دربار میں باقاعدگی سے علماء و فضلا کی مجالس منعقد ہوتی رہتیں۔ جہاں تفسیر و حدیث کے اسرار و رموز پر بحث ہوتی۔ نماز پنجگانہ باجماعت ادا کرتے تھے۔ نماز تہجد کبھی قضا نہ ہوتی تھی۔ زہد و تقویٰ میں بڑے سے بڑا درویش بھی ان کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا[1]

عبدالصمد ممتاز بزرگ سید رحمت اللہ شاہ چشتی کے بے حد معتقد تھے۔ ان کی وفات پر اُن کا مزار بھی انہی نے تعمیر کرایا[2]۔ عبدالصمد خاں کی بیگم، بیگم جان عہد شاہجہانی کے ممتاز صوفی حضرت شاہ چراغ سے گہری عقیدت رکھتی تھی۔ اس نے وصیت کی تھی۔ کہ اس کے زیورات بیچ کر مزار سے متصل ایک مسجد تعمیر کرائی جائے۔ زکریا خاں نے اپنی والدہ کی وصیت پر عمل کیا[3]

زکریا خاں

زکریا خاں حضرت ایشاں کا نہایت معتقد تھا۔ صاحب تحقیقات چشتی نے لکھا ہے۔

"ایک نیا غلاف بعد آٹھویں دن کے نواب صاحب کی طرف سے مقبرہ پر چڑھایا جاتا تھا۔ اور آٹھویں دن تمام فقراء اور علماء لاہور کے یہاں بلائے جاتے تھے۔ اور فاتحہ حضرت کا ہوتا تھا اور فی نفر دو دو نان اور آدھ سیر حلوہ اور ایک ایک روپیہ ان کو تقسیم کیا جاتا تھا۔ اور ختم خواجگان نقشبند پڑھوایا جاتا تھا۔ ماسوا اس کے یہاں کئی تسبیح خانے تھے۔ کہ ان میں ہمیشہ عبادت الٰہی ہوتی تھی[4]

---

[1] شجاع الدین، دیباچہ اسرار صمدی، ص ب، ج، د
[2] نور احمد چشتی، تحقیقات چشتی، ص ۱۳۲۱
[3] (۱) لطیف، لاہور، ص ۱۹۳ - (۲) نقوش لاہور نمبر، ص ۳۰۲
[4] (۱) نور احمد چشتی، ص ۸۰ - ۱۱۷۹ (۲) لطیف، لاہور، ص ۱۳۹

زکریا خاں کے عدل و انصاف نے حضرت عمر فاروقؓ کی یاد تازہ کر دی تھی۔ رتن چند لکھتا ہے۔

"در عدالت گستری و انصاف پروری شہرۂ آفاق است[1]"

ہر روز ظہر کے وقت عدالت لگاتے تھے[2]۔ ہر مقدمہ میں نواب صاحب نہایت کاوش سے تحقیقات کر کے فیصلہ کیا کرتے تھے۔ تاکہ نہ کوئی بے گناہ مارا جائے اور نہ کسی کے ساتھ زیادتی ہو۔ اور ان کی اسی سعی اور احتیاط کا نتیجہ تھا کہ ملک میں جرائم کا خاتمہ ہو گیا اور لوگ خوش حالی اور فارغ البالی سے زندگی بسر کرنے لگے[3]۔ زکریا خاں کی انصاف پروری کا ایک واقعہ ہرنام سنگھ نے اپنی کتاب سعادت جاوید میں بیان کیا ہے۔

ایک اوباش طبع مغل نوجوان نے ایک خوبصورت ہندو عورت کو دیکھا۔ تو اس پر فریفتہ ہو گیا۔ اسے اپنے دامِ تزویر میں پھنسانے کی بے حد کوشش کی مگر ناکام رہا۔ آخر کار اس کی دھوبن کو کچھ دے دلا کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ اسے مسلمان دلہنوں کا سا لباس عروسی پہنا کر ایک روز پروگرام کے مطابق اپنے احباب کو دعوت دی۔ کہ فلاں ہندو کی بیوی اسلام قبول کر کے میرے حبالۂ نکاح میں آ رہی ہے، اس لیے میرے ہاں تشریف لائیں چنانچہ مقررہ وقت پر روایتی انداز میں نکاح پڑھا گیا اور شیرینی وغیرہ تقسیم ہوئی۔ اس حرافہ کے توسط سے وہ لباس عروسی اس ہندو خاتون کے گھر خفیہ طور پر پہنچا دیا گیا۔

اگلے روز آغا اس ہندو کے مکان پر جا دھمکا۔ اور اسے کہا کہ تمہاری بیوی اسلام قبول کرنے کے بعد میرے نکاح میں آ چکی ہے۔ اب وہ تمہارے ہاں نہیں رہ سکتی۔ لہٰذا اسے میرے ساتھ روانہ کر دو۔ یہ سن کر وہ ہندو پریشان ہوا۔ اس نے کہا کہ میری بیوی تو گھر سے نکلتی نہیں۔ وہ تمہارے مکان پر جا کر مسلمان کس طرح ہوئی، اور نکاح کب پڑھا گیا؟ اس آغا نے وہ تمام لوگ پیش کیے۔ جو اس واقعہ کو اپنی آنکھ سے دیکھ چکے تھے، اس پر ہندو بہت گھبرایا۔ اور اس کے تمام احباب و اقربا بھی بہت نادم ہوئے۔ ایک دو

---

[1] خالصہ نامہ، ص ۴ الف، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور
[2] تحقیقات چشتی، ص ۹۶۹
[3] شجاع الدین، مقالہ، سیاسی اور ثقافتی، نقوش لاہور نمبر، ص ۹۰

سمجھ دار آدمیوں کے مشورے پر لالہ نے اپنی زوجہ سے کہا کہ وہ اس معاملے پر روشنی ڈالے، اس نے شوہر سے کہا کہ وہ گھر سے نکلی تک نہیں اور اس مغل کا چہرہ تک نہیں دیکھا۔ آغا نے کہا کہ گزشتہ رات جو کپڑے وہ پہنے ہوئے تھی۔ وہ لازماً گھر میں موجود ہوں گے، لہذا تلاشی لی جائے، اگر برآمد نہ ہوں تو میں جھوٹا۔ ہندوؤں نے گھر میں تلاشی لی۔ ان کے ایک صندوق میں واقعی مسلمان دلہنوں کے پہننے کا لباس مل گیا۔ عورت کے خاوند اور اعزا و اقارب پر بجلی سی گر گئی۔ غریب عورت شرم کے مارے مرنے پر آمادہ ہو گئی۔ تاہم انھوں نے عورت کو آغا کے ساتھ جانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ آغا نے قاضی کی عدالت میں لالہ کے خلاف دعویٰ دائر کر دیا۔ آغا کی طرف سے ایک سو کے لگ بھگ پڑوسیوں نے جو اس رات مٹھائی وغیرہ کھا چکے تھے۔ عدالت میں اس کے حق میں گواہی دی۔ قاضی نے طرفین کے بیان لے کر اور یہ سننے کے بعد کہ ہندو عورت کے کپڑوں میں مسلمان عورتوں کے لباس کا ساعروسی جوڑا مل گیا۔ اور ثقہ لوگوں کی اس گواہی پر کہ ہمارے سامنے عورت مشرف بہ اسلام ہو کر آغا کے نکاح میں آئی۔ یہ فیصلہ کیا کہ چونکہ زن مذکورہ اسلام قبول کر کے ایک مسلمان کے حبالۂ نکاح میں آچکی ہے۔ اب اسے کسی حالت میں اجازت نہیں دی جا سکتی۔ کہ وہ مرتد ہو کر ایک مشرک کی زوجہ بن جائے۔

قاضی کے فیصلہ کے خلاف ہندوؤں نے صوبہ دار کی عدالت میں اپیل کی۔ سارا واقعہ زکریا خاں کے گوش گزار ہوا تو وہ کشمکش و پیچ میں پڑ گیا۔ زکریا خاں کا معمول تھا۔ کہ شام کے بعد بھیس بدل کر بیگم پورہ کے محلوں میں گشت کیا کرتا تھا۔ اور شہر میں گھوم کر رعایا کا حال معلوم کرتا تھا۔ اس روز وہ حسب معمول بیگم پورہ سے نکلا تو ہندو مذکور کے محلہ میں گیا۔ وہاں اس نے چند سادھوؤں کو باتیں کرتے سنا کہ اس عورت کو تو ہم ایک مدت سے جانتے ہیں۔ اس کے اطوار میں ہم نے سوائے نیک چلنی اور پاک دامنی کے اور کچھ نہیں دیکھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ ایک پارسا عورت جو گھر سے بھی بہت کم باہر نکلتی ہے۔ دوسرے محلے میں مسلمانوں کے ہاں جا کر ان کا مذہب قبول کر کے ایک مسلمان سے شادی کرے یہ بات بہت عجیب معلوم ہوتی ہے۔ اس کے بعد خان نے آغا کے محلے کی راہ لی۔ وہاں اس نے چند لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ آغا بے حد مکار اور چالاک ہے اس نے ضرور چالبازی کی ہے۔ ہم نے کبھی اس کھتری کی بیوی کو اس کے گھر آتے جاتے نہیں دیکھا۔ اس کے ساتھ اس کی شادی کیسے ہو گئی۔

اس کے بعد خان واپس اپنے محل میں آ گئے۔ انہیں عورت کی شرافت اور آغا کی خیانت کی شہادت تو مل گئی مگر یہ معلوم نہ ہو سکا۔ کہ اسلامی طرز کا لباس عروسی اس عورت کے کپڑوں سے کیسے ملا۔ اچانک اس کی توجہ دھوبن کی طرف مبذول ہوئی۔ صبح ہوتے ہی خان نے اس دھوبن کو دربار میں طلب کیا۔ جو اس ہندو عورت کے گھر کے کپڑے دھویا کرتی تھی اور اس سے معلوم کرنا چاہا۔ کہ اس کا اس ڈرامہ میں کس قدر حصہ ہے۔ پہلے تو وہ عورت انکار کرتی رہی۔ جب اس پر سختی کی گئی تو اس نے اقرار کر لیا۔ کہ آغا کے لالچ دینے اور بہکانے پر وہی وہ لباس ہندو عورت کے گھر چھپا آئی تھی اور نکاح کے دن بھی وہی چادر میں لپٹی مولوی صاحب کے روبرو آئی تھی۔

یہ سنتے ہی ناظم پنجاب نے حکم دیا۔ کہ مغل اور دھوبن دونوں کو پھانسی دے دی جائے جن کی اس حرکت قبیح سے نہ صرف شہر کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں کشیدگی پیدا ہوئی۔ بلکہ احکام شرعی کی بھی توہین ہوئی[1] زکریا خاں کی اسی عدل گستری نے اسے تاریخ پنجاب کا مقبول ترین گورنر بنا دیا۔ ہری رام گپتا لکھتا ہے۔

He was the last of the m›st popular governors of the Punjab, an able and just ruler, who commanded respect from Hindus and Muslims alike.[2]

یہی وجہ ہے کہ جب اس کا انتقال ہوا (یکم جولائی ۱۷۴۵ء) تو بقول آنند رام مخلص

"قیامتی سرتا سر پنجاب بہ تخصیص در شہر لاہور گزشتہ کہ تا سہ شب در ہیچ خانہ چراغی روشن نگشت۔ ہرگاہ جنازۂ آن مغفور از حویلی برآمد۔ سوای نوع مغل کہ ہمگی گریبانہا تا دامن چاک زدہ خاک بر فرق ریزاں و بہ تابش بودند۔ ہزاراں ہزار مردم شہر لباس سیاہ پوشیدہ در کمال شور و شغب نالہ وا مصیبتاہ و وا حسرتا بر لب ہمراہ جنازہ راہ می پیمودند، واز ہر جانب بارش گل بر جنازہ

---

[1] (۱) ایلیٹ اینڈ ڈوسن، ہسٹری آف انڈیا، جلد ۸، ص ۲۷-۳۴۴، الہ آباد ۱۹۶۴ء

(۲) محمد دین فوق، لاہور عہد مغلیہ میں، ص ۹۰-۹۱، لاہور ۱۹۲۷ء

(۳) شجاع الدین مقالہ سیاسی اور ثقافتی تاریخ، نقوش لاہور نمبر، ص ۸۸-۹۰

[2] ہسٹری آف دی سکھز، ص ۱۷

یآں افسر اظہار کردید۔ کہ دست آخر گلی بدشت زری ہم نمی رسید [1] "

ایک حکمران کے لیے رعایا کی طرف سے اس سے بڑا خراج عقیدت اور کیا ہو سکتا ہے؟

شاہنواز خان

شاہ نواز خاں بھی بزرگان دین سے خاص عقیدت رکھتا تھا۔ اس کی عقیدت ضعیف الاعتقادی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے (جنوری ۱۷۴۸ء) کا مقابلہ کرنے کے لیے تیاریاں شروع کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے شہر کے ممتاز بزرگوں کے حضور میں حاضری دی۔ چنانچہ اسی ضمن میں وہ اپنے پیر حضرت غلام محمد کے پاس گیا۔ تاکہ اپنے فوجی اقدامات پیران سے دعا کی استدعا کرے۔ پیر نے مراقبہ کرنے کے بعد اس کی حیثیت کو تشویش ناک بتایا اور کہا کہ تمہاری کشتی ڈوبے گی، تم ظلم سے ہاتھ روک لو اور اپنے والد کے درباریوں کو رہا کر دو [2]

اسی طرح جنگ کی صبح (۱۱ جنوری ۱۷۴۸ء) شاہنواز خاں نے درویش شاہ کلاب کے پاس ایک آدمی بھیجا۔ تاکہ جنگ کے نتیجہ کے بارے میں پیش گوئی حاصل کر سکے۔ درویش نے کہا کہ آج کا دن تمہارے لیے بُرا ہے، بہتر ہے کہ آج کوئی لڑائی نہ ہو۔ کل سے فتح تمہاری ہے [3] اتفاق سے شاہنواز کی کوششوں کے باوجود اسی روز لڑائی ہو گئی۔ اور شاہ نواز کو شکست کھانی پڑی۔

قادری سلسلے کے ممتاز بزرگ شیخ محمد سلطان جن کا ۱۱۵۸ھ میں انتقال ہوا، کا مزار لاہور میں شاہنواز خان نے تعمیر کرایا تھا [4]

یحییٰ خاں

یحییٰ خاں، حضرت حامد قادری کے خلیفہ اور نامور عالم و فاضل بزرگ حافظ جان محمد سہروردیؒ کا بے حد معتقد تھا [5]

---

[1] بدائع وقائع، ورق ۲۲۹و، ۲۳۰ب، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور
[2] گنڈا سنگھ، احمد شاہ ابدالی، ص ۴۴-۴۵ بحوالہ خوش وقت رائے، تاریخ سکھاں
[3] گنڈا سنگھ، احمد شاہ درانی، ص ۹۴
[4] مفتی غلام سرور لاہوری، خزینۃ الاصفیا، ص ۳۱۰ [5] محمد دین کلیم، سہروردی اولیائے لاہور، ص ۳۰۵، لاہور ۱۹۶۹ء

معین الملک

معین الملک کے ہاں شام کو علمائے کرام کی مجلس جمتی تھی جس میں قرآن و حدیث پر بحث ہوتی تھی [1]

مومن خاں

میر مومن خاں اس عہد کے ممتاز ترین امراء میں سے تھا۔ وہ داتا صاحبؒ سے گہری عقیدت رکھتا تھا۔ اس نے وصیت کی تھی۔ کہ اس کی قبر اس جگہ بنائی جائے جہاں درگاہ کی زیارت کے لیے آنے والے زائرین جوتے رکھتے ہیں۔ جہاں اسی وصیت کے مطابق ان کو دفن کیا گیا۔ مزار کے پاس ایک بلند چبوترہ پہ ان کی قبر ہے [2]

غیر مسلم امراء اور عمائدین

اس دور میں بے شمار ہندو اور سکھ اعلیٰ مناسب پر فائز رہے۔ ذیل میں چند ایک کا تذکرہ کیا جاتا ہے

لکھپت رائے اور جسپت رائے اس عہد کے ممتاز ترین امراء میں سے تھے۔ لکھپت رائے زکریا خاں اور یحییٰ خاں کے عہد اقتدار میں ۱۷۲۶ء سے لے کر ۱۲ مارچ ۱۷۴۷ء تک پنجاب کا دیوان رہا۔ مالیاتی اور انتظامی امور پر اسے بے پناہ دسترس حاصل تھی۔ اس کی سیاسی اور سماجی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ مصنف احوال آدینہ بیگ خاں کی روایت کے مطابق نادر شاہ نے لاہور پر تین کروڑ کا تاوان عائد کیا۔ اس میں سے ایک کروڑ امرائے لاہور پر عائد ہوا۔ " بابت آں دلپت رای پسر لکھپت رای تا مبلغات شامل رکاب ماند [3] " رائے مذکور بے اندازہ دولت اور وسیع جاگیروں کے مالک تھے لکھپت نے جب اپنے بیٹے کی شادی کی تو پورے شہر لاہور میں پرتکلف شیرینی تقسیم کی گئی [4] اسی طرح اس نے اپنی بیٹی کی شادی پر شہر کے ہر فرد کی تواضع کی [5]

---

[1] طہماس بیگ خاں، طہماس نامہ، ص ۱۱
[2] لطیف، لاہور، ص ۱۸۲
[3] آنند رام مخلص، ورق ۵۰ب، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور
[4] نور احمد چشتی، تحقیقات چشتی، ص ۸۴-۸۵،
[5] لطیف، لاہور، ص ۲۳۲

جسپت رائے امین آباد کا فوجدار تھا۔ مارچ ۱۷۴۶ء میں سکھوں کے ساتھ ایک معرکہ میں کام آگیا۔[1]
شاہنواز خاں کے لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد یحییٰ خاں کے ساتھ اس کے وفادار امراء کو بھی حراست میں لے لیا۔ لکھپت کی جگہ کوڑا مل کو دیوان مقرر کیا۔ یہاں سے لکھپت رائے کا سیاسی کردار تقریباً ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد تاریخ میں صرف ایک اشارہ ملتا ہے جس کی رو سے شاہنواز خاں نے احمد شاہ ابدالی کے مقابلے سے فرار ہونے کے بعد جو عمائدین شہر ابدالی کی خدمت میں امان حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوئے ان میں لکھپت رائے بھی تھا۔ رائے برادران نے متعدد عمارات بنوائیں جن کی تفصیل تعمیرات کے ضمن میں بیان کی جائے گی۔ لاہور کے نواح میں واقع بستی کوٹ لکھپت اسی دیوان لکھپت رائے سے منسوب ہے۔

دیوان کوڑا مل

شاہنواز خاں نے لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد ۱۲ مارچ ۱۷۴۷ء کو کوڑا مل کو اپنا دیوان مقرر کیا اور خلعت عطا کی[2] معین الملک نے بھی کوڑا مل کو اس عہدے پر بحال رکھا۔ وہ سیاسی اور انتظامی امور میں اس کی رائے کو خاصی وقعت دیتا تھا۔ سکھوں کے خلاف ۱۷۴۸ء میں ایک مہم کے دوران اس نے کوڑا مل کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے ان سے مفاہمانہ رویہ اختیار کیا۔ اور پرگنہ پٹی کے محاصل میں سے ۱/۴ حصہ انہیں دینے کا اعلان کر دیا۔ معین الملک نے آدینہ بیگ فوجدار دوآبہ بست جالندھر کی تجاویز یہ کہتے ہوئے مسترد کر دیں۔ کہ کوڑا مل جو کچھ کرتا ہے حکومت کے مفاد میں کرتا ہے[3] کوڑا مل کا سابقہ آقا شاہنواز خاں ستمبر ۱۷۴۵ء میں اس کے ہاتھوں مارا گیا۔ وہ معین کے خلاف باغیانہ عزائم سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ناظم نے

---

[1] گپتا ، ہسٹری آف دی سکھز ، ص ۲۵ ، ۲۶

[2] گپتا ، لیٹر مغل ہسٹری آف دی پنجاب ، ص ۷۵

[3] گپتا ، ہسٹری آف دی سکھز ، ص ۷۴

کوڑا مل کو اس کے مقابلے میں بھیجا۔ کوڑا مل کے دستوں میں سکھوں کی بھی خاصی تعداد شامل تھی۔ شاہنواز پر فتح پانے کے بعد معین نے کوڑا مل کو راجہ کا خطاب دیا اور ملتان میں اپنا نائب مقرر کیا۔ کوڑا مل احمد شاہ ابدالی کے تیسرے حملے کے دوران ۶ مارچ ۱۷۵۲ء کو لاہور کا دفاع کرتا ہوا مارا گیا۔ ایسے ماہر اور قابل امیر کی موت سے معین کا دل ٹوٹ گیا۔ اور فوج بھی خاصی بد دل ہو گئی۔ چنانچہ انھوں نے ابدالی کے آگے ہتھیار ڈال دیئے[1]

کوڑا مل ملتان کے ایک کھتری دالو مل کا بیٹا تھا۔ اس کا والد اور دادا حکام ملتان کی ملازمت میں رہے تھے[2] وہ ایک اعلیٰ منتظم، سیاسی مدبر اور ماہر مالیات تھا۔ اس نے ملک میں سیاسی اور انتظامی امن و امان بحال کرنے کے ساتھ ساتھ ملکی زراعت و معیشت کے استحکام کے لئے معین الملک کے دوش بدوش نمایاں کام انجام دیا۔ صاحبِ بیان واقع نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"دریں مدت مصدر خدمات عظیمہ و فتوحات جسیمہ گردیدہ، روز بروز پایۂ ترقیش بہ مدارج کلی
مرتفع شدہ[3] "

کوڑا مل اگرچہ سکھ تھا۔ تاہم وہ گورو گوبند سنگھ کے اختیار کردہ اصولوں کا قائل نہ تھا۔ اور گورو نانک کے مسلک کا پیرو تھا[4]

صورت سنگھ

شاہنواز خان کا ایک ممتاز افسر تھا جب ۲۱ نومبر ۱۷۴۹ء کو وہ اپنے بھائی یحییٰ خان ناظم پنجاب سے والد

---

[1] گپتا ، ہسٹری آف دی سکھز ، ص ۸۷

[2] شاہ یوسف ، حالات ملتان ، ورق ۵۵ الف ، مخطوطہ پنجاب پبلک لائبریری

[3] عبدالکریم کشمیری ، ص ۱۹۳

[4] فارسٹر ، جلد اول ، ص ۳۱۴

کے ترکہ میں سے اپنا حصہ طلب کرنے کے لیے لاہور پہنچا تو اس نے دیوان صورت سنگھ کے توسط سے اپنے مطالبات حکام لاہور تک پہنچائے تھے[1]

آدینہ بیگ کی پالیسی

ہندوؤں اور سکھوں سے سرکاری طور پر ربط و ضبط کے سلسلے میں آدینہ بیگ خاں خاص طور پر مشہور ہے اس کے سیاسی کردار کی اٹھان اور عروج میں ان غیر مسلم عناصر کا خاصا ہاتھ ہے۔ اسے شروع شروع میں جالندھر دوآب میں واقع موضع کنگ[2] کا محصل مقرر کیا۔ سلطان پور کے ایک متمول شخص لالہ سری نواس نے اسے چند ہی سالوں میں پانچ سالوں میں پانچ چھ مزید دیہات کی وصولی محصول کی ذمہ داری دلوادی۔ بعدازاں اسی ہندو رئیس کی ضمانت پر اسے سلطان پور کا ضلعی افسر مقرر کر دیا گیا۔ آدینہ بیگ نے لالہ سری نواس کو اپنا نائب بنالیا اور اس کے بڑے بھائی بھوانی داس کو دفاتر مہتمم مقرر کیا۔ بھوانی داس فارسی اچھی طرح جانتا تھا[3]

نادر شاہ کے حملے کے بعد سکھوں نے پورے علاقے میں بالخصوص دوآبہ جالندھر میں، تیزی سے سر اٹھایا۔ زکریا خان کنے آدینہ بیگ کو یہاں کا فوجدار مقرر کیا اور سکھوں کے خلاف سخت کارروائی کرنے کا حکم دیا۔ آدینہ بیگ نے امن و امان تو بحال کر دیا۔ تاہم اس نے سکھوں کے خلاف سخت اقدامات نہ کئے۔ بلکہ اس نے جان بوجھ کر ان کی کچھ سرگرمیوں کو نظر انداز کیا اور انھیں اس حد تک ڈھیل دی۔ کہ اس کی عمل داری میں سنگین گڑبڑ پیدا نہ کر سکیں۔ وہ سکھوں کی ہمدردی حاصل کر کے اپنی پوزیشن مستحکم کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے سکھوں سے اچھا سلوک کیا۔ ان سے معاہدہ طے کر لیا۔ اور انھیں بہت سے گاؤں جاگیر کے طور پر دیئے[4]

---

[1] گپتا، لیٹر مغل ہسٹری آف دی پنجاب، ص ۲۵

[2] کنگ۔ ضلع سلطان پور تحصیل نکودر میں واقع ہے۔

[3] احوال آدینہ بیگ خان، ص ۵۰ ب

[4] (۱) گپتا، لیٹر مغل ہسٹری آف دی پنجاب، ص ۶۰-۶۱ (۲) جیمز براؤن، انڈیا ٹریکٹس دوم، ص ۱۴

زکریا خان اس صورتِ حال سے مطمئن نہ تھا چنانچہ اس نے آدینہ بیگ کو سخت احکامات بھیجے۔ کہ سکھوں کو صوبے سے نکال دے۔ اب اس کے پاس ان احکامات پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا چنانچہ اس نے سکھوں کو علاقہ خالی کر دینے کا حکم دے دیا۔ اس پر سکھوں نے جسا سنگھ ٹھوکا (بعدازاں رام گڑھیہ) کو اپنا وکیل بنا کر آدینہ بیگ کے پاس بات چیت کے لیے بھیجا۔ آدینہ بیگ نے جسا سنگھ کو اس حد تک رجھایا کہ اس نے آدینہ کے تحت عہدہ قبول کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی اور اپنے متعدد ساتھیوں کے ہمراہ آدینہ کی ملازمت میں آگیا اور کافی عرصہ تک اس کی خدمت میں رہا[1]

آدینہ بیگ نے سکھوں کے بارے میں دوستانہ رویہ ہر دور میں برقرار رکھا۔ جون ۱۷۴۹ء میں معین الملک نے اسے حکم دیا کہ شمالی پہاڑی علاقوں میں سکھوں کی طاقت کو کچلے۔ لیکن اس نے حسب سابق ان کے خلاف موثر قدم اٹھانے سے گریز کیا[2] سکھ بھی آدینہ بیگ سے زیادہ عداوت نہ رکھتے تھے۔ اور اکثر و بیشتر اس کے پاس خدمات انجام دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ اصل میں دونوں اپنے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ایک دوسرے کی آڑ لے رہے تھے۔ اور ان کی دوستی ذاتی مفاد پر مبنی تھی۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں کا ایک دوسرے پر سے اعتماد اٹھ گیا اور آخر میں جب آدینہ بیگ کو چھ ماہ کے لئے لاہور کی حکومت ملی۔ (مئی ۱۷۵۸ء سے ۱۵ ستمبر ۱۷۵۸ء تک) تو اس نے سکھوں کے خلاف اسی طرح کی تادیبی کارروائیاں کیں جیسی زکریا خاں اور معین الملک کے عہد میں کی گئی تھیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود اس سارے عرصے میں اصل کشمکش سیاسی تھی۔ اگرچہ سکھوں کی لوٹ مار میں سیاسی عزائم کے ساتھ مذہبی جنون بھی کارفرما تھا۔ تاہم سرکاری سطح پر مذہبی رواداری کی فضا برقرار رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔

اس عہد کے دیگر ممتاز غیر مسلم حکام میں لالہ بشمبر داس[3]، ندھان سنگھ[4]، راجہ گوردت مل[5]، جوہری مل،

---

[1] لیٹر مغل ہسٹری آف دی پنجاب، ص ۶۰

[2] جیمز براؤن، ص ۱۶

[3] احوال آدینہ بیگ خان، ص ۵۶ الف، ۵۶ ب [4] ایضاً، ص ۵۲ الف

[5] گرفن، راجاز آف دی پنجاب، ص ۵۰۰، لاہور ۱۸۷۰ء

درگاہی مل[1] وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ مقامی سطح پر ہندوؤں کو نمایاں ملازمتیں دی جاتی تھیں۔ صرف ایک مثال ملاحظہ ہو۔ کہ ۱۷۳۱ء سے ۱۷۵۹ء تک گجرات کے ۲۸ ضلعی حکام میں سے ۱۳ ہندو اور سکھ تھے۔ ان میں سے نمایاں سردار بھگوان داس بخشی رام سہائے، رائے ماگھی مل، لالہ امیر سنگھ، شام سنگھ، اور ضیا رام تھے[2]۔

ناظمانِ پنجاب نے مذہبی رواداری کو اپنی پالیسی کا جزو لاینفک بنائے رکھا۔ اکثر غیر مسلم مورخین مثلاً کننگھم، ہری رام گپتا، گوکل چند نارنگ اور گنڈا سنگھ وغیرہ نے سکھوں کے بارے میں ناظمان کی پالیسی کو مذہبی تعصب اور تنگ نظری کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ حالانکہ اس عہد کی تاریخ کا گہرا مطالعہ اس حقیقت کی وانشگاف عکاسی کرتا ہے کہ سکھ پنجاب میں امن و امان قائم کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ وہ منظم انداز میں غارت گری میں مصروف تھے۔ پنجاب کے نظم ونسق کو استوار کرنے کے لئے ان کی کاروائیوں کا انسداد ضروری تھا۔ ناظمان نے اس طرف خاطر خواہ توجہ دی۔ یہ الگ بات ہے کہ لاقانونیت کے طوفان کی یلغار میں کمی آنے کی بجائے شدت پیدا ہوتی گئی۔ بہرحال پنجاب میں مغل حکومت کا یہ آخری دور اپنی سیاسی زوال پذیری کے باوجود مذہبی شعور اور اسلامی رواداری کی قابل قدر مثالوں سے تہی داماں نہیں ہے

---

[1] احوال آدینہ بیگ خان، ص ۷۵ الف و ب

[2] کیپٹن اے بی۔ ایلیٹ، کرانکلز آف گجرات، ص ۷۸ - ۷۹، لاہور ۱۹۰۲ء

باب ۱۵

تہذیبی وثقافتی زندگی

پنجاب میں مسلمانوں کے دورِ زوال کے سیاسی شب و روز کا احوال بیان کرنے کے بعد مناسب سمجھا گیا ہے۔ کہ اس عہد کی علمی، ادبی اور مذہبی زندگی پر بھی ایک طائرانہ نظر جائے۔ زیر بحث زمانہ تاریخ پاک وہند کی اہم ترین کڑی ہے۔ ایک عظیم الشان دور کا خاتمہ ہے۔ ایک عظیم تہذیبی روایت پر عالم نزع طاری ہے۔ سیاسی اکھاڑ پچھاڑ نے سماجی زندگی کو درہم برہم کر کے رکھ دیا ہے۔ اس کے باوجود یہ عہد ذہنی اور فکری اعتبار سے بانجھ نہیں۔ بلکہ اس زوال پذیری کے زمانے میں بھی اتنا جاندار ہے۔ کہ وثوق کے ساتھ دعویٰ کیا جا سکتا ہے۔ کہ اگر اسے اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب کا زمانہ نصیب ہوتا۔ تو یہ عہد تاریخ میں سنہری حروف سے رقم ہو سکتا تھا، مگر افسوس کہ ع آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند۔ ہمارے ہاں اس عہد پر کما حقہ توجہ نہیں دی گئی۔ صرف سیاسی زوال کی المناک کہانیوں کو اس عہد کی میراث سمجھ لیا گیا ہے۔ جس کے نتیجے میں اس دور کا ذہنی سرمایہ نظروں سے اوجھل رہ گیا ہے۔ آئندہ اوراق میں اسی زوال پذیر عہد کی ذہنی اور فکری سرگزشت بیان کرنے کی سعی کی گئی ہے

اس باب کو چھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(الف) فارسی ادب　　(ب) پنجابی ادب

(ج) اردو ادب　　(د) صوفیائے کرام

(ہ) علمائے کرام　　(س) تعمیرات

یہ بازار سکھوں کے زمانے تک مشہور رہا۔ جہاں ہر وقت ایسے کاتب، مصور، صحاف، جدول ساز وغیرہ وجود رہتے تھے جن کا ذریعۂ معاش مختلف کتابوں کی نقل اٹھانا اور انہیں مصور کرنا ہوتا تھا[1]

نواب عبدالصمد خاں کے یہاں ہر روز بعد از نماز عصر محفل مشاعرہ منعقد ہوتی تھی۔ جس میں تمام نامور شعراء اپنا کلام سناتے تھے۔ ان کے علاوہ شہر کے اکابرین کے ہاں بھی ادبی مجالس منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ آزاد بلگرامی نے میر جمال الدین اور میر فخر الدین حسین کے ہاں منعقدہ ایک اجتماع سخنوراں کا حوالہ دیا ہے۔ وہاں میر محمد زمان راسخ سرہندی بھی موجود تھے۔ ان کے ایک شعر پر اعتراض کیا گیا۔ شاہ آفرین نے معترض کا تسلی بخش جواب دیا[2]

غلام محی الدین المعروف بہ خواجہ سنگین لاہور کے ایک صاحب ذوق امیر تھے۔ ان کے ہاں بھی اس قسم کی محفلیں ہوتی رہتی تھیں۔ شیخ خیر اللہ فدا ان کی مجلس کے خاص رکن تھے۔

شعری محاورے بھی ہوتے رہتے تھے۔ محمد عاقل یکتا اور احمد یار خاں یکتا میں معرکہ ہوا۔ عاقل یکتا کے تخلص کو اپنے لیے مخصوص کرنا چاہتے تھے۔ احمد یار خاں نے پیشکش کی۔ کہ جو اچھی غزل کہے تخلص اس کا رہے گا۔ چنانچہ ایک مقررہ مکان پر لاہور کے جملہ ارباب سخن جمع ہوئے۔ احمد یار خاں کی غزل اتنی بھرپور تھی کہ عاقل نے اپنی غزل پڑھنا بھی مناسب نہ سمجھا۔ یہ تھا وہ ماحول جس میں اس عہد کے ادبی اور علمی ذوق نے فروغ پایا اور اس کی جڑیں دربار شاہی سے ہٹ کر وسیع پیمانے پر براہِ راست عوام میں پیوست ہوئیں۔

عبدالصمد خاں کی ادبی سرپرستی

یہ دور سیاسی اور سماجی اقتدار کی شکست و ریخت کا دور تھا۔ عظیم مغلوں کی قائم کردہ روایات آہستہ آہستہ قصۂ پارینہ بنتی جا رہی تھیں۔ مغلوں نے علم و ادب کی جو سرپرستی کی۔ وہ برصغیر کی تہذیبی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ اس دورِ زوال میں ان علمی سرپرستوں اور قدر دانیوں کا احیاء تو نہ ہو سکا۔ تاہم ناظمان پنجاب مقدور بھر

---

[1] علم الدین سالک (مقالہ)، علمائے کرام دینی مدارس، نقوش لاہور نمبر ۱۹۶۲ء

[2] خزانہ عامرہ ، ص ۲۹ - ۳۰

کوشش کرتے رہے۔ اس ضمن میں عبدالصمد خاں کا دور خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے اعلیٰ علمی ذوق اور ادبی سرپرستی نے اس دور میں فارسی ادب کو بے حد تقویت پہنچائی۔ حاکم لاہوری لکھتا ہے۔

" در سالی سہ ہزار خلعت فاخرہ در عیدین در زمستان باہل صحبت از اکابر و اصاغر عطا می شد و در محفل فیض منزل عمدہ نادہ ہائے قدیم ہندوستان و شرفا، علما و اکابر توران، صاحب طبعان ایران حاضر می شدند۔ اکثر قال اللہ و قال الرسول و درس تفسیر و حدیث بیان می آمد۔ و جمیع حضار مجلس اکثر علک دوام، از الطاف بیکراں ایشاں ممنون و مرہون بودند۔ مابین ظہر، عصر مشاعرہ مقرر بود۔ از دیوان مرزا صائب خود بدولت معنی ہائے دقیق را حل می نمودند۔ ایں فقیر صحبت نواب اعتماد الدولہ وزیر سابق و نواب صفدر جنگ وزیر لاحق مکرر دریافتہ آں طور و آداب مجلس و بے تقیدی یا ایں ہمہ مراتب عمدگی درین جا ندیدہ[1]

عبدالصمد خاں اپنی سیاسی اور انتظامی مصروفیات کی بنا پر شاعری کی طرف کماحقہ، توجہ نہ دے سکے۔ وگرنہ طبع موزوں رکھتے تھے۔ ان کا ایک شعر حاکم لاہوری نے اپنے تذکرہ مردم دیدہ میں نقل کیا ہے۔

تا عیب کسی برو نگویم ۔۔۔ چوں آئینہ از صفا گذشتیم[2]

خان موصوف کی سخن دانی اور سرپرستی کا ذکر تذکروں میں ہی محفوظ نہیں۔ بلکہ قصیدوں میں ان کی ان خوبیوں کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ مرزا محمد بیرنگ کے ایک قصیدے کا شعر ملاحظہ ہو ؎

بر امید قدر دانی آمدم در حضرتت
خود سخن صاحب سخن پیش سخنداں می برد[3]

---

[1] مردم دیدہ ، ص ۱۷۱ ، مرتبہ ڈاکٹر سید عبداللہ ، لاہور ۱۹۶۱ء نیز ص ۱۰۷

[2] (۱) ایضاً ص ۱۷۴

(۲) مظفر حسین صبا ، تذکرہ روز روشن ، ص ۵۲۵ ، تہران ۱۳۴۳ھ

[3] مردم دیدہ ، ص ۱۵۴

اس عہد کے تقریباً تمام شعراء عبدالصمد خاں کی مجلس میں حاضر ہوتے تھے اور ان میں سے بہت سے اپنی درویشی اور استغناء کے باوجود خان موصوف کی مصاحبت میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ بیدل ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء کے وسط میں دہلی کے ناسازگار سیاسی حالات سے گھبرا کر لاہور آ گئے تھے۔ "عبدالصمد خان ناظم لاہور تعظیم و تکریم تمام پیش آمد خدمات شائستہ بہ تقدیم رسانید[1]" بیدل ڈیڑھ سال تک ان کے پاس رہے[2] شاہ فقیر اللہ آفرین آزاد منش بزرگ تھے۔ "سرش باہل دنیا کم فرود آمد۔" عبدالصمد خاں اور زکریا خاں دونوں ان کی بے حد تعظیم و تکریم اور معاشی کفالت کرتے رہے[3] ایک بار عبدالصمد خان نے ان سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ اپنا آدمی بھی بھیجا۔ مگر آفرین گریزاں رہے۔

"آخر بہ تحریک عزیزے عمدہ کہ از مخلصان صمیمش بود نا بہ پاس خاطرش با نواب مرحوم ملاقات کرد۔ نواب مذکور خیلی تعظیم و توقیرش بجا آوردہ نزدیک بہ مسند خود جا داد و یک روپیہ یومیہ مقرر کرد[4]"

آنند رام مخلص اس عہد کی عظیم علمی اور ادبی شخصیت تھی۔ وہ دہلی کے دربار شاہی میں عبدالصمد خاں کا وکیل تھا۔ اُس کے حسن کارکردگی کی وجہ سے اس کو رائے رایاں کا خطاب دیا گیا[5] عبدالحکیم حاکمؔ کے والد شاہنواز خان سے عبدالصمد خاں کے گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ اس بنا پر حاکم کے ساتھ خاں موصوف کا رویہ از حد مشفقانہ اور پدرانہ ہوتا تھا۔ حاکم لکھتا ہے کہ مجھے "کم از فرزنداں خود نمی دانستند۔" آگے چل کر لکھتا ہے کہ

---

[1] آزاد بلگرامی، سرو آزاد، ص ۱۴۹، لاہور ۱۹۱۳ء

[2] عبدالغنی، لائف اینڈ ورکس آف عبدالقادر بیدل، ص ۱۰۹، لاہور ۱۹۶۰ء

[3] (۱) عبدالحکیم حاکمؔ، مردم دیدہ، ص ۱۷،
(۲) اردو دائرہ معارف اسلامیہ، مقالہ "آفرین" جلد اول، ص ۱۳۶

[4] حاکمؔ، مردم دیدہ، ص ۲۰

[5] (۱) آزاد بلگرامی، خزانہ عامرہ، ص ۴۲۵، کانپور (۲) سید عبداللہ، ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، ص ۱۲۸، دہلی ۱۹۴۲ء

"سبحان اللہ ایں قسم شفقت و الطاف پدر ہم در حق فرزند نکند[1]" میر معصوم وجدان کے بارے میں حاکم نے خان آرزو کے حوالے سے لکھا ہے کہ

"مدت مدید رفیق نواب سیف الدولہ عبدالصمد خاں بہادر صوبہ لاہور و ملتان، و بعد از فوت او با زکریا خاں بہادر پسر نواب مذکور در آنجا می بود[2]"

عباس قلی خاں فلانی بھی عبدالصمد خاں کی صحبت میں شامل رہتے تھے اور "نواب مغفور خیلی تعظیم و توقیرش می نمود[3]" اندر جیت منشی تخلص نے سسی پنوں کے قصے کو فارسی میں نظم کیا۔ ۱۱۴۰ھ میں عبدالصمد خاں کے ہمراہ لاہور سے ملتان آئے اور ان کے منشی مقرر ہوئے[4]

فاضل خاں منصب سے خاں موصوف حد درجہ اخلاص رکھتے تھے۔ "بلکہ معتقد و مخلص او بود[5]" حاکم نے قابل خاں مرزا کو ایک بار عبدالصمد خاں کی مجلس دیکھا تھا لکھتا ہے کہ "نواب مغفور گوشہ چشم عنایت بحالش داشتند و توقیرش ہم نمودند[6]" میر محمود خاں الحسینی خرد عبدالصمد خاں کے معزز و مکرم مصاحبین میں سے تھے۔ "چندی بدیوانی سرکار نواب مغفور فائز بود، آخر استعفا داد و بمصاحبت فقط اکتفا کرد[7]" میرزا مقیمای

---

[1] عبدالحکیم حاکم، ص ۱۷۲

[2] ایضاً، ص ۱۰۶

[3] ایضاً، ص ۱۷۶

[4] خواجہ عبدالرشید، تذکرہ شعرائے پنجاب، ص ۲۴۴، کراچی

[5] (۱) عبدالحکیم حاکم، مردم دیدہ، ص ۹۳
(۲) سید عبدالوہاب افتخار، تذکرۂ بے نظیر، الہ آباد ۱۹۴۰ء

[6] مردم دیدہ، ص ۱۸۳

۷۔ عبدالحکیم حاکم، مردم دیدہ، ص ۱۶۰

لاہوری بھی عبدالصمد خاں سے وابستہ تھے اور نواب ان کی بہت عزت کرتے تھے[1] مرزا محمد بیزنگ عبدالصمد خاں کے ملازمین میں سے تھے[2] آغو خاں مغل دیدہ سابق صوبہ دار کشمیر بھی عبدالصمد کے ارباب مجلس میں سے تھا۔[3] خواجہ اسماعیل خاں خلیل، عبدالصمد کے چھوٹے بھائی خواجہ عبدالمومن کا بیٹا اور زکریا خاں کا داماد تھا۔ "جوان سلیم و ذہنش وقاداست و طبع درست دارد"[4]

زکریا خاں اپنے والد کی روایتوں کا امین تھا چنانچہ یہ ماحول عبدالصمد خاں کی وفات کے بعد برقرار رہا۔ اگرچہ اس میں وہ شدت اور تروتازگی نہ رہی، بقول حاکم "لیکن صحبت شعر برہم نخورد"[5] عبدالصمد کے عہد میں امرائے شہر بھی علمی سرپرستی میں کسی سے کم نہ تھے۔ حاکم نے شیخ خیر اللہ ذرا کے احوال میں غلام الدین خاں المعروف خواجہ سنگین کا ذکر کیا ہے۔ جو لاہور کا ایک رئیس، شعراء اور اہل علم کا قدردان تھا۔ ذرا طویل عرصے تک اس کے ہم نشین رہے اور خان مذکور "خیلی تعظیم او رمی کرد و مراعات می نمود"[6] میر معصوم وجدان بھی خواجہ مذکور سے وابستہ رہے[7]

اس دور کے فارسی اہل قلم کی فہرست خاصی طویل ہے۔ مختصر الفاظ میں نمایاں شخصیات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ تاکہ اس عہد کی ادبی زندگی کی تصویر نمایاں ہو کر سامنے آسکے۔

---

[1] (۱) آزاد بلگرامی، خزانہ عامرہ، ص ۴۴۲

(۲) خواجہ عبدالرشید، تذکرہ شعرائے پنجاب، ص ۴۴۰

[2] عبدالحکیم حاکم، مردم دیدہ، ص ۱۵۲

[3] عبدالحکیم حاکم، مردم دیدہ، ص ۱۶۳

[4] ایضاً، ص ۱۶۲

[5] ایضاً، ص ۱۰۸

[6] ایضاً، ص ۱۷۶

[7] ایضاً، ص ۱۰۷

آفرین

شاہ فقیر الدین آفرین لاہوری، "شاعری بود معنی آفرین و شائستہ صد ہزار آفرین"[1] "درویش طبع انسان تھے۔ ۱۱۵۴ھ میں رحلت پائی۔ فارسی کے صفِ اول کے شعراء میں سے تھے[2] ۱۱۴۳ھ میں پنجاب کے مشہور قصے ہیر رانجھا کو فارسی میں نظم کیا۔ اس قصے کے بارے میں ڈاکٹر باقر کی رائے یہ ہے کہ آفرین کی زبان الجھی ہوئی ہے اور مطالب میں واضح تسلسل نہیں ایسے معلوم ہوتا ہے۔ کہ پرشکوہ الفاظ جمع کرتے ہوئے مطالب کا دامن شاعر کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہیر رانجھا کے قصے کی عہد بہ عہد مقبولیت کے نشانِ راہ کی حیثیت سے آفرین کی مثنوی ایک اہم حیثیت رکھتی ہے[2] اس دور میں ناصر علی سرہندی کا انداز ہر طرف چھایا ہوا تھا۔ آفرین پر بھی اس کی گہری چھاپ ہے۔ اس کے علاوہ وہ مرزا صائب سے بھی متاثر تھے۔ ان کا دیوانِ غزلیات ۷ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ ہیر رانجھا کے علاوہ ان کی دو مثنویاں ابجد فکر اور ابان معرفت بھی ہیں۔ ان کا حلقۂ تلمذ خاصا وسیع تھا[3]

آنند رام مخلص

اپنے زمانے کے بہت بڑے فاضل تھے۔ سودہرہ سے تعلق رکھتے تھے۔ صاحبِ سفینۂ خوش گو نے ان کی شاعری کے متعلق لکھا ہے۔ "شاعری معنی تلاش خوش زبانی او در یں جزو زمان کمیاب است بیشتر دلوانی

---

[1] آزاد بلگرامی، خزانہ عامرہ، ص ۲۸

[2] پنجابی قصے فارسی زبان میں، ص ۱۵۰

[3] (۱) حاکم لاہوری، مردم دیدہ، ص ۱۷ تا ۲۲

(۲) آزاد بلگرامی، سرو آزاد، ص ۲۵۰

(۳) اصلح میرزا، تذکرہ شعرائے کشمیر، ص ۳-۴ کراچی ۱۹۶۷ء

(۴) اردو دائرہ معارف اسلامیہ۔ جلد اول۔ مقالۂ "آفرین" ص ۱۳۶

(۵) غلام ربانی عزیز، کلیات آفرین لاہوری، دیباچہ لاہور ۱۹۶۷ء

بطرز میرزا صائب ترتیب داده الحال بطرز میرزا رضی دانش شعری گوید[1] " شاعری میں بیدل سے اصلاح لیتے تھے ان کا کلام سادگی اور روانی سے متصف ہے۔ مخلص کے کلام میں تمثیل زیادہ ہے اور اس چیز سے اس کے کلام میں ایک شوخی پیدا ہوگئی ہے۔

ے بہ گلشن چند سروی دیدم و فریاد سر کردم	کہ یادم داد رنگین صحبتِ یاران موزون را
ے بر دلِ ما تیرہ روزان زان صفِ مژگان گذشت	آنچہ از فوجِ دکن بر ملکِ ہندوستان گذشت
ے بہ تحریکِ نسیمی زلف او زیر و زبر گردد	ہزار افسوس امن از کشورِ ہندوستان گم شد

باایں ہمہ امر مخلص کا شاعرانہ مقام اس کی زبان دانی اور انشا پردازی سے فرو ہے کسی واقع یا منظر کا صحیح نقشہ کھینچنے میں مخلص کمال کر دکھاتا تھا، کلام میں متانت اور روانی تھی۔ اس کو زبان پر کافی قدرت حاصل تھی۔ وہ انشا میں بلا تکلف اہل زبان کے محاورات استعمال کرتا ہے، نثر کے کچھ فقروں کے بعد شعر لاتا ہے۔ اور برمحل لاتا ہے۔ مخلص فارسی کے بلند پایہ ادیبوں میں سے تھا۔ اور ادبیات کی کوئی تاریخ اس کو نظر انداز نہیں کر سکتی[2]

میر محمد علی رائج سیالکوٹی

" مردی آزاد مشرب، خوش خلق، خوش صحبت بود، و در شہر خود قلندرانہ می گذرانید و ہنگامۂ سخنوری گرم داشت[3] " مرزا اصلح لکھتا ہے۔ " نقد سخنش در دار الضرب سخن رائج الوقت و کامل المعیار است[4] " فن شعر میں مرزا بیدل کے غائبانہ شاگرد تھے[5] خان آرزو نے لکھا ہے کہ " دیوان

---

[1] بندرابن داس خوشگو ، ص ۳۲۱

[2] ڈاکٹر سید عبداللہ ، ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ ، ص ۱۳۸-۱۳۷

[3] آزاد بلگرامی ، سروِ آزاد ، ص ۲۰۵

[4] تذکرۂ شعرائے کشمیر ، ص ۹۷

[5] بندرابن داس خوشگو ، ص ۲۱۶ ، پٹنہ ۱۹۵۹ء

کلانی دارد۔ آنچہ بنظر فقیر آرزو در آمدہ قریب بیست ہزار خواہد بود۔ بسیار بدقت حرف می زند و خیلی تلاش معنی تازہ دارد۔ از دیوان او دریافت می شد کہ مثل آن ہم طرحاں راکم اتفاق افتادہ[1] " حاکم لکھتا ہے کہ " در فارسی و فن نظم و نثر بسیار ماہر بود ———— و در شعر طور تازہ دارد معنی بند و مضمون یاب است، خوش محاورہ و نقل ہای رنگینی و حرف ہای شیرین می کرد[2] " بیس ہزار اشعار پر مشتمل ضخیم دیوان کے مالک تھے شعر پڑھنے کا اپنا منفرد انداز رکھتے تھے۔ سو سال کے لگ بھگ عمر پاکر ۱۱۵۰ھ میں لاہور میں رحلت پائی۔ سیالکوٹ میں دفن کئے گئے۔ حاکم نے تاریخ وفات کہی۔ رفت رائج بعالم باقی[3]

عبدالحکیم حاکم لاہوری

حاکم کے والد شادمان خاں کے عبدالصمد خاں کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے۔ حاکم بچپن سے ہی شعر و شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ شاہ آفرین سے اصلاح لیتے تھے۔ وسیع حلقہ احباب رکھتے تھے۔ " مردم دیدہ " کے نام سے انھوں نے (۱۱۷۵ھ میں) معاصر ادبی شخصیتوں کا احوال لکھا۔ جو اس عہد کی ادبی اور سماجی زندگی پر اہم دستاویز ہے۔ شاعری میں بھی ممتاز مقام رکھتے تھے۔ چند منتخب اشعار ملاحظہ ہوں ے

طفلی کہ از حیا نہ گرفتی گل از کفم	ساغر ز دست غیر بہ مے خانہا گرفت
ے تہمت دزدیٔ دل رابکہ بندم آخر	ہر کرا می نگرم نام ترا می نگرد
ے در خامشی ہزار سخن می کند ادا	صد آفرین بہ چشم سخن آفرین تو[4]

---

[1] بحوالہ ، مردم دیدہ ، ص ۷۶

[2] ایضاً

[3] (۱) آزاد بلگرامی ، خزانہ عامرہ ، ص ۲۴۴ - (۲) حاکم ، مردم دیدہ ، ص ۷۷

[4] حاکم ، مردم دیدہ ، ص ۷۳-۷۰

سیالکوٹی مل وارستہ

میر محمد علی رائج سے شرف تلمذ رکھتے تھے۔ شاعری میں ان کا پایہ اتنا بلند نہ تھا۔ ان کی سب سے بڑی فضیلت انشا پردازی اور محاورہ دانی تھی۔ وہ اپنے زمانے کے بہترین محقق تھے، ان کی قوت تنقید بے نظیر تھی۔ انھوں نے خان آرزو اور آزاد بلگرامی جیسے اساتذۂ فن پر تنقید کی۔ متاخرین وارستہ کو استاد تسلیم کرتے ہیں۔ علم شعر کو وارستہ نے نئی ترکیب سے مدون کیا۔ ان کی سب سے اہم تالیف "مصطلحات الشعراء" ہے جو ۱۱۸۰ھ میں تمام ہوئی۔ اس میں جدید محاورات اور چیدہ چیدہ مصطلحات کو جمع کیا گیا ہے[1]

شیخ خیر اللہ فدا

میرزا محمدی بیرنگ کے شاگرد تھے۔ حاکم لکھتا ہے۔ "در عالم مثنوی گوئی چوں وی بنظر نیامده، معنی ہای بلند و مضمونہای دلپسند در مثنویات خود بکار بردہ۔ در تلاش و شوخی الفاظ ثانی زلالی بود۔ می خواست کہ جواب سبعہ سیارہ او بگوید۔ چنانچہ چہار مثنویاں ترتیب داد۔ فرصت جواب بقیہ نیافت۔" آگے چل کر حاکم نے لکھا ہے کہ "درین ولا در لاہور شاعری از و بہتر نبود، شعرش بپایۂ استادی رسیدہ بود۔"[2] صاحب سفینۂ خوشگو کی رائے ہے۔ "در سخن سنجان آن ضلع بمثنوی گوئی امتیاز دارد و غزل کم فکر کرده بہ مذاق تصوف خیلی آشنا بوده"[3] لاہور کے ممتاز سردار خواجہ سنگین مخاطب بہ غلام محی الدین ان کی بے حد تعظیم کرتے تھے۔ فدا مدتوں اس کی مجلس میں رہے۔ اس کے انتقال کے بعد انہوں نے گوشہ نشینی[4]

---

[1] ڈاکٹر سید عبداللہ، ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، ص ۱۵۰ - ۱۴۴

[2] مردم دیده، ص ۷۸ - ۱۷۷

[3] بندرابن داس خوش گو، ص ۲۴۴

[4] مردم دیده، ص ۷۷ - ۱۷۶

اختیار کرلی۔

بیغم بیراگی

سوامی بھوپت رائے بیراگی کھتری قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے آبا واجداد پنجاب میں قانونگو رہے تھے عشق مجازی کے ایک حادثے کے بعد بیغم بیراگی ہو گئے۔ انھوں نے بہت سی کتابیں لکھیں بیغم کا کلیات پندرہ ہزار اشعار پر مشتمل تھا۔ ان کی وفات ۱۱۴۲ھ میں ہوئی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "ان کی نظمیات کا بیشتر حصہ فقر و عرفان کے جذبات سے لبریز معلوم ہوتا ہے۔ تصوف کا اس کے دماغ پر بہت اقتدار تھا۔ اسی مذہبی اور صوفیانہ ذہنیت کا اثر تھا۔ کہ اس کا کلام زیادہ تر تصوف کے متعلق ہے۔

فارسی کے ہندوستانی لٹریچر میں بیغم کی مثنوی کو خاص درجہ حاصل ہے۔ مثنوی بیغم کا مطالعہ بتاتا ہے۔ کہ مولوی رومی بیراگی کے روحانی استاد تھے۔ مثنوی بیغم مولانا روم کے خیالات کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے۔ بیغم مثنوی رومی کا شیدائی ہے[1]"

بیغم ہندوؤں کا سب سے بڑا فلسفی شاعر ہے۔ اس کا رنگ تصوف ملاحظہ کرنے کے لئے چند شعر دیکھیں۔

؎ درفضائی عشق جاناں بوالہوس را کار نیست	ہر سرے شائستۂ سنگ و سزای دار نیست

رباعی:-

بیغم سخن عشق بجز یار مگو	سریست سر کوچہ و بازار مگو
گر جملہ جہاں از تو حقیقت پرسید	زنہار جز اقرار ز انکار مگو

---

[1] ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، ص ۳۰۵ - ۲۹۱، دہلی ۱۹۶۷ء

احمد یار خاں یکتاؔ

ان کے اسلاف خوشاب میں رہے تھے۔ ان کے والد اللہ یار خاں لاہور ملتان اور ٹھٹھہ کے صوبیدار رہے۔ یکتا کی ولادت لاہور میں ہوئی۔ جوان ہونے پر وہ بھی صوبہ دار ٹھٹھہ مقرر ہوئے۔ آزاد بلگرامی نے لکھا ہے۔ "یکتای اماثل بود مستجمع فنون فضائل۔ خطوط را در نہایت جودت می نگاشت و تصویر در کمال پختگی می کشید و اقسام شعر بقدرت می گفت[1]"

محمد عاقل یکتاؔ لاہوری کا احمد یار خاں یکتاؔ سے جھگڑا ہو گیا۔ اول الذکر کا کہنا تھا۔ کہ یکتا میرا تخلص ہے، آپ نہ رکھیں۔ احمد یار خان نے کہا کہ آپس میں غزل کہتے ہیں۔ جو اچھی غزل کہے تخلص اس کا ہو جائے گا وقت اور جگہ کا تعین ہو گیا۔ لاہور کے جملہ ارباب سخن جمع ہوئے۔ احمد یار خاں نے غزل پڑھی ہر سمت آفرین و تحسین کا غلغلہ برپا ہوا۔ محمد عاقل خاموش ہو گئے۔ ہر چند دوستوں نے کہا مگر انھوں نے اپنی غزل سنانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ آفریںؔ نے اسی موقع پر کہا ؎

بریں معنی گواہم آفریں ما — کہ احمد یار خاں یکتاؔ ست یکتا

یکتا کا ایک شعر بے حد مشہور ہے ؎

چہ پرسی از سرو سامانِ من عمر لیست چوں کاکل — سیہ بختم، پریشاں روزگارم، خانہ بر دوشم

احمد یار خاں یکتاؔ کی وفات ۱۱۴۷ھ میں ہوئی۔ اور خوشاب میں پیوند خاک ہوئے[2]

نور العین واقفؔ

ان کے والد اور آبا و اجداد بٹالہ کے قاضی تھے۔ واقفؔ علی محمد تجرد کے توسط سے حاکم کے ساتھ اخلاص[3]

---

[1] سرو آزاد، ص ۱۹۹

[2] سرو آزاد، ص ۲۰۰-۱

[3] مجمع النفائس بحوالہ مردم دیدہ، ص ۱۱۴

رکھتے تھے۔ حاکم لکھتا ہے۔ "افکار آبدارش خیلی موثر و بہ درد است، معانی بلند و پاکیزہ و الفاظ شستہ و روانی کلامش رواں را تازگی می بخشد، بالفعل باین طور شعر گفتن خاصہ او است[1]۔ ان کا دیوان ۶، ۷ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ "عاشق غزل است و رباعی ہم خوب می گوید و ہر چہ می گوید ناخن بدل میزند خالی از تلاش و لطف نیست پختگی و استادی از سخنش معلوم است[2]" نہایت پرہیز گار اور متقی تھے، کم اختلاط، بے نیاز، آزاد اور غنی دل تھے۔

میر معصوم وجدانؔ

آفریں سے اصلاح لیتے رہے ہیں۔ "بسیار صاحب قدرت و صاحب تلاش بود سخنش خیلی شوخی و رنگینی و مضامین تازہ داشت و زمین ہای سنگلاخ طرح می کرد[3]" ۲۰ ہزار اشعار پر مشتمل ان کا دیوان تھا۔ قصائد اور مثنویاں علیحدہ تھیں۔ مدتوں عبد الصمد خاں سے وابستہ رہے۔ زکریا خاں نے بھی ان کی امداد بحال رکھی۔ آخر کار ۱۱۶۰ھ میں انتقال ہو گیا[4]

نواب ابو البرکات صوفیؔ

روسائے کشمیر میں سے تھے، کشمیر کے صوبہ دار بھی رہے۔ درویش طبع اور کشادہ دست تھے۔ اعلیٰ پائے کے شاعر، منشی اور خوش نویس تھے۔ حاکم لکھتا ہے۔ "بسیار سخی و اہل دل و درویش دوست بود[5]"

---

[1] مردم دیدہ، ص ۱۲۵

[2] مردم دیدہ، ص ۱۱۵

[3] مردم دیدہ، ص ۰

[4] مردم دیدہ، ص ۱۰۶ تا ۱۰۸

[5] مردم دیدہ، ص ۱۶۸

زکریا خان سے دوستانہ مراسم رکھتے تھے۔ مرزا اصلح نے تذکرۂ شعرائے کشمیر میں ان کا ایک شعر درج کیا ہے۔

نہ از بدگوئی اغیار نی از یار می ترسم
مزاجی نازکی دارم زخود بسیار می ترسم [1]

مرزا محمد بیرنگ

عبدالصمد خاں کے ملازمین میں سے تھے۔ "مرد فاضل و حکیم و شاعر بود [2]" دیوان چار ہزار اشعار پر مشتمل تھا نعت، منقبت، قصائد اور مثنوی بھی کہتے تھے۔ سنہ ۱۱۵۰ھ میں وفات پائی ساسی روز چند ساعت کے فرق سے میر محمد علی رائج کا بھی انتقال ہوگیا۔ خیر اللہ فدا ان کے شاگرد تھے [3]

میر محمود خاں حسینی خرد

عبدالصمد خان کے ممتاز امراء میں سے تھے۔ مگر منصب سے مستعفی ہو گئے اور صرف مصاحبت پر اکتفا کیا۔ حاکم لکھتا ہے۔ " از خوبی ہا و کمالات و نیز بگی اوچہ نویسد کہ فاضل متبحر و از اکثر علوم عربیہ مطلع بود و خیلی طبع ملائم و وضع ہموار داشت۔ جستہ جستہ فکر شعری کرد۔" سنہ ۱۱۶۱ھ میں انتقال ہوا [4]

عباس قلی خاں فلانی

داغستانی تھے۔ عالمگیر کے عہد میں دکن آئے اور منصب پایا۔ بعد ازاں عبدالصمد خاں سے وابستہ ہوئے۔ "مرد خوش کلام و خوش تقریر بود۔ و نقلہای شیریں و حکایتہای رنگینی می کرد۔ بسیار دماغ عالی

---

[1] (۱) اصلح، تذکرۂ شعرائے کشمیر، ص ۲۱۷

(۲) حاکم نے یہ شعر اس طرح نقل کیا ہے ؎ نہ از بدخوئی یار و نہ از اغیار می ترسم
مزاجِ نازکی دارم زخود بسیار می ترسم (مردم دیدہ، ص ۱۶۸)

[2] مردم دیدہ، ص ۱۵۴

[3] ایضاً، ص ۱۵۰

[4] ایضاً، ص ۱۷۰

داشت ــــــ شعر کم می گفت لہذا اشتہار نیافت [1] "

میر محمد نعیم دلاور خان نصرت سیالکوٹی

ان کا انتقال سنہ ۱۱۳۹ھ میں ہوا۔ "دلاور میدان شاعری بودہ، و شناور دریای نظم گستری [2]" صاحب تذکرہ بے نظیر لکھتا ہے۔ "فکرش رنگین است و اشعار ابدار دارد [3]" سفینۂ خوشگو کا مصنف بندرابن داس خوشگو نصرت کے بارے میں رقمطراز ہے۔ " وجود نصرت نہ تنہا برائے ادبیات فارسی مایۂ افتخار بود۔ بلکہ بدون تردید نصرت موجد دمربی خانوادہ ای نویسندہ، شاعر و خطاط بود کہ نظیر آں در تاریخ ادبیات شہر سیالکوٹ دیدہ نمی شود [4] "

میر عبدالواحد ترمذی ثم لاہوری

سنہ ۱۱۳۴ھ میں انتقال ہوا۔ "طبع لطیفش در زبان فارسی و ہندی و نظم پردازی ممتاز و ذہن سلیم ش بفکر ارجمند در سخن طرازی دمساز [5] "

سید عبداللہ تجرد

گوشہ نشین اور بے نیاز طبع بزرگ تھے۔ نماز پنجگانہ کے سوا حجرے سے باہر نہ نکلتے۔ قناعت

---

[1] مردم دیدہ، ص ۱۷۶

[2] قدرت اللہ گوپاموی، نتائج الافکار، ۷۲۵، بمبئی ۱۳۳۶ھ

[3] عبدالوہاب افتخار، ص ۱۴۴، الہ آباد ۱۹۴۰ء

[4] ایضاً، ص ۲۶۸

[5] خواجہ عبدالرشید، تذکرہ شعرائے پنجاب، ص ۸۰

وتوکل پرگزارا کرتے ، مطالعۂ کتب میں مشغول رہتے ، اعلیٰ درجہ کا ذوقِ سخن رکھتے تھے[1] "

میرزین العابدین عاطر

وجدان کے شاگرد تھے ۔ ذہن رسا رکھتے تھے ۔ تاہم اپنا شعری مقام حاصل کرنے سے پہلے ہی انتقال کر گئے[2]

قابل خاں میرزا

ایرانی النسل ، خود ہندوستان میں پیدا ہوئے ۔ بہادر شاہ کے عہد میں لاہور آئے ۔ شاہ آفرین سے خاصی شناسائی تھی ۔ عبدالصمد ان پر عنایت کرتے تھے ۔ اور ان کی توقیر کرتے تھے ۔ صاحب سفینہ خوشگو کا کہنا ہے کہ " طبعی بلند و اکثر اشعار دل پسند دارد ۔ صاحب دیوان ضخیم است واز مغتنمات وقت است[3] "

ملا جیون متین

حاکم سے اصلاح لیتے تھے ۔ مردم دیدہ کی تالیف کے وقت یہ ابھی طالب علم تھے ۔ تاہم حاکم ان کی تعریف میں رطب اللسان ہے اور ان کا یہ شعر درج کیا ہے ؎

گر حق طلب کنی سگِ اصحاب کہف باش
بگذار ہم نشینیٔ اصحاب فیل را[4]

---

[1] حاکم ، مردم دیدہ ، ص ۱۵۷

[2] حاکم ، مردم دیدہ ص ۱۷۶

[3] (۱) ، بندرابن داس خوشگو ، ص ۲۷۴ (۲) مردم دیدہ ، ص ۱۸۳

[4] مردم دیدہ ، ص ۱۸۶

میاں محمدی وارد

نورالعین واقف کے بھانجے تھے ۔ جوانی میں ہی انتقال کر گئے ۔ " جوان بسیار عزیز و سلیم الطبع بود[1] " شاعری میں ماموں سے مشورہ کرتے تھے ۔ ان کا ایک شعر ہے ؎

درچمن دوش بیاد تو قیامت ہا کرد
نالۂ بلبل و فریاد من و زاریٔ دل[2]

میرزا نصراللہ بیگ یتیم

ان کے والد منعم بیگ ناظم لاہور ، زبردست خان کے ملازمین میں سے تھے ۔ پہلے آفرین اور پھر حاکم سے مشق سخن میں مشورہ کرتے تھے ۔ " جوان صاحب تلاش و بسیار خوش فکر و شجاع بود[3] " مگر آخری عمر میں دیوانگی کی نوبت آگئی اور جنوں اس حد تک جا پہنچا کہ گلی کوچوں میں سر و پا برہنہ پھرتے رہتے ، جلد ہی فوت ہو گئے ۔ شعر خوب کہتے تھے ۔ اگر زندہ رہتے تو استادی کے مقام تک پہنچتے[4]

میرزا مقیمای بخاری

تیس سال میرزا صائب کی خدمت میں رہے ۔ عبدالصمد خان سے بھی وابستہ رہے ۔ سو سال عمر پاکر اوائل عہد محمد شاہ میں فوت ہوئے[5]

حاجی بیگ ہنر

آفرین کے شاگرد تھے ۔ " دیوانی در چند روز ترتیب داد باین جلدی شعر گفتن و دیوان درست

---

[1] مردم دیدہ ، ص ۱۹۰

[2] ایضاً ، ص ۱۹۰

[3] ایضاً ، ص ۱۹۱

[4] ایضاً ، ص ۱۸۵

[5] ایضاً ، ص ۱۸۵

کردن ہمیں کار او بود[1] "اواخر عہد محمد شاہ میں رحلت پائی۔

سندر داس آرام

یہ میر معین الملک کے زمانے میں گزرے ہیں۔ انھوں نے ہیر رانجھا کے قصے کو فارسی مثنوی میں نظم کیا۔ اس کا نام مثنوی ہیر و رانجھا رکھا۔ آرام پیشہ کے اعتبار سے منشی تھے۔ اور متعدد سرکاروں سے متعلق رہے تھے[2]

شیو رام عاشق

۱۱۷۹ھ میں فوت ہوئے۔ نور العین واقف بٹالوی نے آزاد بلگرامی کے نام ایک مکتوب میں ان کے بارے میں لکھا کہ "علامہ روزگار بود۔ صاحب گل رعنا کا کہنا ہے۔ "نظرش در فن سخنوری نایاب"[3]

خواجہ منور قدرت

تورانی تھے مشہور قصبہ آدینہ نگر میں رہتے تھے۔ نامور طبیب بھی تھے۔ اعلیٰ درجے کے شاعر تھے۔ طویل عمر پاکر ۱۱۷۱ھ پائی[4]

مرزا محمد صالح آشفتہ

اصلاً ہرات کے رہنے والے تھے۔ آزاد طبع اور توکل پسند تھے۔ "شعر کم می گفت و چنداں

---

[1] مردم دیدہ ، ص ۹۱-۱۹۰

[2] ڈاکٹر باقر، پنجابی قصے فارسی زبان میں ، حصہ اول ، ص ۱۷۱

[3] لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی ، گل رعنا، ص ۱۱۲ ، حیدر آباد دکن ۱۳۲۳ھ

[4] حاکم ، مردم دیدہ ، ۱۸۳ - ۱۸۲

پئی جمع کردن اشعار نبود[1] ۱۱۷۲ھ میں وفات پائی۔ حاکم نے نمونہ کلام دیا ہے

؎ خدا نہ کرد اگر چہرہ پُر عتاب کند   بگردش نگہے عالمی خراب کند

؎ می رود دل بسر کوی تو پنہاں از من   بدگماں گشتہ ندانم بچہ عنواں از من[2]

میاں علی محمد تجرد

شیخ خیر اللہ فدا کے شاگرد تھے۔ ان کے اجداد ملتان سے تعلق رکھتے تھے۔ "خیلی عاشق سخن است[3]" انھوں نے اساتذہ کے منتخب ایک دو لاکھ اشعار ایک بیاض میں درج کر رکھے تھے۔ اپنی بیاض میں بھی ایک دو ہزار اشعار موجود تھے۔ ۱۱۷۹ھ میں وفات پائی[4]

عبد العزیز تحسین لاہوری

آفرین کے شاگرد تھے۔ صاحب تذکرہ صبح گلشن نے لکھا ہے۔ " زاد ہای طبع رسائش بالطافت و نازکی قرین و قابل صد گونہ تحسین و آفرین[5]"

ان کا ایک شعر ہے ؎ تحسین بہار آں گل خورشید رو ببیں

تا وا نہ شد نقاب رخ او سحر نہ شد

تصور خاں حیرت

ممتاز امراء میں سے تھے۔ دو تین ہزار اشعار پر مشتمل دیوان رکھتے تھے۔ " شعرش خالی

---

[1] مردم دیدہ ، ص ۱۵۱

[2] ایضاً ، ص ۱۵۱

[3] ایضاً ، ص ۱۵۷

[4] ایضاً ، ص ۱۵۸

[5] سید علی حسن خاں ، تذکرہ صبح گلشن ، ص ۸۲ ، بھوپال ۱۲۹۵ھ

ازتلاش نیست[1]"

حاجی محمد امین جنون

عبدالصمد خان سے وابستہ رہے۔ مشقِ سخن کرتے تھے[2]

تسکین

تسکین نے ۱۱۴۵ھ میں مرزا صاحباں کے مقبول پنجابی لوک قصے کو فارسی مثنوی میں نظم کیا۔ اور شمع محافل نام رکھا۔ تسکین نے بہت ہی نادر تشبیہات اور استعارات سے مضامین کو ادا کیا ہے اور گو اس کوشش میں بعض مقامات پر مثنوی کی روانی میں فرق آگیا ہے۔ اور مضمون گنجلک ہوگیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ مثنوی ایک نہایت کامیاب نظم ہے[3]

منشی جوت پرکاش

انھوں نے ۱۲۲۲ھ ــــ ۱۱۳۶ھ میں سسی پنوں کے مشہور قصے کو فارسی مثنوی میں نظم کیا۔ یہ مثنوی دستورِ عشق کے نام سے مشہور ہے۔ منشی صاحب کو نہ صرف عشقیہ جذبات کے اظہار میں قدرت کامل حاصل ہے۔ بلکہ منظریہ شاعری میں بھی انھوں نے اپنے اسی کمالِ فن کا ثبوت دیا ہے[4]

امام دین ریاضی لاہوری

جملہ علوم میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ ریاضی کے عظیم ماہر تھے اور اس میں متعدد تصانیف

---

[1] حاکم ، مردم دیدہ ، ص ۱۵۹

[2] ایضاً ، ص ۱۵۶

[3] محمد باقر ، پنجابی قصے فارسی زبان میں ، حصہ اول ، ص ۴۹ ، ۶۵

[4] ایضاً ، ص ۳ تا ۲۰

کیں۔ "بنا بر اشتغال علمی بہ فکر و سخن کم می پرداخت ولیکن سلیقہ بسیار درست داشت[1]" ۱۱۴۵ھ میں وفات پائی۔

گل محمد معنی یاب خاں شاعر

"شاعر صاحبِ تلاش، بسیار گوی، خوب گوی است، تلاش معنی تازہ بسیار دارد" ۱۱۵۷ھ میں وفات پائی[2] مرزا بیدل سے نسبت تلمذ رکھتے تھے۔

سرآمد

آفرین کے شاگرد تھے[3]

محمد ماہ صداقت کنجاہی

غنیمت کنجاہی کے بھتیجے تھے۔ "بسیار جدید الفکر و سریع الفہم بود[4]" ۱۱۴۶ھ میں رحلت پائی۔

محمد احسن خبرت لاہوری

آفرین کے شاگرد تھے[5]

محمد ارشد رسائی

ان کا ایک شعر بہت مشہور ہے ؎

با مخالف مشربان یکجا نشستن خوب نیست
این غلط مجموعہ را شیرازہ بستن خوب نیست

---

[1] بندرابن داس خوشگو ، سفینہ خوشگو ، ص ۱۹۱

[2] ایضاً ، ص ۲۴۵

[3] خواجہ عبدالرشید ، تذکرہ شعرائے پنجاب ، ص ۱۷۲

[4] بندرابن داس خوشگو ، سفینہ خوشگو ، ص ۱۵۹

[5] میر شیر علی قانع تتوی ، مقالات الشعراء ، ص ۱۳۸ ، حیدرآباد سندھ ۱۹۵۷ء

فاضل خاں منصف

ممتاز تورانی امیر تھے۔ عبدالصمد خاں ان سے بہت لگاؤ رکھتا تھا۔ حاکم لکھتا ہے کہ "در نجوم ورمل و علم ہندسہ و ہیئت بے نظیر بود۔ لیکن در شعر آں قدرہا نیست کہ مردم توران گمان دارند[1]"

خواجہ محمد یحییٰ خاں خرد

زکریا خاں کے قریبی عزیز بھی تھے ان سے اور یحییٰ خاں سے وابستہ رہے۔ "بہ شعر گفتن ذوق تمام دارد ــــــ شعر خوب میگوید۔ حاکم نے ان کا نمونہ کلام دیا ہے

زلخت ہای دل کوہ کن کہ ریختہ بود　　دمید لالہ بدامان کوہسار آخر[2]

خواجہ محمد اسماعیل خاں خلیل

عبدالصمد خاں کے چھوٹے بھائی عبدالمومن خاں کے صاحبزادے تھے۔ زکریا خاں کے داماد بھی تھے۔ حاکم سے اصلاح لیتے تھے۔ اس کی رائے ہے کہ "جوان سلیم و ذہنش وقاد است و طبع درست دارد[3]"

اندر جیت منشی

نکودر سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۱۴۸ھ میں عبدالصمد خاں کے ہمراہ ملتان چلے گئے اور اُن کے منشی مقرر ہو گئے۔ اسی سال انھوں نے نامۂ عشق کے نام سے مشہور لوک داستان سسی پنوں کو فارسی مثنوی میں نظم کیا۔ منشی کی مثنوی نہ صرف افسانوی حیثیت سے کامیاب ہے۔ بلکہ لسانی اور شاعرانہ نقطۂ

---

[1] مردم دیدہ ، ص ۹۲-۹۳

[2] مردم دیدہ ، ص ۱۶۱

[3] ایضاً ، ص ۱۶۲

نگاہ سے بھی اہم ہے[1]

دلشاد پسروری

جس شاعر نے اپنے زمانے کے سیاسی اور سماجی حالات کا سب سے گہرا اثر قبول کیا ہے۔ وہ دل محمد دلشاد پسروری ہیں۔ وہ ایسے دورِ انقلاب میں گزرے ہیں جو پنجاب کی تاریخ کا تاریک ترین ورق ہے۔ مغلیہ سلطنت اپنے تنزل کے آخری مراحل طے کر رہی تھی۔ نادر کے بعد احمد شاہ ابدالی نے اپنے حملے شروع کر دئیے تھے۔ سکھ غارت و رہزنی میں مصروف تھے قتل و خوں ریزی کا بازار گرم تھا۔ ان تمام واقعات کی جھلک ان کے کلام میں موجود ہے[2]

دلشاد کا ذکر تذکروں میں عام طور پر مذکور نہیں ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی پسرور اور سیالکوٹ میں ہی بسر کی۔ راجہ رنجیت دیو، نواب معین الملک اور آدینہ بیگ سے تعلقِ خاطر رکھتے تھے۔ دلشاد کی شاعری اپنے عہد کا آئینہ ہے۔ اس نے سیاسی اور سماجی حالات کو اس خوبی سے شعروں میں سمویا ہے کہ ہم اس کی مدد سے بآسانی اس عہد کی تاریخ مرتب کر سکتے ہیں۔ نادر شاہ کے دہلی میں قتلِ عام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

قتلِ عام است در جہاں آباد　　آخر ایں غمزۂ تو نادر نیست
آنچہ کردی تو با مسلماناں　　بخدا کار ہیچ کافر نیست

یحییٰ خاں کے ایک قصیدے میں جسپت رائے دیوان لاہور کے قتل کا ذکر اس طرح ہے

درجہاں گر ہم سرِ اسکندر و خاقاں شود　　از شجاعت، تا بعِ نواب یحییٰ خاں شود

---

[1] (۱) محمد باقر ، پنجابی قصے فارسی زبان میں ، جلد اول ، ص ۲۲، ۲۳، ۲۷

(۲) خواجہ عبدالرشید ، تذکرہ شعرائے پنجاب ، ص ۳۴۴

[2] حافظ محمود شیرانی ، پنجاب میں اردو ، ص ۳۰۷

انتقامِ قاتلاں رائے حیپت رائی را آیدؔ از تیغ تو، در پنجاب گر عریاں شود[1]

اس قسم کی مثالیں اس کے دیوان میں جابجا ملتی ہیں۔ دلشاد کے کلام پر سادگی غالب ہے۔ ساتھ ہی صنعت تجنیس و مراعات النظیر کی رعایت دیکھی جا سکتی ہے۔ وہ اکثر اپنی تشبیہات اور استعارے ملکی واقعات اور دیگر امور سے لیتا ہے۔ اس صنف میں سب سے منفرد ہے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ اس صنف خاص نے اس کے کلام کو ایک زیور دے دیا ہے[2]

؎ درزمیں پیوستہ تخم اشک می کاریم ما گر توئی نوابِ ما آخر زمینداریم ما
رشکِ چشم خود بدست خود ہمیں سازیم پاک صوبہ پنجاب زیرِ آستیں داریم ما
مدتی شد کہ اشک و افغاں نیست شاہ در دراں نمی آید

دلشاد پسروری زیرِ بحث عہد کے فارسی ادب کی آخری نمائندہ شخصیت ہیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے مغل دور کی عظیم الشان روایات ایک ایک کر کے دم توڑتی رہیں۔ دلشاد نے اس عہد کی سیاسی اور سماجی شکست و ریخت کو اپنے اشعار میں سمو دیا۔

وقت کا دھارا بڑی تیزی سے بہہ رہا تھا۔ مغلوں کی بساط لپٹی تو فارسی کے خیموں کی طنابیں بھی ڈھیلی پڑنا شروع ہو گئیں۔ تاہم فارسی کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ سکھوں کے عہدِ حکومت میں بھی سرکاری زبان فارسی ہی رہی۔ دوسری طرف اردو تیزی سے ارتقائی منازل طے کر رہی تھی۔ اس لئے پنجاب میں مغلوں کے زوال کے سو سال بعد فارسی کو ثانوی حیثیت حاصل ہو گئی۔ انگریزی اثر و نفوذ نے بیسویں صدی کے اوائل تک فارسی کی رہی سہی حیثیت ختم کر دی تھی۔ تاہم پنجاب کی روح میں جو فارسی رچ بس گئی تھی۔ اس نے بیسویں صدی میں بھی گرامی اور علامہ اقبال جیسے شاعروں کو جنم دیا جنھوں نے فارسی کے دورِ عروج کی یاد تازہ کر دی۔

---

[1] دیوان دلشاد پسروری، ص ۱۸۲-۱۸۳، مرتبہ غلام ربانی عزیز، لاہور ۱۹۷۰ء

[2] محمود شیرانی، پنجاب میں اردو، ص ۳۱۳

تاریخ نویسی

مغل دور میں دیگر علوم و فنون کے ساتھ ساتھ تاریخ نویسی کو خاص فروغ حاصل ہوا۔ اورنگ زیب کی سرد مہری کے باعث آخری زمانے میں اس کی حیثیت قدرے مجروح ہوئی۔ تاہم اس کا فائدہ یہ ہوا، کہ تاریخ نویسی سرکاری سرپرستی سے محروم ہونے کے باعث غیر جانبداری اور حقیقت پسندی کی طرف مائل ہو گئی۔ اٹھارویں صدی کے نصف اول میں پنجاب میں متعدد تاریخی کتب تصنیف ہوئیں۔ چند ایک کا ذکر حسب ذیل ہے۔

وقائع فرخ سیر و جنگ ہائے عبدالصمد بہ سکھاں

اس کے مصنف کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ تاہم اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ عارف بیگ خان نائب ناظم پنجاب کا ملازم تھا۔ کتاب کے مندرجات عنوان سے عیاں ہیں۔ برٹش میوزیم میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے[1]

نظم الملوک

اس مصنف عبدالصمد خان کا کوئی مقرب تھا۔ نام پردۂ اخفا میں ہے۔ پوری کتاب بھی کہیں محفوظ نہیں۔ محض اس کے اجزا برٹش میوزیم میں محفوظ ہیں[2]

تاریخ قلیچ خانی

۱۷۲۶ء میں تالیف ہوئی۔ یہ ایک عمومی عالمی تاریخ ہے۔ مصنف قلیچ خان بلخ کا رہنے والا تھا۔ ۱۶۹۵ء میں ہندوستان آ کر لاہور میں مقیم ہوا۔ بعد ازآں عبدالصمد خان سے تعلق پیدا ہو گیا۔

---

[1] چارلس ریو، کٹیلاگ آف دی پرشین مینوسکرپٹس، برٹش میوزیم، جلد دوم، ص ۸۰۶ ب، لندن ۱۸۷۹ء

[2] ایضاً، جلد سوم، ص ۱۰۵۶ ب، لندن ۱۸۸۳ء

چھ سال کے عرصے میں اس نے یہ کتاب مکمل کی معلوم ہوتا ہے۔ کہ مصنف میں بہت حد تک تاریخ نویسی کا شعور تھا۔ کیونکہ وہ ہر سال کے واقعات اور تازہ مواد جمع کرتا رہتا تھا۔ اور جونہی فرصت میسر آتی اس میں اضافہ کر دیتا۔ اس کی سب سے نمایاں خامی یہ ہے۔ کہ قدیم تاریخ کے سلسلے میں اس نے اپنے ماخذ بہت کم بتائے ہیں۔ حالانکہ اس نے خود وضاحت کی ہے۔ کہ اسے چند سال تک مختلف کتب تاریخ کے مطالعہ کا موقع ملا۔ اور اسے عمیق مطالعہ نے تاریخ نویسی پر ابھارا۔ اس کتاب کا ایک نسخہ نیشنل لائبریری پیرس اور دوسرا باڈلین لائبریری آکسفورڈ میں محفوظ ہے [۱]

عبرت نامہ

یہ کتاب ۱۷۲۳ء/۱۱۳۵ھ میں تصنیف ہوئی۔ اس میں اورنگ زیب کی وفات سے لے کر سید برادران کے زوال تک کے حالات و حوادث بیان کئے گئے ہیں۔ مصنف نے آغاز کتاب میں تحریر کیا ہے کہ

" گاہ و بیگاہ بی غرضانہ بہ مجلس آشنا و بیگانہ از ارباب تجمل و متول رسیدہ، نگاہی بکارہای مختار و متروک اہل دنیا کردہ، ہرچہ از محاسن پسند خاطر و آنچہ از نقائع مطروح نظر می بود عبرت گونہ حاصل کردہ خود را تجربہ کار معاملات می گرفت [۲]

اس کے مصنف کا نام سید محمد قاسم ہے۔ وہ لاہور کے ایک معتدد سید خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ سادات بارہہ سے وابستہ تھے۔ آگرہ میں یہ کتاب تصنیف کی۔ اس وقت سید حسین علی کے دیوان تھے۔ ان کے زوال کے بعد سید قاسم لاہور آ گئے۔ بعد ازاں وہ معین الملک کے زمانہ میں میر منشی مقرر ہوئے۔ حال ہی میں ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان نے عبرت نامہ کو زیور طبع سے آراستہ کیا ہے۔ ڈاکٹر ظہور الدین احمد نے ترتیب و تصحیح کی ہے۔

---

[۱] محمد اقبال مجددی، تاریخ مغلیہ کے فارسی ماخذ ۱۷۰۷ء تا ۱۸۰۶ء، ص ۹۸ - ۹۰، مقالہ ایم اے تاریخ ۱۹۶۷ء پنجاب یونیورسٹی لاہور

[۲] عبرت نامہ، ص ۳ الف (مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری)

عبرت نامہ کے علاوہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں قاسم کی ایک بیاض بھی محفوظ ہے جس میں انھوں نے اس عہد کے ممتاز منشیوں کے خطوط، مناجات، وظائف، قدیم اور ہم عصر شعرا کے کلام کے علاوہ اپنے زمانے کے اکثر اہم واقعات کی تاریخیں قلم بند کی ہیں [۱]

اسرار صمدی

۱۱۴۱ھ میں لکھی گئی۔ اس کتاب کے مصنف کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ پروفیسر شجاع الدین نے احتمال ظاہر کیا ہے۔ کہ منشی جوت پرکاش اس کے مصنف ہو سکتے ہیں۔ مصنف کلانور کا رہنے والا تھا۔ عبدالصمد خاں کا منشی تھا۔ اس کتاب میں عبدالصمد خاں کی اہم مہمات مثلاً بندہ بیراگی، عیسیٰ خاں منج حسین خاں شرف الدین کاشمیری اور راجگانِ جموں وغیرہ کا تفصیلی ذکر ہے۔ اسرار صمدی نہ صرف تاریخی اعتبار سے بلکہ ادبی لحاظ سے بھی نہایت اہم اور معیاری کتاب ہے [۲]

بدائع وقائع

آنند رام مخلص کی یہ تصنیف اس عہد کی تاریخی کتب میں ممتاز ترین حیثیت کی حامل ہے۔ مصنف نے مختصر سے دیباچہ میں حمد کے بعد لکھا ہے کہ میں ایام بہار میں ایک دن گوشہ تنہائی میں بیٹھا تھا۔ کہ مجھ کو خیال آیا۔ کہ اساتذہ سلف جنھوں نے علم تاریخ کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے دوسرے لوگوں کے سوانح تو لکھے مگر اپنے احوال کو قلم بند نہ کیا۔ اگر " فقیر بعض حالات خود را بقلم آرم خالی از لطفی نخواہد بود۔ بلکہ بہ تفریح خاطر عاطر ارباب وجد و حال کہ سرخوشان نشأ کمال اند خواہد افزود" [۳] اس کتاب میں ۱۱۲۵ھ سے

---

[۱] محمد اقبال مجددی، ص ۹۹ تا ۱۰۷

[۲] شجاع الدین، مقدمہ اسرار صمدی، ص الف تا غ

[۳] بدائع وقائع، ص ۱ ورق الف ب (مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری)

کر ۱۱۶۱ھ تک کے حالات بیان کئے گئے ہیں ۔

ظفرنامہ

غلام محی الدین خاں کی تالیف ہے ۔ اس میں احمد شاہ ابدالی کے دوسرے حملے کی مکمل روداد بیان کی گئی ہے ۔ مصنف معین الملک کے مقربین میں سے تھا ۔ اور اسی کی فرمائش پر اس نے یہ حالات قلم بند کئے ۔ مصنف ان واقعات کا چشم دید گواہ ہے ۔ انداز تحریر ادیبانہ ہے ، زبان پر تکلف اور شعری ذوق غالب ہے ۔ ایک ہی نسخہ دستیاب ہے ۔ جو پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے ۔ بائیس اوراق پر مشتمل ہے[۱] ۔

پنجابی ادب

اٹھارویں صدی پنجابی ادب کی تاریخ میں بے حد اہمیت کی حامل ہے ۔ یہ عہد پنجابی ادب کے انتہائی عروج کا زمانہ ہے ۔ سولہویں اور سترھویں صدی میں شاہ حسین (۱۵۳۹ء ۔ ۱۵۹۳ء) دمودر (۱۶۰۹ء ۔ ۱۵۵۶ء) پیلو (۱۶۰۵ء ۔ ۱۵۵۶ء) اور سلطان باہو (۱۶۹۱ء ۔ ۱۶۳۱ء) نے پنجابی شاعری کو نئے افق عطا کئے تھے ۔ یہ سلسلہ اٹھارویں صدی میں بھی جاری رہا اور بلھے شاہ (۱۷۸۵ء ۔ ۱۶۵۰ء) علی حیدر (۱۷۸۵ء ۔ ۱۶۹۰ء) مقبل (۱۷۴۸ء ۔ ۱۷۱۸ء) خواجہ فرد فقیر (۱۷۹۰ء ۔ ۱۷۲۰ء) اور وارث شاہ نے پنجابی شاعری کو وہ مقام عطا کیا کہ ہم بلاشبہ اس عہد کی شاعری کو پنجابی ادب کی تاریخ کا بہترین شعری سرمایہ قرار دے سکتے ہیں ۔ اگرچہ سیاسی اور سماجی اعتبار سے یہ زمانہ تاریخ پنجاب کا تاریک ترین دور ہے ۔ تاہم اس ابتری کے ماحول میں پنجابی شاعری نے وہ عروج حاصل کیا ۔ جو کسی دوسرے دور کو نصیب نہیں ہوا[۲] ۔

---

۱ ظفرنامہ ، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری

۲ احمد حسین قریشی ، پنجابی ادب کی مختصر تاریخ ۔ ص ۷۱ ، لاہور ۱۹۶۳ء

پنجابی میں نثر کا آغاز شاعری کے مقابلے میں بہت بعد میں ہوا ۔ اس لئے پنجابی ادب کا اصل سرمایہ شاعری ہے ۔ پنجابی ادب کا اپنا ایک مخصوص مزاج ہے ——— اسلام ، اسلامی روایات اسلامی فکر اور اسلامی ثقافت سے گہرے مسلسل اور علمی تعلق کے علاوہ پنجابی ادب میں معاشرہ کی جامع اور صحیح عکاسی کی جاتی رہی ہے ۔ اس ادب کے سانچے خالص دیسی ہیں ۔ اس کی روایات ، اسالیب بیان ، محاورے ، تشبیہیں ، استعارے ، مانوس اور معروف حقائق پر مبنی ہیں ۔ حالانکہ یہ وہی علاقہ ہے ۔ جس میں فارسی زبان وادب کی سب سے پہلے پرورش ہوئی لیکن پنجابی شاعر اور ادیب فارسی کی ان ادبی خصوصیات کو نہیں اپناتا جن کا رشتہ وہ اپنے ماحول سے مربوط نہیں کر سکتا ۔ مثال کے طور پر وہ عمومی حیثیت سے فارسی گوؤں کے تتبع میں پنجاب میں کمیاب اور نایاب ، بلبل وسمن کی بات نہیں کرتا ۔ اور ضرورت کے وقت کاگ ، چکور اور چنبے کو کام میں لاتا ہے ۔ یہ فارسی کی منظوم اوضاع واصناف سے بھی زیادہ متاثر نہیں ہوتا اور اپنے انداز میں ہی حمد ، نعت ، معراج نامے ، نور نامے یا نشتر نامے چوہر یڑی نامے ، چرخ نامے ، جوگی نامے ، جنگ نامے ، واریں ، سی حرفیاں ، بیت ، چومصرعے ، ڈیوڑھ کافیاں ، بارں ماسے ، دوھڑے ، ماہیۓ ، اٹھوارے ، بانیاں ، شلوک ، تھال ، سرکھنڈیاں ، کوڑے ، کنڈلیاں ، فقرنامے اور سلام لکھتا ہے ۔ ان میں سے اکثر اصناف واوضاع سخن کی مثالیں کسی اور مقامی ادب میں نظر نہیں آتیں ۔ کلاسیکی پنجابی شاعر کا فلسفہ فکر ، طرز اظہار و بیان ، موضوعات الغرض شاعری کا تانا بانا سب ہی اس معاشرے اور ماحول سے یک جان ہے جس کی عکاسی وہ کرتا ہے[۱] ۔

اس عہد کے ممتاز پنجابی شعراء کا مختصر تذکرہ حسب ذیل ہے

بلھے شاہ (۱۶۸۰ء ۔ ۱۷۵۸ء)[۲]

پنجابی کے سب سے بڑے صوفی شاعر ، حصولِ تعلیم کے بعد قادری سلسلے کے بزرگ عنایت شاہ

---

۱ ڈاکٹر محمد باقر ، مقالہ در تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند ، جلد ۱۴ اول ، ص ۲۰۹ ، لاہور ۱۹۷۱ء

۲ مولوی محمد شفیع کے خیال میں وہ ۱۱۸۱ھ / ۱۷۶۶ء تک زندہ رہے تفصیل کے لئے دیکھئے ضمیمہ اورینٹل کالج میگزین مئی ۱۹۳۹ء ، ص ۶

نجابت کوی

اٹھارویں صدی کے اوائل میں گزرے ہیں۔ نادر شاہ دی وار ان کی اہم تخلیق ہے۔ وہ پنجابی کے رزمیہ ادب میں اہم اضافہ اور بے حد تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ اس عہد کی سیاسی اور سماجی تصاویر جا بجا اس نظم میں بکھری ہوئی ہیں ؎

صدی نبی کی دی بارہویں، وڈے نکر مٹے خانداناں ظلم زمین تے درتیا ، کوڑ نکر بہانا ناں!
مصاحب تے چور کچریاں ، لایہن وچ دلواناں سفلے کرن مجالساں ، عدل انصاف گیا سلطاناں
مرداں تھیں گیا ضابطہ ، غالب پیا زناناں امیراں ندراں بھنڈیاں، کرلیونین جمع خزاناں
پڑھ نوکر کو ہندے بادشاہ، الٹ پیا زمانہ[1]

نادر شاہ دی وار کی لسانی خوبیوں کے بارے میں ڈاکٹر فقیر محمد فقیر کا کہنا ہے کہ

"ساری نظم ہر قسم دے فنی عیب توں پاک صاف اے۔ وار دا مصنف زبان دا بڑا سوہناں تے سچا طالب علم نظر آوندا اے۔ کسے خاص لفظ نوں اپنے ٹکانے تے جڑن دی ٹھیک جاچ والا، جدھا ہر لفظ اپنے تھاں تے اک نگینے دی جڑت وانگوں جڑیا ہویا دسدا اے"[2]

شاہجہاں مقبل (۱۷۰۰ء ۔ ۱۷۴۸ء)

مقبل نے ہیر رانجھا کے مقبول قصے کو نظم کیا۔ مقبل کے ہاں شادی بیاہ اور دیہاتی زندگی کے دوسرے طور طریقوں، رسم و رواج، اخلاقی اور سماجی قدروں کی عمدہ عکاسی ملتی ہے۔ زبان سادہ ہے۔ لمبی چوڑی تشبیہوں اور استعارات سے کام نہیں لیا گیا اور الفاظ ٹھیٹھ استعمال ہوئے ہیں۔ عبارت کے برمحل استعمال سے قصے کے واقعات اور کرداروں کے احساسات کی وضاحت ہوتی چلی جاتی ہے۔

---

[1] نادر شاہ دی وار ، ص ۵۹

[2] دیباچہ ، نادر شاہ دی وار ، ص ۹

قادری کی بیعت کر کے آزادانہ روش اختیار کر لی۔ ان کے کلام میں صوفیانہ شاعری کے مختلف انداز ملتے ہیں۔ اس میں شدت احساس بھی ہے اور فکری عنصر بھی۔ حق گوئی، بیباکی اور راست کرداری کا دامن وہ کہیں نہیں چھوڑتے۔ عالمانہ اصطلاحات کی بجائے ان کے ہاں مخصوص پنجابی تشبیہات و استعارات کا استعمال نظر آتا ہے۔ اخلاقی رنگ ہر جگہ غالب ہے اور کلام میں جوش و تاثیر پائی جاتی ہے۔ ان کے کلام میں اس عہد کی سیاسی زندگی کی جھلک بھی ملتی ہے۔ مثلاً ؎

در کھلا حشر عذاب دا
بُرا حال ہویا پنجاب دا

مغلوں کے متعلق لکھتے ہیں ؎

مغلاں زہر پیالے پیتے
بھوریاں والے راج کیتے
سب اشراف پھرن چپ چپیتے[1]

علی حیدر (۱۶۹۰ء ۔ ۱۷۸۵ء)

ان کی سہ حرفیاں مشہور ہیں۔ اسلوب بیان مرصع ہے۔ کلام میں موسیقیت پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری میں حقیقت اور مجاز کا بڑا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ ملتانی الفاظ کی کثرت ہے۔ عربی اور فارسی الفاظ و محاورات خوش اسلوبی سے استعمال کرتے ہیں۔ اس عہد کی حالات سے گہرے متاثر نظر آتے ہیں۔ جا بجا اس کی جھلک ملتی ہے ؎

ایہ ایرانی نادر ظالم ظلم کنوں مول نہ سنگدے نی میڈے دل دی دلی لٹی وے حیدر ہو رکیہ ساتھوں منگدے نی[2]

---

[1] (۱) اردو دائرہ معارف اسلامیہ، مقالہ، پنجابی، جلد ۵ ، ص ۶۷۴

(۲) تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند ، جلد ۱۳ ، حصہ اول ، ص ۳۰۲ - ۳۰۳

[2] (۱) ایضاً ، ص ۳۱۰

(۲) بنارسی داس جین ، پنجابی زبان تے اوہدا لٹریچر ، ص ۷۷

زمانی اعتبار سے اسے ہیر وارث شاہ پر تفوق حاصل ہے۔ مقبل آنکھوں سے نابینا تھے۔ ہیر کے علاوہ انھوں نے سی حرفیاں اور جنگ نامہ بھی لکھا ہے[1]

خواجہ فرد فقیر (۱۷۲۰ء۔۱۷۹۰ء)

گجرات کے رہنے والے تھے۔ ان کی نظم کسب نامہ بافندگان خاص طور پر قابل ذکر تھے۔ اس میں ایک بافندے کی صورت میں مسائل تصوف بیان کئے گئے ہیں۔ اور ضمناً اپنے دور کی سیاست اور معاشرت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ فرد فقیر کی سی حرفیوں اور بارہ ماہوں کا رنگ بھی جداگانہ ہے۔

وارث شاہ

پنجابی زبان کے عظیم ترین شاعر تسلیم کئے گئے ہیں۔ ڈاکٹر باقر لکھتے ہیں

"وہ ایک براق طبیعت صاحب فن ہے جس کی جوان شاعری ضبط سے ناآشنا اور جس کا ذوق تکلم خاموشی سے بے خبر ہے جس کا سیلاب بیان بلند و پست، دونوں پر بے محابا رواں ہے اور جس کا توسن طبع سہل و حزن دونوں پر عنان ریز چلتا ہے[2]"

ہیر ۱۷۶۶ء میں لکھی گئی۔ یہ قصہ شاعر کے عہد کے معاشرتی اور سیاسی حالات کا آئینہ دار ہے۔ کیونکہ اس نے اپنے مشاہدات و تاثرات کو کہانی کے پس منظر کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اوراق گذشتہ میں ہم نے متعدد مقامات پر اس کا حوالہ دیا ہے۔ "وارث شاہ کی سی قادر الکلامی پنجابی زبان کے کسی شاعر میں نظر نہیں آتی۔ ان کے پاس الفاظ کا بے پایاں ذخیرہ ہے جسے وہ انتہائی خوش اسلوبی اور چابکدستی سے استعمال کرتے ہیں۔ بیان میں واقعیت، سوز و گداز اور جذبات کا خلوص جھلکتا ہے۔ یہ نظم مرصع نگاری

---

[1] تاریخ ادبیات، جلد ۱۳، حصہ اول، ص ۳۴۱

[2] پنجابی قصے فارسی زبان میں، جلد اول، ص ۱۸۶

کا بہترین نمونہ ہے[1]"

ان صاحب طرز شعراء کے علاوہ پنجابی ادب کی تاریخوں میں بے شمار شاعروں کا ذکر ملتا ہے۔ بٹالہ کے مشہور صاحب طریقت خاندان نے پنجابی ادب میں نمایاں کام کیا۔ شیخ محمد فاضل الدین بٹالوی ان کے فرزند اور جانشین علامہ غلام قادر شاہ بٹالوی اور مرید شیخ نصیر الحق پنجابی کے علاوہ عربی اور فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ ان کی اردو شاعری نے پنجاب میں ایک نئے دبستان کی بنیاد رکھی۔ اس کا ذکر اردو ادب کے ضمن میں آئے گا۔

شاہ شرف بٹالوی، شیخ فاضل کے مرید باصفا تھے۔ ان کا انتقال ۱۷۲۵ء میں ہوا۔ ان کی کافیاں ملتی ہیں جن سے بے پناہ صوفیانہ رنگ جھلکتا ہے[2] میاں اشرف لاہوری (م۔۱۱۳۷ھ) بھی ممتاز شاعر اور خدارسیدہ بزرگ تھے۔ عموماً بارہ ماہے اور ہولی گیت لکھتے تھے۔

ساراتن جے ہووے دیدے میں فیر بھی دیندی نہ رجھاں
ویکھن والا سب تھاں دیکھے میں عیب کیہدے توں کجیاں
جت دل ویکھاں مینوں جانی دسے میں کدھر کدھر بھجاں
اشرف ایک دیدار ماہی توں میں واراں لکھ سو حجاں[3]

مولوی رکن الدین نے ۱۱۳۶ھ میں جنگ نامہ لکھا[4] صدیق لالی نے ۱۱۴۸ھ میں قصہ یوسف زلیخا لکھا۔ پنجابی زبان میں یہ اپنی قسم کا پہلا قصہ ہے۔ اس کی زبان سادہ، ٹھیٹ اور دلچسپ ہے[5]

---

[1] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، جلد ۵، ص ۶۷۴

[2] عبدالغفور قریشی، ص ۱۱۱

[3] ایضاً، ص ۱۱۹ [4] ایضاً، ص ۲۱۱

[5] (۱) ایضاً، ص ۲۳۸ (۲) احمد حسین قریشی، ص ۸۸ (۳) امتیاز احمد سعید، مقالہ قرآن پاک کی پنجابی تفاسیر و تراجم، المعارف، لاہور نومبر ۱۹۷۴ء

ان کے علاوہ جان محمد، حافظ محمد اکرم، حاجی نور محمد، علاول خاں، مولوی محمد عابد وزیرآبادی، محمد فقیر غلام، حافظ محمد رمضان، واصل گجراتی، سید محمد مخدومانی، محمد یار اور فیض اللہ وغیرہ اصحاب کا تذکرہ ملتا ہے۔[1]

(ج) اردو ادب

اٹھارویں صدی کے اوائل سے پنجاب میں اردو کی تحریک میں ایک اہم موڑ آیا۔ اس سلسلے میں بٹالہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ پروفیسر محمود شیرانی نے اسے بٹالہ تحریک کے نام سے موسوم کیا ہے۔[2] اس زمانے میں بے شمار شعرا ملتے ہیں۔ نثر کا رجحان نہ ہونے کے برابر ہے۔ اٹھارویں صدی کے نصف اول کے پنجاب کا شعری ادب اس تحریک سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔ جو دہلی میں فروغ پا رہی تھی۔ اردو کی یہ دونوں تحریکیں دو مختلف مرکزوں میں ایک ہی وقت میں مصروف کار رہیں۔ لیکن دونوں ایک دوسری سے بے خبر رہیں۔ ان دونوں تحریکوں پر اپنے اپنے سماجی، معاشرتی اور سیاسی پس منظر کی گہری چھاپ ہے۔ ولی ۱۱۳۵ھ میں دہلی میں وارد ہوئے[3] اور اس عہد سے دہلی میں غزل گوئی عام رواج پاگئی۔ اردو میں غزل گوئی کی بنیاد اگرچہ ولی کے عہد میں بہت قدیم ہے۔ تاہم اولیت کا تاج ولی کے سر پہ ہی ہے۔ ہندوستان میں ولی کے طفیل اس قسم کی شاعری جو فطرتاً مسلمانوں کی طبیعت اور رجحان کے زیادہ مناسب تھی رواج میں آئی اور یہی وجہ ہے کہ یہ تحریک بڑی سرعت کے ساتھ اس عہد کے تعلیم یافتہ طبقہ کے قلوب میں گھر کر گئی۔ کیونکہ اس شاعری کا دارومدار زیادہ تر فارسی جذبات پر تھا اور فارسی خواں گھر گھر موجود تھے۔ درحقیقت اردو شاعری فارسی کا پرتو ہے۔ دوسری طرف پنجاب کی نظموں کے نمونے کئی امور میں مختلف ہیں۔ اول تو ان کی بحریں زیادہ تر مقامی ہیں، دوسرے اگرچہ ان میں ردیف کی پابندی کی جاتی

---

[1] احمد حسین قریشی ، ص ۷۲ - ۷۴

[2] محمود شیرانی ، پنجاب میں اردو ، ص ۲۴

[3] پروفیسر شیرانی نے یہ بات آزاد کے حوالے سے لکھی ہے، اردو دائرہ معارف کے مطابق ولی ۱۱۱۲ھ میں دہلی میں وارد ہوئے۔ جلد دوم مقالہ اردو ، ص ۳۴۴

ہے لیکن قافیہ کا نانا لزوم مالایلزم مان لیا گیا ہے۔ پھر وہ جذبات میں فارسی سے مختلف ہیں۔ فارسی سے مختلف ہیں۔ فارسی صنائع بدائع اور تشبیہات سے بالکل عاری ہیں اور اس شاعری کا مدار ابہام پر نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم ولی اور ان کے پیروؤں میں دیکھتے ہیں۔

پنجاب کا ادب اس عہد کی سیاسی فضا سے خاصا متاثر ہے۔ حافظ محمود شیرانی لکھتے ہیں۔

> "پنجاب میں حضرت شیخ عبدالقادر کے نام پر ہزاروں مناجاتیں لکھی گئی ہیں۔ بارہویں صدی میں پنجاب کی ابتری نے ان کو اور بھی فروغ دیا ہے۔ اس عہد میں اس سرزمین پر آفتوں پر آفتیں ٹوٹیں، بلاؤں پر بلائیں نازل ہوئیں، سکھوں کی تاخت و تاراج، نادر شاہ کی آمد اور احمد شاہ ابدالی کے حملے ایسے واقعات ہیں جنھوں نے یہاں کے باشندوں کے قلوب کو یاس اور ناامیدی کے جذبات سے معمور کر دیا۔ قاعدہ ہے کہ مصیبت میں خدا یاد آتا ہے لیکن خانقاہی اثرات میں پنجاب نے صرف حضرت غوث الاعظم کو یاد رکھا اور انہی کا کلمہ پڑھا۔[1]"

اگرچہ یہ خانقاہی اردو کے نمونے آج ہمارے کانوں کو نہایت عجیب معلوم ہوتے ہیں لیکن ہمیں تاریخی دلچسپی کی رو سے ان پر نگاہ ڈالنی چاہیئے۔ یہ تبرکات ایسے عہد کی یادگار ہیں۔ جب کہ ابھی دہلی میں بھی سناٹا تھا اور میر و سودا کی غزل خوانی شروع ہونے میں ایک عرصہ درکار تھا۔ بدقسمتی سے اس عہد کے شعرا کا کلام اور حالات زندگی دستبرد زمانہ سے محفوظ نہ رہے۔ یہ زمانہ پنجاب میں سیاسی اور معاشرتی افراتفری اور انتشار کا زمانہ تھا۔ لوگوں کے لیے جانیں بچانا دشوار تھا۔ علمی اور ادبی سرمائے کو کون سنبھالتا تاہم جو کچھ بچ سکا۔ اسے علامہ محمود شیرانی نے اپنی وقیع تحقیقی تالیف "پنجاب میں اردو" میں محنت سے سمو دیا ہے۔ ذیل میں اس عہد کے ممتاز اردو شعرا کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

شیخ محمد فاضل الدین

اس تحریک کے روح رواں تھے۔ آپ کا تعلق بٹالہ کے مردم خیز شہر کے ممتاز مشائخ خاندان

---

[1] پروفیسر محمود شیرانی ، پنجاب میں اردو ، ص ۲۷۳ ، لاہور ۱۹۷۲ء (طبع چہارم)

سے تھا۔ آپ کا انتقال ۱۱۵۱ھ میں بہتر سال کی عمر میں ہوا۔ حضرت محمد فاضل اردو میں بھی شعر کہتے تھے، ان کا اور سید ولی اورنگ آبادی کا زمانہ تقریباً ایک ہے[1]۔

شیخ صاحب اپنے عہد کے مقتدر شیوخ میں سے تھے۔ اور بہت حد تک پنجاب میں سلسلہ قادریہ کی ترویج و اشاعت کے ذمہ دار ہیں۔ شیخ فاضل الدین، شیخ محمد افضل لاہوری کے مرید تھے۔

پروفیسر قاضی فضل حق کا خیال ہے۔ کہ شیخ محمد افضل کی شخصیت نے ادبیات پنجاب پر بھی خاص اثر ڈالا ہے۔ وہ خود شاعر تھے اور شیخ فاضل الدین اور ان کے متبعین جو اس تحریک بٹالہ کے روح رواں ہیں، شاعری میں محض اپنے مرشد بزرگوار کی سنت کی کر رہے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ کہ اس تحریک کے بانی مبانی دراصل شیخ محمد افضل ہیں، نہ کہ ان کے مرید شیخ محمد فاضل الدین[2]۔

شیخ نور محمد

شیخ محمد فاضل کے پیر بھائی تھے اور شیخ محمد افضل کے مرید تھے۔ ان کے اردو کلام کے نمونے ملتے ہیں۔ ایک مناجات کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

بہرِ خدا تو اے صبا بغداد جا فریاد کر   دربار شاہ میراں کے کہ نتی مجھ سر بسر
حق نے تجھے سرور کیا ولیاں میں تم سرتاج ہو   ہویا نا کوئی ہووے تیرے جیہا تا دن حشر[3]

غلام قادر شاہ

شیخ محمد فاضل کے فرزند اور جانشین تھے۔ علم و عمل، زہد و تقویٰ، ریاضت و مجاہدات اور

---

[1] پنجاب میں اردو ، ص ۲۷۶ - ۲۷۷

[2] ایضاً ، ص ۲۷۴ - ۲۷۵

[3] ایضاً ، ص ۲۷۹

حال و قال میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ تصوف میں ان کے قلم سے متعدد تصنیفات نکلی ہیں۔ ۱۱۷۶ھ میں رحلت پائی۔ ان کی اردو مثنوی "رمز العاشقین" ان کے والد بزرگوار کی زندگی ہی میں تصنیف ہو چکی تھی۔ کیونکہ اس میں انھوں نے اپنے والد کو خطاب کر کے بعض شعر لکھے ہیں۔ یہ مثنوی میر اثر کی خواب و خیال سے جو ۱۱۵۹ھ میں لکھی گئی اقدم ہے۔ ان کی مثنوی کا وزن عروضی خالص ہندی ہے۔ پنجابی لہجہ کی تمام خصوصیات اس میں موجود ہیں۔ رمز العاشقین میں عربی الفاظ کا استعمال کثرت سے ہے۔ ایک وجہ اس کی یہ ہے کہ تصوف کی تمام اصطلاحیں عربی ہیں اور دوسرے مصنف موصوف خود عربی کے فاضل تھے[1]۔

شیخ نصیر الحق

شیخ فاضل الدین کے مرید تھے۔ فارسی، ہندی، پنجابی اور اردو کے شاعر تھے، اردو میں انھوں نے خصوصاً بے شمار نظمیں لکھی ہیں[2]۔ بٹالہ اسکول کے دیگر اردو شاعروں میں محمد جان غلام نادر کے مرید اور بہتوئی تھے۔ فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے[3]۔

امامی میاں امام بخش نام سید فاضل شاہ کے مرید تھے[4]۔ ناظمی، حیات، میاں احمد اور موسیٰ کا کلام بھی ملتا ہے[5]۔ فارسی کے ممتاز ادیب اور شاعر آنند رام مخلص اردو میں بھی شعر کہتے تھے[6]۔ اسی

---

[1] پنجاب میں اردو ، ص ۲۷۴ ، ۲۷۵

[2] ایضاً ، ص ۲۷۹

[3] پنجاب میں اردو ، ص ۲۸۵

[4] ایضاً ضمیمہ ، ص ۳۷۳

[5] ایضاً ، ص ۲۸۵ - ۳۷۳ ضمیمہ

[6] عبدالغنی ، لائف اینڈ ورکس آف عبدالقادر بیدل ، ص ۱۷۹ ، لاہور ۱۹۶۰ء

صدی کے تیسرے ربع میں دہلی کی تحریک پنجاب میں پہنچ گئی اور سب سے پہلے جذبات اور زبان پر اثر انداز ہوئی۔ پرانے الفاظ اکثر متروک کر دیئے گئے۔ رفتہ رفتہ مذاق میں تکلف آنے لگا۔ قدیم سادگی پر طرفہ ہونے لگی اور تصنع کا رجحان ہو گیا۔ فارسی بحریں اختیار کی جانے لگیں۔ اور ردیف قافیہ کا التزام ضروری مان لیا گیا[۱]۔ حتیٰ کہ ربع آخر میں زبان کافی حد تک صاف ہو جاتی ہے اور اس عہد میں بے شمار ایسے شعراء ملتے ہیں۔ کہ ان کے کلام میں اور ہندوستانیوں کے کلام میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے[۲]۔

اس عہد کے صاحب طرز فارسی شاعر دلشاد پسروری نے اردو میں بھی بہت کچھ لکھا تھا۔ حافظ محمود شیرانی نے ان کی دو غزلیں درج کی ہیں۔ فکری اور لسانی دونوں اعتبار سے دلشاد کا اردو کلام پنجاب میں ایک نئے دبستان کی بنیاد ڈالتا دکھائی دیتا ہے۔ زبان کافی حد تک صاف ہے اور خیالات دہلی کی تحریک سے پوری طرح متاثر ہیں۔ منتخب اشعار ملاحظہ ہوں ؎

دلبر ہے نوجواں نہ جانوں کرے گا کیا ؟ | بانکی ہے اس کی آن نہ جانوں کرے گا کیا ؟
اس لعل لب سے آگے کئی دل ہوئے تھے خون | اب لھا کے آیا پان نہ جانوں کرے گا کیا ؟
شیشہ شراب کا نہ لگے ہاتھ مست کے | یہ دل مرا نداں نہ جانوں کرے گا کیا ؟

گزرے ہیں کئی دن وہ بر، ذاد نہ آیا | شاید کہ مرا وعدہ اسے یاد نہ آیا
نے خط نہ کتابت نہ خبر کچھ نہ سندیسہ | پیغام ہمارا گیا برباد نہ آیا
اس دام میں افسوس پھڑکتے ہیں کئی جاں | جب ہم کو پھنسا کر گیا صیاد نہ آیا[۳]

(د) صوفیائے کرام

خوش قسمتی سے سیاسی انتشار کے اس دور عروج میں صوفیائے کرام کی ایک کثیر تعداد جلوہ ریز ہوئی

---

[۱] پنجاب میں اردو ، ص ۲۹۴

[۲] ایضاً ، ص ۲۹۴

[۳] پنجاب میں اردو ، ص ۳۱۶ - ۳۱۷

ان کے فیوض و برکات سے پنجاب کے گوشے گوشے میں لوگوں کی ذہنی اور فکری اصلاح کا اہتمام رہا۔ قادری سلسلہ کی روحانی برکات اس عہد میں بہت نمایاں رہیں۔ چند ایک صوفیائے کرام کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے۔

سید عبدالوہاب (م۔ ۱۱۳۱ھ)

علم و فضل، عبادت و ریاضت، زہد و تقویٰ اور درس و تدریس میں بلند مقام رکھتے تھے۔ خلق کثیر آپ سے فیض یاب ہوئی۔ لاہور ہی میں ہدایت خلق میں مصروف رہے[۱]۔

شیخ محمد تقی قادری

مزار نوشہرہ ضلع گجرات میں ہے[۲]۔

سید احمد (م۔ ۱۱۳۶ھ)

وزیر آباد کے علاقے میں مصروف ہدایت رہے۔ ایک گاؤں کوٹلہ بھی آباد کیا تھا۔ مزار موضع خانپور میں ہے جو کوٹلہ کے قریب ہے۔ آپ کی شہادت سکھوں کی غارت گری کے دوران ہوئی[۳]۔

سید بدرالدین گیلانی قادری (م۔ ۱۱۳۶ھ)

فاضل متبحر اور عارف کامل تھے۔ درس و تدریس اور اعلائے کلمۃ الحق میں شہرۂ آفاق تھے۔ مزار لاہور میں ہے[۴]۔

---

[۱] مفتی غلام سرور لاہوری، خزینۃ الاصفیا، جلد اول، اردو ترجمہ مفتی محمود عالم ہاشمی، اقبال احمد فاروقی، لاہور ۱۳۹۲ھ

[۲] ایضاً ، ص ۲۹۰

[۳] مفتی غلام سرور لاہوری ، ص ۲۹۲

[۴] ایضاً ، ص ۲۹۲

شاہ شرف لاہوری (م ۱۱۳۶ھ)

بٹالہ کے رہنے والے تھے۔ ساری عمر لاہور میں درس و تدریس اور ہدایت خلق میں گزاری[1]۔

شیخ احمد بیگ (م ۱۱۴۰ھ)

سیالکوٹ میں رحلت پائی، وہیں مزار ہے[2]۔

شاہ عنایت قادری (م ۱۱۴۱ھ)

قصور میں آپ کا حلقۂ درس خاصا وسیع تھا۔ آپ قرآن و تفسیر، حدیث و فقہ کا درس دیا کرتے تھے۔ ایک خلق کثیر نے آپ سے استفادہ کیا۔ مرجع خلائق ہونے کے باعث حسین خان افغان حاکم قصور کو آپ کی شہرت و مقبولیت ایک آنکھ نہ بھائی۔ چنانچہ آپ کو قصور سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ آپ لاہور آگئے۔ یہاں سلسلۂ درس و تدریس کا آغاز کر دیا۔ یہیں آپ کا انتقال ہوا اور مزار بھی یہیں ہے۔ حضرت بلھے شاہ آپ ہی کے مرید تھے[3]۔

سید حاجی عبداللہ گیلانی (م ۱۱۴۱ھ)

زکریا خاں ناظم اور اس کے امراء آپ کے عقیدت مندوں میں شامل تھے۔ مزار لاہور میں ہے[4]۔

---

[1] مفتی غلام سرور لاہوری، ص ۲۹۳

[2] ایضاً، ص ۲۹۵

[3] (۱) مفتی غلام سرور لاہوری۔ خزینۃ الاصفیاء، جلد اول، ص ۲۹۷۔

(۲) اعجاز الحق قدوسی، تذکرہ صوفیائے پنجاب، ص ۴۰۷، کراچی ۱۹۶۲ء

[4] مفتی غلام سرور لاہوری، خزینۃ الاصفیاء، جلد اول، ص ۲۹۸۔

شیخ جمال اللہ قادری (م ۱۱۴۲ھ)

آپ کا مزار موضع ساہن پال میں ہے[1]

شاہ محمد غوث (م ۱۱۵۲ھ)

علوم ظاہری و باطنی کے جامع اور صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے[2]۔

قاضی رکن الدین (م ۱۱۵۲ھ)

علم و فضل اور زہد و تقویٰ میں شہرۂ آفاق تھے۔ وزیر آباد کے قاضی بھی رہے تھے[3]۔

شیخ عبدالرحمان (م ۱۱۵۳ھ)

مزار ضلع گوجرانوالہ کے موضع بھڑی شاہ میں ہے[4]۔

سید عبدالقادر (م ۱۱۵۴ھ)

مزار لاہور میں ہے[5]۔

شاہ فرید قادری (م ۱۱۵۶ھ)

لاہور کے پاس کوٹلہ شاہ فرید آباد ہے۔ تمام عمر درس و تدریس میں گزاری[6]۔

---

[1] مفتی غلام سرور لاہور، خزینۃ الاصفیاء، جلد اول، ص ۲۹۸

[2] (۱) خزینۃ الاصفیاء، ص ۳۰۰

(۲) غلام دستگیر نامی، تاریخ جلیلہ، ص ۱۷۰، لاہور

(۳) اعجاز الحق قدوسی، تذکرہ صوفیائے پنجاب، ص ۵۴۴

(۴) محمد وارث کامل، تذکرہ اولیائے لاہور، ص ۲۲۱، کراچی ۱۹۶۳ء

[3] خزینۃ الاصفیاء، ص ۳۰۳

[4] ایضاً، ص ۳۰۳

[5] ایضاً، ص ۳۰۴ [6] ایضاً، ص ۳۰۷

شیخ محمد سلطان (م ۱۱۵۸ھ)

مزار لاہور میں ہے، شاہنواز خان نے اسے تعمیر کرایا تھا[۱]

سید شاہ حسین (م ۱۱۶۲ھ)

بے پناہ روحانی اور علمی فضل و کمال رکھتے تھے[۲]

شیخ رحمت اللہ قادری

مزار ساہن پال میں ہے[۳]

شیخ نصرت اللہ (م ۱۱۷۰ھ)

شیخ رحمت اللہ کے بھائی تھے۔ مزار ساہن پال میں ہے[۴]

سید بلھے شاہ قصوری (م ۱۱۷۱ھ)

عظیم عالم و فاضل، عابد و زاہد، عارف کامل اور شاعر بے بدل تھے۔ مزار قصور میں زیارت گاہِ خلق ہے[۵]

شیخ محمد عظیم (م ۱۱۸۱ھ)

بیگم کوٹ میں مقیم تھے۔ آپ کی برکت سے یہ موضع افغان لوٹ مار سے محفوظ رہا۔[۶]

شاہ سردار قادری (م ۱۱۸۴ھ)

سلسلہ قادریہ کے نامور شیوخ میں سے تھے۔ علوم ظاہری و باطنی، فقہ، حدیث تفسیر میں یگانہ

---

۱ خزینۃ الاصفیاء، ص ۳۱۰

۲ ایضاً، ص ۳۱۰

۳ ایضاً، ص ۳۱۱

۴ ایضاً، ص ۳۱۲

۵ (۱) ایضاً، ص ۳۱۲ - (۲) اعجاز الحق قدوسی، تذکرہ صوفیائے پنجاب ص ۱۵۷ - ۱۶۰

۶ ایضاً، ص ۳۱۴

روزگار تھے۔ لاہور سے ۶ کوس کے فاصلے پر واقع موضع بابک وال میں سکونت رکھتے تھے یہیں تمام عمر درس و تدریس اور ہدایت خلق میں مصروف رہے۔ یہیں مزار ہے[۱]

سید فاضل الدین قادری

سید ابوالفرح محمد فاضل الدین پنجاب میں سلسلہ قادریہ فاضلیہ کے بانی گیلانی سادات میں سے ہیں انھوں نے گیارہویں صدی ہجری کے آغاز میں بٹالہ ضلع گورداس پور (بھارت) میں روحانیت کی شمع روشن کی، اور سلسلۂ قادریہ کی اشاعت کابل و بخارا کے علاوہ برصغیر پاک و ہند کے اطراف و اکناف تک کی جلیل القدر شیوخ اور اولیاء اللہ نے انہیں فواد العارفین اور افتخار اولیاء اللہ کے القاب سے پکارا۔ بٹالے میں انھوں نے علوم دینی کے لئے ایک وسیع مدرسہ قائم کیا اور متعدد کتابیں تصنیف کیں اور شاعری میں ان کی خدمات کا ذکر ہو چکا ہے۔ ۷ ذوالحجہ ۱۱۵۱ھ کو وفات پائی[۲]

چشتیہ سلسلہ نے بھی اس عہد میں خاصا فروغ پایا اور پنجاب میں مہار شریف، تونسہ شریف، سیال شریف جلالپور شریف اور گولڑہ کے علاوہ متعدد دیگر مقامات پر ارباب چشت کی خانقاہیں قائم ہو گئیں[۳] شاہ فخر الدین دہلوی کے مرید باصفا خواجہ نور محمد چشتی سے لاہور میں تعلیم کی بعد ازاں شاہ فخر الدین سے بیعت ہوئے اور پنجاب میں آ کر رشد و ہدایت میں مصروف ہو گئے۔

شاہ بہلول بیر کی ممتاز چشتی بزرگ تھے۔ جالندھر میں اقامت گزین رہے نہایت عالم فاضل اور صاحب تصنیف تھے۔ ۱۱۷۰ھ / ۱۷۵۶ء میں رحلت پائی۔ مزار جالندھر میں ہے[۴]

---

۱ (۱) خزینۃ الاصفیاء، ص ۳۱۵ (۲) اعجاز الحق قدوسی، تذکرۂ صوفیائے پنجاب، ص ۳۴۳

۲ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، مقالہ "فاضل الدین قادری" جلد ۱۵ ص ۸۸ لاہور ۱۹۷۵ء

۳ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، جلد پنجم، ص ۲۱، لاہور ۱۹۷۲ء

۴ محمد دین کلیم، تاریخ اولیائے چشت لاہور، ص ۹۸، لاہور ۱۹۶۸ء

شیخ محمد سعید چشتی صابری شرقپوری اس عہد میں منبع فیض رہے ۱۷۶۹ء میں رحلت پائی اور شرقپور میں مزار ہے[1] سہروردی سلسلۂ تصوف کے ممتاز اولیائے کرام میں سے مندرجہ ذیل بزرگ اس عہد میں گزرے۔

پیر کرم شاہ سہروردی

۱۷۸۶ء میں فوت ہوئے۔ زہد و عبادت کے دلدادہ تھے اور بہت سا وقت یادِ الٰہی میں گزارتے تھے۔ سکھ گردی سے تنگ آ کر لکھنؤ چلے گئے تھے[2]

میاں محمد صالح سہروردی

پچپن سال تک درس و تدریس میں مصروف رہے۔ ۱۱۴۰ھ / ۱۷۲۷ء میں رحلت پائی[3]

میاں محمود سہروردی

میاں محمد صالح کے صاحبزادے اور خلیفہ تھے۔ آپ کی رحلت ۱۱۸۲ھ / ۱۷۶۸ء میں ہوئی[4]

شیخ حامد قاری

قرأت قرآن میں بے مثل اور زہد و ورع میں لاثانی تھے۔ آپ نے ایک مدرسہ کھولا ہوا تھا جس کے اخراجات کے لئے سرکاری امداد مقرر تھی۔ قاری صاحب نے ۱۱۴۱ھ / ۱۷۲۸ء میں ایک مسجد بھی تعمیر کرائی تھی۔ لاہور میں آپ کا فتویٰ تسلیم کیا جاتا تھا۔ ۱۱۶۴ھ / ۱۷۵۰ء میں وفات پائی[5]

حافظ جان محمد سہروردی

حضرت حامد قاری کے خلیفہ تھے۔ نہایت عالم و فاضل بزرگ تھے۔ یحییٰ خاں آپ کا بے حد معتقد تھا۔[6]

---

[1] محمد دین کلیم ، تاریخ اولیائے چشت لاہوری ، ص ۱۰۸، ۱۰۹، لاہور ۱۹۶۸ء
[2] ایضاً ، ص ۱۷۴ - ۱۷۵
[3] محمد دین کلیم ، سہروردی اولیائے لاہور ، ص ۲۸۸
[4] ایضاً ، ص ۱۵۴ - ۱۵۵
[5] (۱) کنہیا لال ، تاریخ لاہور ، ۲۵۵ (۲) غلام دستگیر نامی ، تاریخ جلیلہ ، ص ۱۷۰ - ۱۷۱
[6] محمد دین کلیم ، سہروردی اولیائے لاہور ، ص ۳۰۵

خواجہ ایوب قریشی

ہزاروں طالبانِ علم نے آپ سے فیض حاصل کیا۔ درسِ قرآن و حدیث دیا کرتے تھے۔ مثنوی مولانا روم پر کامل دست گاہ رکھتے تھے۔ اور شرح بھی لکھی۔ آپ کی وفات ۱۱۵۵ھ / ۱۷۴۲ء میں ہوئی[1] دیگر ممتاز بزرگوں میں شیخ شاہ شطاری طویل عرصہ تک لاہور میں ارشاد و ہدایت میں مستغرق رہے اور ۱۱۵۰ھ میں وفات پائی۔[2]

اس عہد کے اکابرین میں حضرت محمد سعید لاہوری کا مقام بہت بلند ہے۔ لکھی محلہ میں مقیم تھے اور وہاں ایک مسجد میں درس دیا کرتے تھے۔ احمد شاہ درانی کے حملے کے وقت لاہور کے اکثر شہری گھر بار چھوڑ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ لکھی محلہ کے لوگ بھاگنے لگے تو آپ نے انھیں بلا کر فرمایا تم فکر نہ کرو، بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ لوگ حسب الارشاد اپنے گھروں میں رہے چنانچہ آپ کی برکت سے مذکورہ محلہ ہر قسم کی لوٹ مار سے محفوظ رہا۔ حتیٰ کہ جب احمد شاہ ابدالی لکھی محلہ سے گزرا تو حضرت کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس کے بعد حضرت محمد سعید کو پیر افغاناں بھی کہتے ہیں[3]

---

[1] سہرودی اولیائے لاہور ، ص ۳۱۱ - ۳۲۰
[2] اعجاز الحق قدسی ، تذکرہ صوفیائے پنجاب ، ص ۵۲۱
[3] محمد وارث کامل ، تذکرہ اولیائے لاہور ، ص ۲۶۷

(۷) علمائے کرام

لاہور کے علمائے کرام عظیم روایات کے امین رہے ہیں۔ اعلائے کلمۃ الحق کے لئے انھوں نے تاریخی کردار انجام دیا ہے۔ بہادر شاہ کا رجحان شیعیت کی طرف تھا چنانچہ اس نے جمعہ کے خطبے میں حضرت علی رضؓ کے نام کے آگے وصی رسول اللہ کا لفظ بڑھانے کا حکم دے دیا۔ اس پر ملک کے تمام بڑے بڑے شہروں میں ہنگامہ شروع ہوگیا۔ ۱۱۲۱ھ میں لاہور آیا۔ تو یہاں بھی ہنگامہ برپا ہو چکا تھا۔

"جان محمد و حاجی یار محمد کہ افضل الفضلائے لاہور بودند باتفاق دیگر فضلاء و علماء ہجوم علم نمودہ۔
بہ خانہ قاضی و صدر آمدہ برائے خواندن خطبہ بقیہ لفظ وصی مانع آمدند[۱]

بہادر شاہ نے اپنے حکم کی مخالفت کرنے والے جملہ علماء کو اپنے حضور طلب کیا۔ مولانا جان محمد، حاجی یار، ملا محمد مراد تین چار دیگر فضلاء کی معیت میں اس کے حضور پیش ہوئے۔ بہادر شاہ اور اس کے مصاحبین نے ان سے بحث کر کے انھیں قائل کرنے کی کوشش کی۔ حاجی یار محمد ان کے ہر استدلال کی تردید کرتے جاتے۔ سوال و جواب کا سلسلہ بڑھ گیا۔ بادشاہ طیش میں آگیا۔ حاجی یار محمد اس بے خوفی سے اس کے اقوال کی تردید کر رہے تھے۔ کہ اس سے گستاخی کا پہلو نکلتا تھا۔ بادشاہ نے بے قابو ہو کر کہا۔

"از غضب بادشاہاں نمی ترسی کہ چنیں خلاف آداب مجلس سلاطین مبادرت بکلمہ و کلام می نمائی؟"

حاجی یار محمد نے جواب میں کہا۔

"من آرزوے عطای چہار چیز از واہب بی منت خود داشتم۔ اول تحصیل علم، دوم حفظ کلام اللہ، سوم حج، چہارم شہادت، الحمدللہ کہ از طرف عطای سہ نعمت الہی کامیاب شدہ ام۔ آرزوی شہادت باقی ماندہ امیدوارم کہ از توجہ بادشاہ عدالت اساس کامرو گردم[۲]

---

[۱] خافی خان، ص ۶۴-۶۶۳
[۲] (۱) ایضاً، ص ۶۸۲
(۲) اردن، بیٹر مغلز، جلد اول، ۴، ۱۳۱، کلکتہ ۱۹۲۲ء
(۳) علم الدین سالک، مقالہ علمائے کرام، دینی مدرسے، نقوش لاہور نمبر ۲۷-۵۲۸

اس رویے کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہادر شاہ کو آخر کار اپنا حکم واپس لینا پڑا۔ ان علمائے حق کی موجودگی نے لاہور کے دینی حلقوں کو ایک نئی تقویت اور استحکام بخشا۔ اٹھارویں صدی کے نصف اول نے علمائے کرام کی تعلیم و تربیت زیادہ تر انہی کے ہاتھوں ہوئی چنانچہ پنجاب سیاسی انتشار کی زد میں ہونے کے باوجود علمی طور پر قحط الرجالی کا شکار نہ ہو سکا۔

سیاسی حالات اس نہج پر تھے کہ معارف نوازی، علم پروری اور درس و تدریس کا سلسلہ منقطع ہو جاتا لازمی تھا۔ پھر بھی لاہور شہر کی چار دیواری میں قدر سے امن و امان تھا، وہاں یہ جوت جلتی رہی[۱] مسجد وزیر خان لاہور کی علمی سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ متعدد جید علمائے کرام وہاں منصب امامت پر فائز رہے۔ اس عہد کے چند ممتاز علمائے کرام کا تذکرہ کیا جاتا ہے

شیخ محمد قادری بٹالوی

اس زمانے کے عظیم ترین عالم اور فاضل تھے۔ شریعت میں ایسا قدم راسخ رکھتے تھے کہ کسی کو علمائے عہد اور مشائخ وقت میں سے آپ کے قول و فعل پر جائے نکتہ چینی نہ تھی۔ تمام عمر تدریس و تعلیم میں بسر کی اور ہزاروں لوگ آپ سے فیض یاب ہوئے[۲] ان کی ہمہ جہت شخصیت کا ذکر اوراق گزشتہ میں کئی عنوانات کے تحت ہو چکا ہے۔

عنایت اللہ قادری (م۔ ۱۱۴۱ھ)

جامع علوم ظاہر و باطن، فقیہ فاضل اور صوفی کامل تھے۔ شرح وقایہ کے حواشی غایۃ الحواشی کے

---

[۱] علم الدین سالک، مقالہ علمائے کرام، دینی مدارس، نقوش لاہور نمبر، ص ۵۲۸
[۲] (۱) مولوی فقیر محمد، حدائق الحنفیہ، ص ۴۴۲-۴۴۳، لکھنؤ ۱۸۸۶ء
(۲) مولوی رحمٰن علی، تذکرہ علمائے ہند، ص ۴۶۵ اردو ترجمہ، محمد ایوب قادری، کراچی ۱۹۶۱ء

نام سے دو جلدوں میں تصنیف کیے۔ کنزالدقائق کی شرح ملتقط الدقائق کے نام سے لکھی[1]

مولانا محمد عابد لاہوری (م ۔ ۱۷۴۷ء ۔ ۱۱۶۰ھ)

بڑے عالم فاضل، فقیہ اور مفسر تھے۔ علم و عمل اور ورع و تقویٰ میں علمائے وقت اور اولیائے عصر سے سبقت لے گئے تھے۔ آپ کی علمی مجلس میں روزانہ دو سو علما شرکت کرتے تھے۔ آپ نے بڑے ذوق و شوق سے پاپیادہ حج ادا کیا۔

آپ کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں۔ حاشیہ بیضاوی (نا تمام) شرح خلاصہ کیدانی (بہ زبان فارسی) شرح قصیدہ بانت سعاد، رسالہ دربارۂ وجوہ اعجاز القرآن، العشرہ المبشرہ فی فضائل الامۃ المرحومہ[2]

مولانا شہریار

جب احمد شاہ ابدالی نے میر معین الملک کو شکست دے کر لاہور پر قبضہ کر لیا تو اس وقت مولانا شہریار لاہور میں درس دیا کرتے تھے۔ وہ بڑے جید عالم تھے۔ ان کا مدرسہ چینیاں والی مسجد میں تھا۔ نہ صرف پنجاب کے طالبانِ علم ان کے درس میں شریک ہوتے تھے۔ بلکہ ہندوستان کی حدود سے باہر کے لوگ بھی ان کے درس میں شریک ہونا اپنی خوش قسمتی سمجھتے تھے۔

مولانا شہریار کے ایک شاگرد مولانا محمد صدیق مسجد وزیر خاں میں درس دیا کرتے تھے۔ احمد شاہ نے خواہش ظاہر کی۔ کہ عید کی نماز مسجد وزیر خان میں ادا کرے گا۔ چنانچہ امرا اور وزرا کے علاوہ عوام جوق در جوق نماز میں شریک ہونے کے لیے مسجد میں جمع ہوئے۔ مولانا محمد صدیق نے نماز پڑھائی۔ جب انھوں نے خطبہ پڑھنا شروع کیا۔ تو خطبہ کے دوران احمد شاہ ابدالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے سلطان العادل کہا۔ مولانا شہریار ذرا دور بیٹھے ہوئے تھے۔ جب خطبہ ختم ہوا۔ تو آپ آگے بڑھے کسی نے انھیں بتایا کہ آپ کے شاگرد نے محض خوشامد کی خاطر احمد شاہ کو سلطان عادل کہا ہے۔ حالانکہ افغانوں کے ظلم و ستم سے سارا شہر نالاں ہے۔

---

[1] حدائق الحنفیہ ، ص ۴۳۹

[2] حدائق الحنفیہ ، ص ۴۴۴ - ۴۴۵ - علم الدین سالک ، ص ۵۲۸

آپ امام کے قریب پہنچے، اس وقت احمد شاہ بھی وہاں کھڑا تھا۔ مولانا صدیق نے احتراماً اپنے استاد کے ہاتھ چومے۔ احمد شاہ نے پوچھا یہ کون ہیں۔ مولانا صدیق نے کہا کہ آپ مولانا شہریار ہیں۔ احمد شاہ ان کی شہرت سے واقف تھا۔ وہ بھی آداب و تسلیمات بجا لایا۔ آپ اپنے شاگرد سے مخاطب ہوئے اور کہا۔

" بیٹے تم اچھی طرح جانتے ہو کہ کون سا ظلم ہے جو افغانوں نے اہل شہر پر روا نہیں رکھا۔ انھوں نے جبر و تشدد کی انتہا کر دی ہے۔ کئی مرتبہ بادشاہ سے فریاد کی گئی۔ مگر اس نے کوئی تدارک نہ کیا۔ نہ سپاہیوں کو ہاتھ روکا نہ سرداروں کی سرزنش کی۔ اسلام ایسے بادشاہ کو عادل کہنے کی اجازت نہیں دیتا۔ "

مولانا کی اس تقریر سے گرد و پیش کھڑے ہوئے سب لوگ تھرا اٹھے۔ احمد شاہ نے آپ کو خاموش کرانا چاہا۔ مگر آپ نے سلسلہ کلام کو جاری رکھا۔ آخر اس نے کہا۔ "

" حضرت آپ کس کے بارے میں اور کس کے سامنے باتیں کر رہے ہیں؟ "

مولانا شہریار نے فرمایا۔

" میں خوب جانتا ہوں کہ میرا مخاطب احمد شاہ ابدالی ہے۔ "

احمد شاہ نے کہا۔

" اس گفتگو کا انجام بھی آپ کو معلوم ہے۔ "

مولانا شہریار نے کہا کہ

" ہاں۔ شہادت یا جلاوطنی، مگر میں دونوں کے لیے تیار ہوں۔ "

احمد شاہ نے طیش میں آکر آپ کی جلاوطنی کا حکم دیا۔ مولانا شہریار ٹانڈہ (ضلع ہوشیارپور) میں جا کر آباد ہو گئے۔ اور وہیں انتقال فرمایا[1]

مولانا محمد صدیق لاہوری (م ۔ ۱۱۹۳ھ)

مسجد وزیر خان میں امام تھے۔ انھوں نے اپنے زمانے کے عظیم علما مولانا عابد، مولانا شہریار،

---

[1] علم الدین سالک (مقالہ) نقوش لاہور نمبر ، ص ۵۲۹ - ۵۳۰

مولانا حفیظ اللہ، مولانا مہر اللہ اور مولانا ظہور اللہ سے علم حاصل کیا۔ زبردست عالم، فقیہہ، محدث اور صاحب طرز انشاء پرداز تھے آپ نے فیضی کے مشہور رسالہ " موارد الکلام " کے جواب میں بے نقطہ حروف میں ایک رسالہ لکھا۔ عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔[1]

ان نامور علماء کے علاوہ پنجاب کے گوشے گوشے میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا۔ بٹالہ میں اورنگ زیب کے زمانے میں شیخ محمد فاضل الدین نے ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی تھی۔ اس مدرسہ میں درس و تدریس کا سلسلہ مدت تک جاری رہا۔ اس مدرسہ کی اہمیت اور وسعت کے پیش نظر سرکاری طور پر اس کے اخراجات کے لیے ایک جاگیر دی گئی تھی۔[2]

حمید قاری

لاہور کے علماء اور صوفیا میں اہم مقام رکھتے تھے۔ علم قرأت پر بے مثل عبور رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی ہی تعمیر کردہ ایک مسجد میں درس کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔ حمید قاری نے ۱۵۲۰ء میں وفات پائی۔[3]

---

[1] (۱) حدائق الحنفیہ، ص ۴۵۱-۴۵۲

(۲) رحمان علی، تذکرہ علمائے ہند، ص ۴۳۹

(۳) علم الدین سالک، مقالہ نقوش لاہور نمبر، ص ۵-۴

[2] گرفن اینڈ میسی، چیفس اینڈ فیملیز آف نوٹ ان دی پنجاب، ص ۵۲، لاہور ۱۹۴۰ء

[3] لطیف، لاہور، ص ۱۵۴-۱۵۵

(س) تعمیرات

عہد مغلیہ میں فن تعمیر کو جو عروج حاصل ہوا۔ وہ ہماری تہذیبی اور ثقافتی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ لاہور میں بھی مغلوں نے دہلی اور آگرہ کی طرح بے شمار عمارات تعمیر کرائیں۔ کامران کی بارہ دری، مقبرہ جہانگیر، شالامار باغ، مسجد وزیر خان، مقبرہ نور جہاں، مقبرہ آصف جاہ اور دیگر متعدد عمارات لاہور میں مغل فن تعمیر کے سنہری دور کی یادگار ہیں۔ اگرچہ عام طور پر شاہ جہاں کے بعد اس میدان میں کوئی خاص ترقی نظر نہیں آتی۔ تاہم لاہور کی حد تک، عالم گیر اور اس کے بعد بھی تعمیرات کا سلسلہ کسی نہ کسی طور پر جاری رہا۔

مولوی محمد شفیع لکھتے ہیں۔

> " عہد اورنگ زیب میں ہزاروں مسجدیں، کنویں اور تالاب بنائے گئے۔ حضوری باغ، مسجد شاہی اور راوی کا بند تعمیر ہوا۔ اور اکثر امراء نے مکانات اور باغات بنوائے۔ غرض تا عہد محمد شاہ دم بدم آرائش اور رونق بڑھتی گئی۔ زکریا خان، شاہنواز خان اور معین الملک کے عہد نظامت میں شہر کا طول، وعرض عالم گیر کے عہد سے دوچند ہو چکا تھا۔"[1]

لاہور میں ایک محلہ مغلپورہ خلجیوں اور تغلقوں کے زمانہ سے آباد چلا آتا تھا۔ یہ بستی بیرون شہر ان لوگوں نے آباد کی جو ترک وطن کر کے لاہور آ گئے تھے۔ اسی زمانے سے اب تک اس کا نام مغل پورہ مشہور چلا آتا ہے۔ اکبر کے زمانے میں، جو مغلوں کا عروج بختیں تھا۔ اس محلے کے نصیب جاگے اور یہاں نامور درباری لوگوں نے اپنے محلات اور باغ باغیچے بنوائے۔ اسی مغلپورہ میں بہ عہد شہنشاہ جہانگیر حضرت خواجہ خاوند محمود المعروف حضرت ایشاں نے کشمیر سے تشریف لا کر خانقاہ، مسجد اور باغ کی عمارتیں تعمیر کیں اور اسی محلہ میں بعہد شاہ جہاں وفات پائی۔

---

[1] لاہور قدیم مقالہ اورینٹل کالج میگزین، نومبر ۱۹۴۳ء ص ۰۲

عالمگیر کی حکومت کا آخری مگر طویل حصہ مہمات دکن میں صرف ہوا۔ بلکہ وہیں وفات پا جانے کی وجہ سے لاہور میں گو ناظمان لاہور موجود رہتے تھے اور ان کے دیوان، وزیر اور درباری سب قسم کے لوگ موجود تھے۔ مگر جو رونق بادشاہی امراء، وزراء کی آمد و رفت کی وجہ سے لاہور خصوصاً مغلپورہ میں رہتی تھی وہ عنقا ہو گئی۔ عالی شان حویلیوں پر سناٹا چھا گیا۔ باغوں اور خیابانوں پر اداسی و افسردگی کا عالم تھا۔

نواب عبدالصمد خاں چونکہ حضرت ایشاں کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس لیے اس نے اپنی اقامت روضہ حضرت ایشاں کے قرب میں پسند کی[1]

نواب عبدالصمد خاں کی بیگم، بیگم جان نے اس علاقہ میں تعمیرات اور آبادکاری پر خاص توجہ دی۔ چنانچہ یہ علاقہ اسی کے نام سے بیگم پورہ کہلانے لگا۔ اس نے مکانات اور حویلیاں بنائیں۔ ان مکانات کے گرد پختہ چار دیواری بنوائی۔ زکریا خاں نے لاکھوں روپیہ صرف کر کے کئی مسجدیں، چوک اور بازار بنوائے اس کے لواحقین اور امرائے شہر نے بھی اسی علاقے میں مکانات اور حویلیاں بنائیں۔ زکریا خاں کے دنوں میں یہ بستی سب سے زیادہ پر رونق تھی۔ اس کے بازاروں میں لکھ پتی بیٹھتے تھے[2] سید محمد لطیف رقمطراز ہیں

Some conception of its magnificence may be formed from the fact that the Viceroy of Lahore availing himself of the weakness of the court of Delhi had assumed the power of a satrap, and the whole wealth of the Punjab flowed into the palaces of Baghbanpura for the period of twenty one years (1717-1738) during which the Punjab was peaceful.[3]

اس عہد میں بیگم پورہ کو گورنمنٹ ہاؤس کی حیثیت حاصل تھی۔ تاہم زکریا خاں کی وفات کے بعد اس

---

[1] محمد دین فوق ، لاہور عہد مغلیہ میں ، ص ۱۰۵-۱۰۶ ، لاہور ۱۹۲۷ء

[2] مولوی محمد شفیع ، لاہور قدیم ، اورینٹل کالج میگزین ، نومبر ۱۹۴۳ء ، ص ۷۷

[3] لطیف ، لاہور ، ص ۱۲۷

علاقے کی تباہی کا آغاز ہوا۔ شہر کی سنگین فصیلوں سے باہر واقع ہونے کی وجہ سے حملوں کی صورت میں اس کا دفاع ممکن نہ تھا۔ سکھوں اور افغانوں کی مسلسل یلغاروں نے اسے جی بھر کر لوٹا۔ حملہ آوروں کو یہاں سے لوٹ مار کا اتنا سامان فراہم ہو جاتا تھا۔ کہ لاہور شہر پر ہاتھ اٹھانے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ احمد شاہ ابدالی کو پہلے حملے کے دوران یہاں سے اتنا مال غنیمت مل گیا کہ اس نے لاہور کو غارت کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی اور اس طرح لاہور شہر بچ گیا[1]

تعمیرات کے اعتبار سے تاریخ لاہور میں اس دور کی منفرد حیثیت ہے۔ اگرچہ اس عظیم مغل فن تعمیر کا احیا نہ ہو سکا جس کے نمونے بادشاہی مسجد، مقبرہ جہانگیر، اور شالامار باغ کی صورت میں لاہور میں موجود ہیں۔ تاہم زیر بحث عہد میں کئی ممتاز تعمیراتی کارنامے انجام پائے۔ ان کے ساتھ ستم یہ ہوا کہ گردش دوران کی ہر زد انہی پر آ کر ٹوٹتی رہی۔ افغانوں کے پے در پے حملوں سکھ مثلوں کی غارتگری رنجیت سنگھ کے عہد میں تاریخی عمارات کی منظم تخریب اور سب سے آخر میں اوائل عہد انگلشیہ میں ٹھیکیداروں کی خشت فروشی نے بے شمار تاریخی یادگاروں کو زمین کے برابر کر دیا۔ اس عہد میں تعمیر شدہ اہم عمارات کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

مقبرہ شرف النساء بیگم

شرف النساء بیگم نواب عبدالصمد خاں کی دوسری بیوی اور اس کے دوسرے فرزند عبداللہ خاں کی والدہ تھی[2] یہ مقبرہ ایک بلند چبوترہ پر ہے، مربع شکل میں ہے، ہر سمت سے ۱۹ فٹ ہے۔ زمین سے اوپر تک

---

[1] (۱) لطیف ، لاہور ، ص ۹۲-۹۳

(۲) کنہیا لال ، تاریخ لاہور ، ص ۹۳

[2] (۱) محمد دین فوق ، مآثر لاہور ، ص ۳۶۲

(۲) نقوش لاہور نمبر

(۳) ڈاکٹر عبداللہ چغتائی ، انجینئرنگ یونیورسٹی کا تاریخی ماحول ، ص ۱۷

(۴) لطیف لاہور ، ص ۱۳۵

(۵) کنہیا لال ، تاریخ لاہور ، ص ۲۶۸ ۔ نے شرف النساء کو عبدالصمد کی بیٹی لکھا ہے۔ جو غلط ہے۔

کل اونچائی ۴۰ فٹ ہے۔ شرف النساء بیگم نے اپنے چھوٹے سے باغیچہ میں ایک تالاب بھی تھا۔ ایک چبوترہ عبادت الٰہی کے لیے تعمیر کرایا۔ سیڑھی لگا کر وہ اس چبوترے پر جا کر بیٹھتی اور ہر روز صبح کی نماز کے بعد وہیں تلاوت کرتی۔ وہ اپنے پاس ہمیشہ ایک مرصع تلوار بھی رکھا کرتی۔ وہ تیغ یا قرآن اور قرآن یا تیغ کو نہ صرف اپنا بلکہ ہر مسلمان کی نجات کا ذریعہ سمجھتی تھی۔ تلاوت کے بعد وہ قرآن شریف اور تلوار وہیں چھوڑ کر خود چبوترے سے نیچے اتر آتی۔ اس متقی اور شجاع عورت نے آخری دم تک اپنا یہی معمول رکھا۔ جب اس کا انتقال ہوا تو اس کی وصیت کے مطابق اس کو تیغ و قرآن کے ساتھ دفن کیا گیا۔

اس کی وفات کے بعد اس کی قبر پر گنبد تعمیر کیا گیا جس پر کلمات الٰہی بھی درج ہیں۔ اس پر سرو کے درخت سبز رنگ میں چوکور کاشی کار اینٹوں میں بڑے سائز میں نقش ہیں۔ ان کی وجہ سے اسے سرو والا مقبرہ بھی کہتے ہیں۔ یہ سرو ہر سمت چار چار ہیں ان کی لمبائی ۷ فٹ ۳ انچ ہے۔ یہ اپنی نوع کی آخری عمارت ہے جس میں سرو استعمال کئے گئے ہیں۔ اس سے پہلے مسجد وزیر خان (۱۶۳۴ء) اور مسجد دائی انگہ (۱۶۳۵ء) میں ان کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ ایک منفرد عمارت ہے جس میں مغل فن تعمیر اپنے دور انحطاط کے باوجود کئی خوبیاں سموئے ہوئے ہیں۔[1]

سنہری مسجد

لاہور کے نہایت پر رونق حصے ڈبی بازار اور کشمیری بازار کے وسط میں نہایت مقطع اور خوبصورت

---

[1] (۱) لطیف، لاہور، ص ۱۳۵ - ۱۳۶

(۲) کنہیا لال، تاریخ لاہور، ص ۲۶۸

(۳) عبداللہ چغتائی، انجینرنگ یونیورسٹی، ص ۱۷

(۴) ولی اللہ خاں، لاہور اینڈ اٹس امپارٹینٹ مانومنٹس، ص ۷۸، لاہور ۱۹۶۱ء

(۵) نگہت شیر محمد، انیملڈ ٹائل ورک ان دی اینشنٹ مانومنٹس آف لاہور، ص ۶۳ - ۶۴ مقالہ ایم۔اے فائن آرٹس ۱۹۶۷ء

(۶) چوہدری ریاض احمد، ٹومز آف باغبانپورہ، ص ۴۷ - ۵۰، مقالہ ایم۔اے فائن آرٹس ۱۹۹۶ء، پنجاب یونیورسٹی لاہور

بنی ہوئی یہ مسجد ۱۱۶۳ھ / ۱۷۴۹ء میں تعمیر ہوئی۔ اس مسجد کا بانی میر سید بھکاری خان تھا۔ جو میر معین الملک کے عہد نظامت میں اس کا نائب تھا۔ وہ نہایت دیندار، سخی، فقیر دوست اور عالم فاضل شخص تھا۔ چشتیہ سلسلہ فقر سے ارادت رکھتا ہوں۔ جب اس نے مسجد تعمیر کرانے کا فیصلہ کر لیا۔ تو میر معین سے درخواست کی کہ چوک واقع کشمیری بازار میں اس کو تعمیر مسجد کے لیے زمین عنایت کی جائے۔ چنانچہ میر معین نے مطلوبہ قطعہ زمین اسے مرحمت کر دیا۔ اس مسجد کے گنبد بے حد خوبصورت ان پر سونا تانبے کے تختوں پر ایسی خوب صورتی و استحکام کے ساتھ چڑھایا گیا ہے کہ صدیاں گزرنے پر بھی سونے میں وہی چمک دمک ہے۔ سید محمد لطیف نے اس مسجد کے بارے میں لکھا ہے۔

It is a remarkably handsome and elegent building, and with smallness of size combines perfect symmetry of form.[1]

مسجد کی خشتی عمارت، نہایت مضبوط ایک منزلہ اونچی کرسی پر ہے۔ مسجد کے چاروں طرف بازار ہے۔ اور درمیان میں اس کی عالی شان اور مطلا عمارت نہایت مطبوع و دل پسند کھڑی ہے۔ مسجد کی تینوں محرابیں اور تینوں گنبد مقطع و بلند ہیں۔ گوشوں پر چھوٹے مینار اندر باہر سے منقش استرکاری ہیں۔ صحن کے اندر پختہ دروازہ، حوض سنگین اور چاہ آبدار بنا ہوا ہے۔[2]

مسجد نواب زکریا خاں

یہ مسجد دراصل موضع بیگم پورہ کے عین وسط میں تھی۔ اسے زکریا خاں نے تعمیر کروایا۔ اس مسجد کی

---

[1] لطیف، لاہور، ص ۲۲۲

[2] (۱) ایضاً، ص ۲۲۲

(۲) کنہیا لال، تاریخ لاہور، ص ۱۵۱ - ۱۵۱

(۳) محمد باقر، لاہور پاسٹ اینڈ پریزنٹ، ص ۳۳۹، لاہور ۱۹۵۲ء

(۴) عبداللہ قریشی، مقالہ "مساجد" نقوش لاہور نمبر ۵۷۵

سب سے بڑی خوبی اس کی زمانہ انحطاط کی کاشی کاری ہے ۔ اس کا درمیانی گنبد خاص طور پر قابل ذکر ہے جو ایوان مسجد کو لمبے رخ گھیرے ہوئے ہے ۔ جسے عرف عام میں بنگالی چھت کہتے ہیں اور اس کے کونوں پر اگرچہ معمولی سے مینار بھی ہیں لیکن کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتے ۔ ان سے ایک طرح کا انحطاط فن زمانہ کے اعتبار سے واضح ہے اور اندرون ایوان کا نقشہ بھی عجیب و غریب سا ہے ۔ البتہ مسجد آج بھی اپنی وسعت میں لاہور کی سنہری مسجد کا مقابلہ کرتی ہے اور اس کی مغولی کمانیں ظاہر کرتی ہیں کہ عمارت بعد کے زمانے کی ہیں لیکن یہ عمارت دراصل ۱۷۴۲ء کے اندر اندر تعمیر ہوئی تھی ۔ بعض قدیم شواہد سے یہ بھی شبہ ہوتا ہے کہ عمارت کسی زیادہ قدیم مسجد کی عمارت پر تعمیر کی گئی ہے ۔ کیونکہ مسجد کی پیشانی پر جہاں بیچ میں کلمہ طیبہ لکھا ہوا ہے وہاں اس دائیں بائیں طرف قصر مرمریں سلیں چسپاں ہیں جن پر حسب ذیل احادیث اعلیٰ نسخ میں لکھی ہیں ۔ عَجِّلُوا بِالصَّلٰوۃِ قَبْلَ الْمَوْتِ ، اور عَجِّلُوا بِالتَّوْبَۃِ قَبْلَ الْفَوْتِ یہ عبارت ابھرے ہوئے حروف میں کندہ ہے ۔ اور یہ طریقہ مغلوں سے قبل عمارات میں عام طور پر استعمال ہوتا تھا ۔[1]

یہ مسجد لاہور کے فن تعمیر میں ایک یادگار حیثیت کی حامل ہے

The completion of this mosque may be said to close the architectural history of Lahore. Later attempts, such as the golden mosque of Bhikari Khan and the palace and Tomb of Khan Bahadur at Baghbanpuar only prove how architectural taste fell with the fall of the empire and became a mongrell style ——— half-Mohammadan and half-Hindu.[2]

---

[1] ڈاکٹر عبداللہ چغتائی ، انجنیرنگ یونیورسٹی کا تاریخی ماحول ، ص ۱۸-۱۹ ، لاہور

[2] گزٹیر آف دی لاہور ڈسٹرکٹ ، ص ۲۸۲ لاہور

زکریا خان کی تعمیر کردہ ایک اور مسجد شاہ حسین کے مزار کے مغرب میں واقع ہے ۔ مسجد کے مشرق میں چاہ کلاں چرخی دار اور غسل خانے ہیں ۔ صحن کا فرش پختہ ہے ۔ صحن کے گرد قدم آدم دیوار ہے ۔ خالص مسجد کی تین محرابیں ہیں ۔ درمیانی محراب پر بخط ثلث کاشی کار آسمانی رنگ میں بسم اللہ اور کلمہ شریف لکھا ہے ۔

شمالی محراب پر ایک کاشی کار کتبہ ہے جس پر یہ اشعار لکھے ہیں ۔ ؎

خواست در دور شاہ ملک پناہ — شاہ ہندوستان محمد شاہ
عالم و عادل و سخیٔ زمان — در صف معرکہ چو شیر ژیان
زبدۂ بارگاہ او نواب — زکریا خان صوبہ پنجاب
بد خواہش اگرچہ جمشید است — لرزہ در تن فتادہ چوں بید است
نیک نام آنکہ نیک نامی او — ہم چو بوئے گل است در ہر سو
چاہ و مسجد ز خود بنا بکند — عالی و خوب و خوشنما بکند
محض بہر خدا کند ایں کار — تا نمازی شود نماز گزار
باز ہرچہ ثواب زاں آید
بسوئے بانیش شود عاید

جنوبی محراب پر بھی ویسا ہی کاشی کار کتبہ ہے جس میں یہ اشعار ہیں ؎

یارب از فضل خود نگاہش دار — از شکستن تو در پناہش دار
کرد احداث مسجد محکم — نیز خوش دور چاہ مستحکم
نزد درگاہ صاحب عرفان — واقف سر حضرت رحمان
آنکہ معروف شد بہ لال حسین — خاک نعلین اوست سرمہ عین

مسجد کی تاریخ تعمیر مندرجہ ذیل قطعہ سے برآمد ہوتی ہے ؎

چوں ایں سجدہ گہ از پئے خاص و عام — بنا یافت از سرور نیک نام
ز تاریخ او ہر کہ جوید شمار — بداند ہزار و صد چہل و چہار
۱۱۴۴ھ (۱۷۳۱ء) حاشیہ ص ۱۴۰ پر

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کا خیال ہے کہ یہ مسجد کوئی خاص نمونہ فن نہیں ہے جیسا کہ بیگم پورہ کی خاص شاہی مسجد ہے[1]

مسجد شاہ چراغ

حضرت شاہ چراغ رح کے مزار کے ملحقہ ایک چھوٹی سی مسجد بھی زکریا خاں نے تعمیر کرائی تھی۔ خان موصوف کی والدہ بیگم جان کو حضرت شاہ چراغ سے خاص عقیدے تھی چنانچہ اس کی وصیت کے مطابق اس کے زیورات بیچ کر یہ مسجد تعمیر کرائی گئی[2]

بگا گنبد اور بارہ دری

بیگم پورہ کے مشرق میں ایک ہشت پہلو عمارت بگا گنبد کے نام سے معروف ہے۔ یہ ناظم پنجاب یحییٰ خان کی قبر ہے۔ از حد خستہ حالت میں ہے۔ بگا گنبد اور بیگم پورہ کے درمیان ایک بارہ دری تھی۔ اس میں ۱۲ محرابی دروازے تھے جو پتھر کے ستونوں پر استوار تھے[3]

مزار سید رحمت اللہ شاہ

لاہور میں عبدالصمد خان کا عہد نظامت سیاسی اور جنگی مصروفیتوں کے عروج کا دور تھا۔ اسے فن تعمیر کا اعلیٰ ذوق رکھنے کے باوجود اس طرف توجہ کی فرصت نہ ملی، تاہم اس نے اپنے پیر سید رحمت اللہ صاحب کا مقبرہ بنوایا۔ جن کا انتقال ۱۱۲۰ھ / ۱۷۰۸ء میں ہوا تھا۔ یہ مقبرہ بیگم پورہ اور شالامار کے مابین مقبرہ

حاشیہ ص ۲۶۹ [1] (۱) لطیف، لاہور، ص ۸۷)

[2] (۲) کنہیا لال، تاریخ لاہور، ص ۲۶۵ - ۲۶۶

(۳) عبداللہ قریشی، نقوش لاہور نمبر، ۳ - ۲۷ - ۵۷۷

[1] انجینئرنگ یونیورسٹی کا تاریخی ماحول، ص ۱۸ - ۱۹

[2] (۱) عبداللہ قریشی، حاشیہ مآثر لاہور، (۲) محمد دین فوق، نقوش لاہور نمبر، ص ۳۰۶ - ۳۰۷

[3] لطیف، لاہور، ص ۱۳۶)

شیرز ۔ الزسا ء اور بگا گنبد کے وسط میں واقع ہے[1]

ملتان کی جامع مسجد

ملتان میں عبدالصمد کو اپنے ذوق کی تسکین کا موقع ملا۔ چنانچہ اس نے ۱۱۴۸ھ / ۱۷۳۵ء میں قلعہ ملتان سے ایک میل شمال کی طرف ایک شاندار مسجد تعمیر کرائی۔ اس کا طول ۲۵۰ فٹ اور عرض ۵۰ فٹ ہے[2]

محمد امین کی مسجد

بی بی پاک دامناں کے مزار کے پچھواڑے ایک بہت بڑی مسجد ہے۔ جو زکریا خان کے ایک دربار محمد امین بیگ نے بنوائی تھی جس زمانے میں خان بہادر نے بیگم پورہ والی مسجد بنوائی تھی۔ اسی زمانے میں یہ مسجد تعمیر ہوئی، اس مسجد کی ساخت اور روغنی کام کی بناوٹ بالکل بیگم پورہ والی مسجد سے ملتی جلتی ہے۔ اس پر تین گنبد ہیں۔ ایک بڑا دو چھوٹے۔ دروازے کی ڈاٹ پر عربی اور فارسی کے کتبے ہیں۔ جو زرد رنگ کی ٹکڑیوں پر نیلے رنگ سے نہایت خوبصورت لکھے ہوئے ہیں اوپر کی منزل پر جانے کے لیے شمال اور جنوب میں پختہ سیڑھیاں بنی ہیں۔ مسجد کا فرش بھی پختہ اینٹوں کا ہے۔ شمالی محراب پر جو کتبہ ہے اس پر یہ آیت تحریر ہے۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ۔

درمیانی محراب پر یا فتاح اور کلمہ طیبہ اور یہ حدیث شریف لکھی ہے۔ عَجِّلُوْا بِالصَّلٰوةِ قَبْلَ الْمَوْتِ ۔

جنوبی محراب پر یہ کتبہ ہے۔ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ

مسجد کے مشرق میں محمد امین بیگ نے باغ بھی لگوایا تھا جس کا کوئی نشان باقی نہیں[3] ان ممتاز تعمیرات کے علاوہ بھی اس عہد میں بے شمار عمارتیں تعمیر ہوئیں۔

---

[1] نور احمد چشتی، ص ۱۳۳۱

[2] (۱) لطیف، اولی ہسٹری آف ملتان، ص ۷۶، لاہور ۱۹۶۳ء

(۲) گزیٹیر آف دی ملتان ڈسٹرکٹ، ص ۳۴۹، لاہور ۱۹۰۲ء اس پیمائش ۵۴ × ۲۴۰ دی گئی ہے۔

[3] عبداللہ قریشی، مقالہ مساجد، ص ۵۷۶، نقوش لاہور نمبر

تعمیرات رائے برادران

دیوان لکھپت رائے اور اس کے بھائی جسپت رائے کو زکریا خان کے عہد نظامت میں بے پناہ اہمیت حاصل تھی۔ اور بے اندازہ دولت اور وسیع جائیداد کے مالک تھے، ان کی سیاسی اور سماجی حیثیت کا تفصیلی ذکر اسی مقالے میں موجود ہے۔ انھوں نے شاہ عالمی دروازے میں دو شاندار حویلیاں تعمیر کروائی تھیں۔ ان کے علاوہ بھی ان کی لاہور میں متعدد عمارات تھیں[1]

تعمیرات دِلارام

دلارام نامی بھی ایک دیوان تھا۔ اس نے اپنی والدہ کے زیر ہدایت ہزار ہا مخلوق کے فائدے اور اپنی نیک نامی کے لئے شہر لاہور میں دو ہزار ایک سو مکان تعمیر کرائے[2] جب لکھپت رائے نے دلارام کی یہ عمارات دیکھیں۔ تو اس نے بھی مکانات شروع کئے[3] رائے برادران نے متعدد تالاب، اور باغات بھی بنوائے[4]

حویلی کلوبائی

زکریا خاں کی تعمیر کردہ ایک حویلی یکی دروازہ میں تھی۔ یہ حویلی کلو بائی کے نام سے مشہور تھی۔ اسے حویلی اہلو دالیہ بھی کہتے تھے۔ یہ عمارات خان نے اپنی ایک بیوی کلو بائی کے لئے بنوائی تھی۔ جو ایک طوائف تھی، زکریا خان نے اس سے شادی کرلی تھی، وہ چونکہ شاہی حرم میں داخل نہ ہوسکتی تھی۔ زکریا خان نے بھاری اخراجات صرف کرکے اس کے لیے یہ علیحدہ حویلی بنوائی۔ زکریا خاں کو فنِ تعمیر کے ذوق کے ساتھ عوامی مفاد بھی ملحوظ تھا چنانچہ اس نے اندرون یکی دروازہ سے ٹکسالی دروازہ تک سینکڑوں مکانات بنوائے[5]

---

[1] خلیفہ نزہت جمیل، اینشنٹ حویلیز آف لاہور، ص ۳۵، مقالہ ایم۔ اے فائن آرٹس ۱۹۷۶ء پنجاب یونیورسٹی لاہور

[2] نور احمد چشتی تحقیقات چشتی، ص ۷۸۶۔ مصنف نے ان محلوں کی تفصیلات بھی دی ہیں۔ جہاں مکانات تعمیر کرائے گئے۔

[3] ایضاً، ص ۷۸۸

[4] (۱) لطیف، لاہور، ص ۱۹۸۔ (۲) نور احمد چشتی، ص ۸۸ - ۷۸۹

[5] نور احمد چشتی، ص ۹۷۱

یہ ایک نہایت مضبوط پختہ عمارت تھی۔ بیچ میں کھلا ہوا صحن اور چاروں طرف دو دو تین تین منزلہ عمارتیں تھیں۔ زکریا خاں اسی حویلی میں روزانہ ظہر کے بعد عدالت لگایا کرتا تھا[1]

حویلی میر جواد خان

زکریا خان کے ایک فوجی سردار میر جواد خاں نے اپنی ذاتی رہائش کے لیے ایک حویلی دہلی دروازے میں تعمیر کروائی تھی۔ وہ بھی اسی عہد کی ممتاز تعمیرات میں شمار ہوتی تھی[2]

یحییٰ نگر

ضلع لاہور میں جو آج کل آریہ نگر مشہور ہے، اس کا اصلی نام یحییٰ نگر ہے اور اسے یحییٰ خان نے آباد کرایا تھا[3]

دینا نگر

گورداسپور سے ۸ میل شمال میں شاہ نہر یا حاصلی نہر کے کنارے آدینہ بیگ خان نے ضلع گورداسپور میں ایک گاؤں بسایا جسے آدینہ نگر کا نام دیا یہی نام اب بگڑ کر دینا نگر ہے۔ اس قصبے کو آدینہ بیگ کے زمانے میں بڑی اہمیت حاصل ہوئی۔ اس کی بنیاد ۱۷۵۲ء میں ڈالی گئی[4] جب وہ پٹھان کوٹ کے قریب

---

[1] (۱) لطیف، لاہور، ص ۲۳۱-۲۳۲

(۲) کنہیا لال، تاریخ لاہور، ص ۲۴۱-۲۴۲

(۳) نور احمد چشتی، ص ۹۶۹

(۴) خلیفہ نزہت جمیل، ص ۳۷

[2] (۱) لطیف، لاہور، ص ۲۳۲، (۲) خلیفہ نزہت جمیل، ص ۳۶

[3] نور احمد چشتی، ص ۹۷۲، لاہور ۱۹۱۵ء

[4] گزیٹیر آف دی گورداسپور ڈسٹرکٹ میں اس کا سن بنا ۱۷۳۰ء / ۱۱۴۳ھ تحریر ہے اور اسے عجمۃ بنا سے نکالا گیا ہے۔ لیکن ان اعداد کا شمار ۱۸۰۹ء / ۱۲۲۱ھ بنتا ہے۔ ص ۱۸

خیمہ زن تھا۔ آدینہ بیگ نے سرہند قبیلے کے راجپوت زمینداروں سے اس قصبے کے لئے زمین خریدی مفتی علی ال
نے لکھا ہے۔

”بوقت خان ممدوح باحاط کثیر آبادی بود و عمارات مبتنیہ خان عالی داشت [۱]“

آدینہ بیگ یہیں سے نظم مملکت چلاتا تھا۔ نواحی گاؤں مغرالہ کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہاں اس نے مرغیوں کی افزائش کا ایک وسیع مرکز بنا رکھا تھا اور اس کا نام مرغیوں کی نسبت سے مغرالہ پڑ گیا [۲]

ان تعمیراتی سرگرمیوں کو سیاسی پس منظر میں دیکھا جائے۔ تو اعلیٰ فنی خوبیوں کے فقدان کے باوجود ان کی خاص اہمیت نظر آتی ہے۔ نادر شاہ کے حملے کے ساتھ ہی پنجاب کا انتظامی تاروپود بکھرنا شروع ہو گئے اور اس کے بعد پنجاب بڑی حد تک ایک لاوارث خطہ زمین کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ سکھوں اور افغانوں کے پے در پے حملوں کی وجہ سے پنجاب میں تباہی اور بربادی کا دور دورہ ہو گیا۔ سینکڑوں ہزاروں تعمیرات زمین بوس ہو گئیں۔

ان حالات میں فن تعمیر کا زوال ناگزیر تھا۔ چنانچہ یہی ہوا اور نہ صرف مزید تعمیرات نہ ہو سکیں بلکہ قدیم تاریخی یادگاروں کا تحفظ بھی نہ ہو سکا اور متعدد تعمیرات صفحہ ہستی سے محو ہو گئیں۔ جو باقی بچیں ان کے حلیے ہی بگڑ گئے اور شکستہ اینٹوں کے انبار عظمت رفتہ پر نوحہ خوانی کے لیے کھڑے رہ گئے۔

---

[۱] (۱) عبرت نامہ ، ص ۸۸

(۲) باقر ، آدینہ بیگ خان ، ص ۲۸ ، لاہور ۱۹۳۶ء

(۳) گپتا ، سٹڈیز ان لیٹر مغل ہسٹری آف دی پنجاب ، ص ۹،

[۲] گزٹیئر آف دی گورداسپور ڈسٹرکٹ ، ص ۱۸

ضمیمہ

تعمیرات کے ضمن میں صفحہ ۶۵ ــــ ۲۶۴ پر مقبرہ شرف النسا کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے اسی مقبرہ کے حوالے سے جاوید نامہ میں ایک حکیمانہ نظم لکھی ہے جس میں متعدد فلسفیانہ اسرار و رموز کی گتھیاں سلجھانے کے ساتھ ساتھ پنجاب کی سیاست پر بھی لطیف اشارے کئے ہیں۔ اس نظم کو زیر بحث اور مابعد دور کی سیاست کا ایک بھرپور تجزیہ کہا جا سکتا ہے۔

قصرِ شرف النسا

گفتم این کاشانۂ از لعلِ ناب — آنکہ می گیرد خراج از آفتاب
این مقام این منزل این کاخ بلند — حوریان بر در گہش احرام بند!
اے کہ تو دادی سالکان را جستجوے — صاحبِ او کیست؟ با من بازگوے
گفت "این کاشانۂ شرف النسا است — مرغِ بامش با ملائک ہم نوا است!
قلزمِ ما این چنین گوہر نہ زاد — ہیچ مادر این چنین دختر نہ زاد
خاک لاہور از مزارش آسمان — کس نہ داند رازِ او را در جہان!
آن سراپا ذوق و شوق و درد و داغ — حاکمِ پنجاب را چشم و چراغ
آن فروغِ دودۂ عبدالصمد — فقرِ او نقشے کہ ماند تا ابد
تا ز قرآن پاک می سوزد وجود — از تلاوت یک نفس فارغ نہ بود
در کمر تیغ دو رُو قرآن بدست — تن بدن ہوش و حواس اللہ مست!
خلوت و شمشیر و قرآن و نماز — اے خوش آن عمرے کہ رفت اندر نیاز!
بر لبِ او چون دمِ آخر رسید — سوئے مادر دید و مشتاقانہ دید!

گفت اگر از رازِ من داری خبر — سوئے ایں شمشیر و ایں قرآں نگر
ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند — کائناتِ زندگی را محور اند
اندریں عالم کہ میرد ہر نفس — دخترت را ایں دو محرم بود و بس
وقتِ رخصت با تو دارم ایں سخن — تیغ و قرآں را جدا از من مکن
دل بآں حرفے کہ می گویم بنہ — قبرِ من بے گنبد و قندیل بہ
مومناں را تیغ با قرآں بس است
تربتِ مارا ہمیں ساماں بس است
عمرہا در زیرِ ایں زریں قباب — بر مزارش بود شمشیر و کتاب
مرقدش اندر جہانِ بے ثبات — اہلِ حق را داد پیغامِ حیات
تا مسلماں کرد با خود آنچہ کرد — گردشِ دوراں بساطش در نورد
مردِ حق از غیرِ حق اندیشہ کرد — شیرِ مولا روبہی را پیشہ کرد
از دلش تاب و تبِ سیماب رفت — خود بدانی آنچہ بر پنجاب رفت
خالصہ شمشیر و قرآں را ببرد
اندراں کشور مسلمانی بمرد"

جاوید نامہ ص ۱۸۱ تا ۱۸۳

کتابیات

ا۔ مخطوطات

برہمن، چندربھان ــــ چہار چمن، پنجاب یونیورسٹی لائبریری، مرتبہ محمد رفیق ۱۹۷۰، بصورت تحقیقی مقالہ،

بوٹے شاہ ــــ تاریخ پنجاب ــــ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، مخطوطہ نمبر Pe III 8 A / 86

بھولاناتھ کھتری ملتانی ــــ تحفۃ الہند، پنجاب یونیورسٹی لائبریری، مخطوطہ نمبر APg 3 / 121

رتن چند ــــ خالصہ نامہ، پنجاب یونیورسٹی لائبریری مخطوطہ نمبر Pe III 73 / 2134

رضی الدین احمد ــــ حدیقۃ الہند، پنجاب یونیورسٹی لائبریری، مخطوطہ نمبر Pe I 57 / 2262

عبدالکریم ــــ عبرت مقال، پنجاب پبلک لائبریری لاہور

غلام محی الدین خاں ــــ ظفر نامہ، پنجاب یونیورسٹی لائبریری، مخطوطہ نمبر Pe II 43 / 1120

محمد علی خاں ــــ تاریخ مظفری، پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور، مخطوطہ نمبر Pe II 89 / 1720

محمد قاسم لاہوری ــــ عبرت نامہ، پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور، مخطوطہ نمبر Pe II 76 / 593

مخلص، آنند رام ــــ بدائع وقائع، پنجاب یونیورسٹی لائبریری

ہرچرن داس ــــ چہار گلزار شجاعی، پنجاب یونیورسٹی لائبریری Pe I 18 / 453

یوسف شاہ ــــ حالاتِ ملتان، پنجاب پبلک لائبریری لاہور

مصنف نامعلوم ــــ احوال دینا بیگ، مخطوطہ برٹش میوزیم لندن، روٹوگراف پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور

ب۔ فارسی کتب

آزاد بلگرامی، میر غلام علی ــــ خزانہ عامرہ، کانپور ۱۹۰۰

آزاد بلگرامی، میر غلام علی ——— سروِ آزاد لاہور ۱۹۱۳

ابوالحسن بن محمد امین گلستانہ ——— مجمل التواریخ، مرتبہ مدرس رضوی، تہران، ۱۳۴۴ش

ابوالفضل ——— آئینِ اکبری، (اردو ترجمہ) فدا علی طالب، حیدرآباد دکن ۱۹۳۹

〃 ——— انگریزی ترجمہ بلاخمن، کلکتہ ۱۸۷۳

اصلح، مرزا ——— تذکرہ شعرائے کشمیر، مرتبہ، سید حسام الدین راشدی، کراچی

حزیں، محمد علی ——— تذکرۃ الاحوال لندن ۱۹۳۱

خافی خاں ——— منتخب اللباب، حصہ دوم، کلکتہ، ۱۸۷۴

خوشگو، بندرابن داس ——— سفینۂ خوشگو، پٹنہ، ۱۹۵۹

رحمان علی، مولوی ——— تذکرہ علمائے ہند (اردو ترجمہ) محمد ایوب قادری، کراچی ۱۹۶۱

سوہن لال سوری ——— عمدۃ التواریخ دفتر اول، لاہور، ۱۸۸۵

〃 ——— تتمہ دفتر اول و دوم، لاہور، ۱۸۸۵

شاہنواز خان ——— صمصام الدولہ مآثر الامرا، جلد اول، کلکتہ ۱۸۸۸

اردو ترجمہ محمد ایوب قادری، لاہور، ۱۹۶۹

جلد دوم، کلکتہ، ۱۸۹۰

اردو ترجمہ، محمد ایوب قادری، لاہور، ۱۹۶۹

جلد سوم، کلکتہ، ۱۸۹۱

اردو ترجمہ محمد ایوب قادری، لاہور، ۱۹۷۰

شیر علی قانع تتوی میر ——— مقالات الشعراء، حیدرآباد سندھ، ۱۹۵۷

طہماس بیگ خان ——— طہماس نامہ، انگریزی ترجمہ سیتو مدھاوا راؤ، بمبئی ۱۹۶۷

عبدالرشید، خواجہ ——— تذکرہ شعرائے پنجاب، کراچی، ۱۹۶۷

عبدالکریم کشمیری ——— بیان واقع، مرتبہ ڈاکٹر کے۔ ڈی نسیم، لاہور ۱۹۷۰

عبدالکریم منشی ——— واقعات درّانی، اردو ترجمہ میر وارث علی سیفی، باہتمام ڈاکٹر محمد باقر لاہور ۱۹۶۲

عبدالوہاب افتخار، سید ——— تذکرۂ بے نظیر ——— الہ آباد، ۱۹۴۰

علی الدین، مفتی ——— عبرت نامہ مرتبہ ڈاکٹر محمد باقر (دو جلدیں) لاہور ۱۹۶۱

علی حسن خان، سید ——— تذکرہ صبح گلشن بھوپال، ۱۲۹۵ھ

غلام حسین طباطبائی ——— سیر المتاخرین، لکھنؤ، ۱۸۸۶ء

غلام ربانی عزیز (مرتب) ——— کلیات آفرین لاہوری، لاہور ۱۹۶۷

〃 (مرتب) دیوان دلشاد پسروری، لاہور ۱۹۷۰

غلام سرور لاہوری، مفتی ——— خزینۃ الاصفیا (اردو ترجمہ) محمود عالم ہاشمی، اقبال احمد فاروقی، لاہور ۱۳۹۲ھ

غلام محمد غبار ——— احمد شاہ بابا کابل، ۱۹۴۴

قدرت اللہ گوپاموی ——— نتائج الافکار، بمبئی، ۱۳۳۶ھ

کلاسنر، آندرے دی ——— تاریخ نادر شاہ، فارسی ترجمہ، محمد باقر امیر خانی، تبریز، ۱۳۴۶ھ

لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی ——— گلِ رعنا، حیدرآباد دکن ۱۳۲۳ھ

مبارک اللہ واضح ——— تاریخ ارادت خاں، مرتبہ غلام رسول مہر لاہور ۱۹۷۱

مہدی مرزا ——— درّۂ نادرہ، تہران، ۱۳۴۱ھ ش

〃 تاریخ جہانگشای نادری، بمبئی ۱۲۶۵ھ

مینورسکی ——— تاریخچہ نادر شاہ، فارسی ترجمہ، آقای رشید یاسمی، تہران ۱۳۱۳ھ ش

نور محمد، مولوی ——— تاریخ جھنگ سیال، میرٹھ ۱۸۷۵

نامعلوم مصنف ——— اسرار صمدی مرتبہ پروفیسر شجاع الدین، لاہور ۱۹۶۵

ج ۔ انگریزی کتب

ارون، ولیم ــــــ آرمی آف دی انڈین مغلز ، لندن ، ۱۹۰۳

〃 لیٹر مغلز ، (جلد اول) کلکتہ ۱۹۲۲

اشتیاق حسین قریشی، ڈاکٹر ــــــ ایڈمنسٹریشن آف دی مغل ایمپائر ، کراچی ، ۱۹۶۶

الفنسٹن ــــــ کنگڈم آف کابل ، جلد ۲ ، لندن ۱۸۷۴

انڈین ہسٹاریکل ریکارڈ کمیشن پروسیڈنگز ۱۹۴۲ ۔ دہلی ۱۹۴۳

انڈین ہسٹری کانگریس پروسیڈنگز ، الہ آباد ۱۹۳۸

ایلبیٹ ، اے سی ــــــ کرانیکلز آف گجرات ، لاہور ۱۹۰۲

ایلیٹ اینڈ ڈوسن ــــــ ہسٹری آف انڈیا ، جلد ہشتم ، الہ آباد ۱۹۶۴ (طبع جدید)

براؤن جیمز ــــــ انڈیا ٹریکٹ ، جلد دوم لندن ۱۷۸۸

بیک، ہنری سٹین ــــــ دی پنجاب ، لندن ، ۱۸۴۶

بینی پرشاد ــــــ ہسٹری آف جہانگیر ، الہ آباد ۱۹۴۰

پرنسپ ــــــ اوریجن آف دی سکھ پاور ، کلکتہ ، ۱۸۳۴

ٹرمپ، ارنسٹ ــــــ آدی گرنتھ ، لندن ، ۱۸۷۷

تخراں سنگھ ــــــ ہسٹری اینڈ فلاسفی آف دی سکھ ریلیجن جلد اول لاہور ۱۹۱۴

خوشونت سنگھ ــــــ ہسٹری آف دی سکھس ، (دو جلدیں) پرنسٹن ، ۱۹۶۳

ریو، چارلس ــــــ کیٹالاگ آف دی پرشین مینوسکرپٹس ان برٹش میوزیم ، جلد دوم لندن ۱۸۷۹

جلد سوم لندن ۱۸۸۳

سائکس، پرسی ــــــ ہسٹری آف افغانستان ، لندن ، ۱۹۴۰

سرکار، جادوناتھ ــــــ فال آف دی مغل ایمپائر جلد اول ، کلکتہ ۱۹۳۲

〃 مغل ایڈمنسٹریشن ، کلکتہ ۱۹۶۳ (طبع جدید)

سرکار جادوناتھ ــــــ نادر شاہ ان انڈیا ، پٹنہ ۱۹۲۵

ہسٹری آف اورنگ زیب جلد سوم کلکتہ ۱۹۲۸

سہنا، نرنیدر کرشن ــــــ رائز آف دی سکھ پاور ، کلکتہ ۱۹۳۶

سیالکوٹ ڈسٹرکٹ گزٹیر ۸۴-۱۸۸۳ ، لاہور ۱۸۸۴

شرما، سری رام ــــــ مغل گورنمنٹ اینڈ ایڈمنسٹریشن بمبئی ۱۹۵۱

عبدالغنی ــــــ لائف اینڈ ورکس آف عبدالقادر بیدل لاہور ۱۹۶۰

فریزر، جیمز ــــــ ہسٹری آف نادر شاہ ، لندن ، ۱۷۴۲

فورسٹر، جارج ــــــ جرنی فرام بنگال ٹو انگلینڈ ، لندن ۱۸۰۸

کننگھم ــــــ ہسٹری آف دی سکھس ، دہلی

گپتا، ہری رام ــــــ سٹڈیز ان دی لیٹر مغل ہسٹری آف دی پنجاب ، لاہور ۱۹۴۴

〃 ہسٹری آف دی سکھز ، کلکتہ ۱۹۳۹

گجرات ڈسٹرکٹ گزٹیر ۸۴-۱۸۸۳ لاہور ۱۸۸۴

گورداسپور ڈسٹرکٹ گزٹیر لاہور ۱۸۸۴

گرفن لیپل ــــــ راجاز آف دی پنجاب لاہور ۱۸۷۰

گرفن اینڈ میسی ــــــ چیفس اینڈ فیمیلیز آف نوٹ ان دی پنجاب لاہور ۱۹۰۹

گنڈا سنگھ ــــــ احمد شاہ درانی ، بمبئی ۱۹۵۹

〃 بندہ سنگھ بہادر ، امرتسر ۱۹۳۵

لاک ہارٹ ــــــ نادر شاہ ، لندن ۱۹۳۸

لاہور ڈسٹرکٹ گزٹیر ۔ لاہور ۱۸۹۴

لطیف، ایس۔ایم ــــــ ارلی ہسٹری آف ملتان ، لاہور ، ۱۹۶۳ (طبع جدید)

〃 ہسٹری آف دی پنجاب ، لاہور ، ۱۸۹۱ پہلا ایڈیشن ۱۸۸۹

لطیف، ایس ایم ــــ لاہور ۱۹۵۶ لاہور (طبع جدید) پہلا ایڈیشن لاہور ۱۸۹۲

مالکم ــــ ایکیچ آف دی سکھس ، لندن ۱۸۱۲

محمد اکبر ــــ پنجاب انڈر دی مغلز ، لاہور ۱۹۴۸

محمد باقر ــــ آدینہ بیگ خان ، لاہور ۱۹۳۶

〃 لاہور پاسٹ اینڈ پریزنٹ ، لاہور ۱۹۵۲

مکالف میکس آرتھر ــــ سکھ ریلیجن ، ۵ حصے ، دہلی ۱۹۶۳ (طبع جدید)

ملتان ڈسٹرکٹ گزیٹر ، لاہور ۱۹۰۲

مورلینڈ ــــ اگریرین سسٹم آف دی مسلم انڈیا ، کیمرج ، ۱۹۲۹

نارنگ، گوکل چند ــــ ٹرانسفارمیشن آف سکھزم ، لاہور ۱۹۱۲

ولی اللہ خاں ــــ لاہور اینڈ اِٹس امپارٹنٹ مانومنٹس ، لاہور ۱۹۶۱

وہیلر، جے، ٹی ــــ ارلی ریکارڈز آف برٹش انڈیا ، لندن ۱۹۷۲ (طبع جدید)

ہنوے، جونس ریوولیوشن آف پرشیا جلد چہارم ، لندن ، ۱۷۵۳

یوسف حسین دی فرسٹ نظام ، لندن ، ۱۹۶۳

د۔ اردو کتب

ابوالامان امرتسری ــــ سکھ مسلم تاریخ حقیقت کے آئینے میں ، لاہور ۱۹۵۸

احمد حسین قریشی قلعداری ــــ پنجابی ادب کی مختصر تاریخ ، لاہور ۱۹۶۴

اعجاز الحق قدوسی ــــ تذکرہ صوفیائے پنجاب ، کراچی ۱۹۶۲

اعظم بیگ، مرزا ــــ تاریخ گجرات ، لاہور ۱۸۷۰

ذکاء اللہ دہلوی ــــ تاریخ ہندوستان ، جلد نہم ، علی گڑھ ۱۹۱۹

خلیق احمد نظامی ــــ تاریخ مشائخ چشت ، دہلی ۱۹۵۳

خلیق احمد نظامی ــــ شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات ، علی گڑھ ۱۹۵۰

عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر ــــ انجینئرنگ یونیورسٹی کا تاریخی ماحول ، لاہور ، س۔ن

عبداللہ، ڈاکٹر سید ــــ ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ ، دہلی ۱۹۴۲

غلام دستگیر نامی ــــ تاریخ جلیلہ ، لاہور ۱۹۳۷

فقیر محمد جہلمی، مولوی ــــ حدائق الحنفیہ ، لکھنؤ ۱۸۹۸

کنہیا لال ــــ تاریخ پنجاب ، لاہور ۱۸۸۶

〃 تاریخ لاہور ، لاہور ۱۸۸۴

گیان سنگھ ــــ راج سنگھ ، ۱۸۷۶

〃 شمشیر خالصہ (حصہ دوم) سیالکوٹ ۱۸۷۸

لطیف، سید محمد ــــ تاریخ پنجاب ، لاہور ۱۸۸۸

محمد اسلم، پروفیسر ــــ سرمایہ عمر ، لاہور ۱۹۷۶

محمد دین کلیم ــــ تاریخ اولیائے چشت لاہوری ، لاہور ۱۹۶۸

〃 سہروردی اولیائے لاہور ، لاہور ، س۔ن

محمد حسن خان ــــ تاریخ پٹیالہ ، امرت سر ، ۱۸۷۸

محمد وارث کامل ــــ تذکرہ اولیائے لاہور ، کراچی ، ۱۹۶۳

محمود شیرانی، حافظ ــــ پنجاب میں اردو ، لاہور س۔ن

نجم الغنی ــــ تاریخ اودھ ، جلد اول ، لکھنو ۱۹۱۴

نور احمد چشتی ــــ تحقیقات چشتی ، لاہور باہتمام سید احسان علی ، ۱۹۶۴ (طبع نو)

س۔ پنجابی کتب

بنارسی داس جین ــــ پنجابی زبان تے اوہدا لٹریچر ، لاہور

عبدالغفور قریشی ، پنجابی زبان دا ادب تے تاریخ ، لاہور ، س۔ن

نجابت کوی ـــ نادر شاہ دی وار ۔ مرتبہ ڈاکٹر فقیر محمد فقیر ، لاہور ۱۹۶۵

س۔ کتب حوالہ

اردو دائرہ معارف اسلامیہ ـــ پنجاب یونیورسٹی لاہور

تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند ـ پنجاب یونیورسٹی لاہور جلد ۳ (حصہ اول) ۱۹۷۱

جلد ۵ ، ۱۹۷۲

تحقیقی مقالات

ریاض احمد چودھری ـــ ٹومز آف باغبانپورہ ، مقالہ ایم۔اے فائن آرٹس ، ۱۹۶۶، پنجاب یونیورسٹی

محمد اقبال مجددی ـــ تاریخ مغلیہ کے فارسی ماخذ (۱۷۰۷–۱۸۵۷) مقالہ ایم۔اے تاریخ ۱۹۷۲ پنجاب یونیورسٹی لاہور

نزہت جمیل ، خلیفہ ـــ انفینٹ حویلیز آف لاہور ، مقالہ ایم۔اے فائن آرٹس ، ۱۹۶۹ پنجاب یونیورسٹی

نگہت شیر محمد ـــ اینملڈ ٹائل ورک ان دی انشنٹ مانومنٹس آف لاہور ، مقالہ ایم۔اے فائن آرٹس ۱۹۶۷ ، پنجاب یونیورسٹی لاہور

ط۔ جرائد

المعارف لاہور ـــ نومبر ۱۹۷۴

اورنٹئل کالج میگزین لاہور ـــ نومبر ۱۹۴۳

اورنٹئل کالج میگزین (ضمیمہ) لاہور ـــ مئی ۱۹۳۹

جرنل آف دی پنجاب یونیورسٹی ہسٹاریکل سوسائٹی لاہور اپریل ۱۹۳۳

جرنل آف ریسرچ ، پنجاب یونیورسٹی لاہور ـــ جنوری ۱۹۶۶

جرنل آف ریسرچ ، پنجاب یونیورسٹی لاہور جولائی ۱۹۶۶

نقوش ، لاہور نمبر ، لاہور (ایڈیٹر محمد طفیل) ۱۹۶۲

وحید تہران ، ماہانہ نومبر ۱۹۷۰

اشاریہ

- اشخاص
- مقامات
- اقوام و قبائل
- کتب

مرتبہ: منیر سلطان

ا۔ اشخاص

ا

۲۔ مقامات

ی

٣۔ اقوام وقبائل

۴۔ کتب